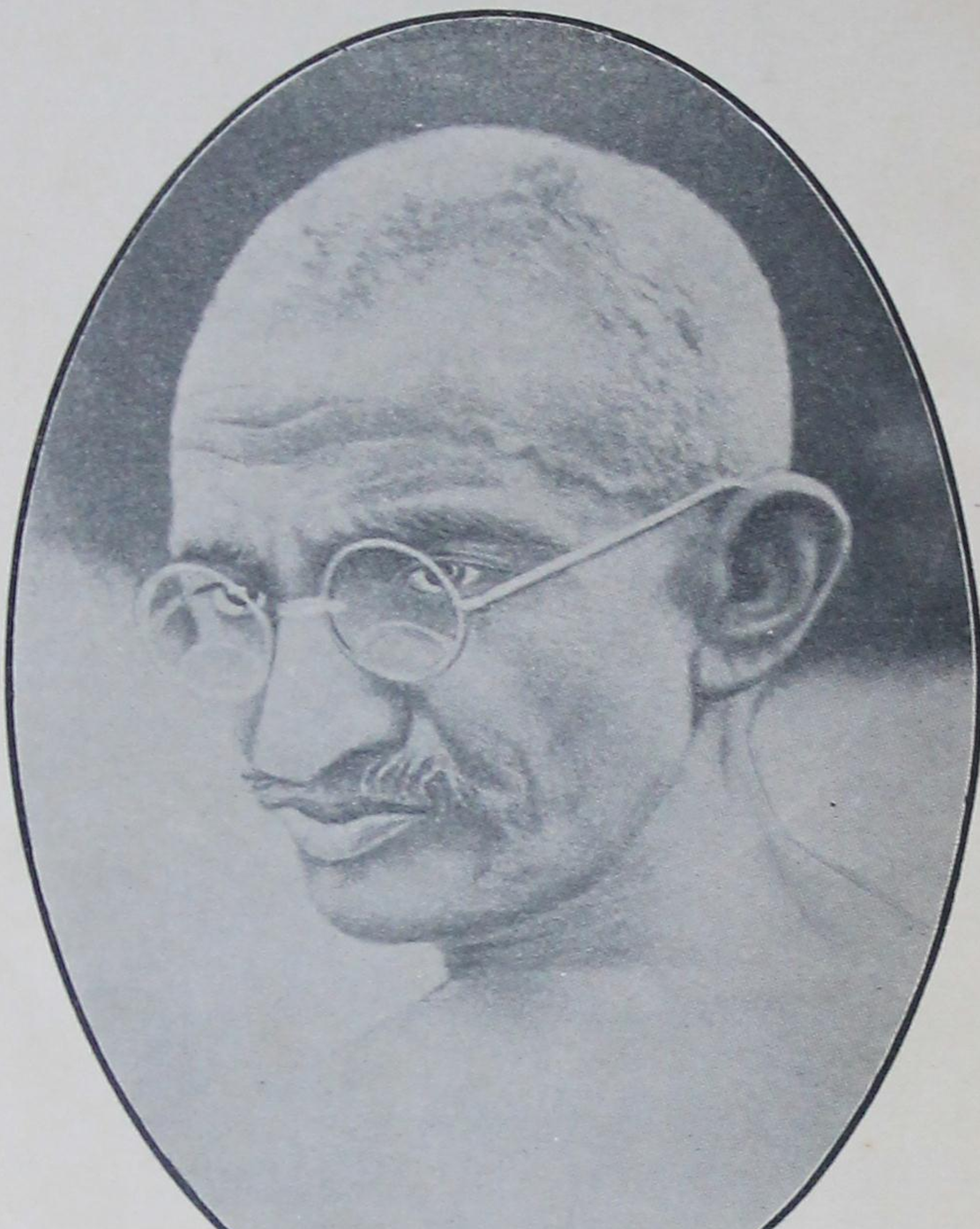
تلاش حق

جلد دوم

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم-اے-پی ایچ-ڈی



تلاش حق

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی

(جلد دوم)

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

مقامات اشاعت

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ۔ دہلی (ناشر)

انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد (دکن) (سول ایجنٹ جنوبی ہند)

فرینک برادرس اینڈ کمپنی۔ چاندنی چوک۔ دہلی (سول ایجنٹ یو۔ پی)

ایس چند اینڈ برادرس متصل فوارہ۔ دہلی (سول ایجنٹ دہلی)

یونیورسل بک اینڈ اسٹیشنری ہاؤس۔ کشمیری گیٹ دہلی (سول ایجنٹ پنجاب)

قیمت فی جلد غیر مجلد ... ... ایک روپیہ (عمر)

فہرست مضامین

حصہ چہارم

حصہ پنجم

تلاشِ حق

حصّہ چہارم

پہلا باب

محبت کے سارے جتن بیکار گئے

مسٹر چیمبرلین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذر لینے اور انگریزوں اور بوئروں کی دلجوئی کرنے آئے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے ہندوستانی وفد کو سوکھا ٹال دیا۔

انھوں نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ جن نوآبادیوں کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے اُن کے معاملات میں دخل دینے کا امپیریل گورنمنٹ کو بہت کم حق ہے۔ آپ کی شکایتیں بجا معلوم ہوتی ہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا کروں گا۔ مگر آپ کو یوروپیوں کے ساتھ رہنا ہے تو انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔"

اس جواب سے وفد کے ارکان کی اُمیدوں پر اُوس پڑ گئی۔ مجھے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہمیں بتا دیا کہ سارا کام از سر نو شروع کرنا پڑے گا۔ میں نے یہ صورتِ حال اپنے رفیقوں کو سمجھائی۔

سچ پوچھیے تو مسٹر چیمبرلین کا جواب کچھ بیجا نہ تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ انہوں نے اصل بات صاف صاف کہہ دی۔ انہوں نے ہمیں نرم الفاظ میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول یا تلوار کا قانون سمجھا دیا۔

مگر ہم تلوار تو کیا تلوار کھانے کا بل بوتہ بھی نہ رکھتے تھے۔ مسٹر چیمبرلین نے اتنے بڑے ملک کو تھوڑے سے وقت میں دیکھا۔ اگر سری نگر سے راس کماری تک انیس سو میل کا فاصلہ ہے تو ڈربن سے کیپ ٹاؤن بھی ۱۱۰۰ میل سے کم نہیں۔ مسٹر چیمبرلین نے یہ سارا فاصلہ آندھی کی سی رفتار سے طے کیا۔

نٹال سے وہ ٹرانسوال گئے۔ مجھے ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے مطالبات بھی مرتب کر کے اُن کی خدمت میں پیش کرنا تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں پریٹوریا کیوں کر جاؤں؟ وہاں کے ہندوستانی میرے داخلے کے قانونی مراحل اتنی جلدی طے نہیں کر سکتے تھے۔ لڑائی نے ٹرانسوال کو ویران کر دیا تھا۔ نہ وہاں کھانے پینے کا سامان بہم پہنچتا تھا نہ کپڑا ملتا تھا۔ بہت سی دوکانیں خالی تھیں بہت سی بند پڑی تھیں۔ خالی دوکانوں کا بسنا اور بند دوکانوں کا کھلنا ذرا دیر طلب تھا۔ جن لوگوں نے یہاں سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لی تھی اُن تک کو واپسی کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی تا وقتیکہ دوکانوں میں کھانے پینے کا سامان نہ ملنے لگے۔ اس لیے ہر ٹرانسوال کے باشندے کو وہاں واپس جانے کے لیے پروانہ راہداری لینا پڑتا تھا۔ یورپیوں کو یہ پروانہ آسانی سے مل جاتا تھا مگر ہندوستانیوں کے لیے بڑی دشواریاں تھیں۔

جنگ کے زمانے میں ہندوستان اور لنکا سے بہت سے فرنگی افسر اور گورے سپاہی جنوبی افریقہ آئے تھے۔ برطانوی حکام کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ ان میں سے جو لوگ یہاں بسنا چاہیں اُن کے لیے معاش کا کچھ بندوبست کریں۔ آخر انھیں نئے عہدہ دار رکھنا تھے پھر ان تجربہ کار لوگوں کو کیوں نہ رکھتے؟ ان لوگوں نے جوڑ توڑ لگا کر ایک نیا محکمہ قائم کرا لیا۔ حبشیوں کی نگرانی کے لیے ایک خاص محکمہ تھا ہی پھر کیا وجہ تھی کہ ایشیائیوں کے لیے نہ ہو؟ بات بظاہر معقول تھی۔ جب میں ٹرانسوال پہنچا تو یہ محکمہ کھل چکا تھا اور اس کا جال آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ جو حکام پناہ گزینوں کی واپسی کے لیے پروانہ راہداری جاری کرتے تھے وہ اوروں کو تو خود پروانے دیدیتے تھے مگر ایشیائیوں کے داخلے کے بارے میں بھلا نیا محکمہ بے مداخلت کیے کب رہ سکتا تھا؟ اس کے اہل کاروں نے ان حکام سے کہا کہ آپ ایشیائیوں کو ہماری سفارش پر پروانے دیا کیجیے۔ اس سے آپ کا کام بھی ہلکا ہو جائے گا اور ذمہ داری بھی کم ہو جائے گی۔ مگر یہ سب

گھنے کی باتیں تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ نئے محکمے کو کچھ نہ کچھ کام دکھانا تھا اور اس کے اہلکاروں کو اپنا پیٹ پالنا تھا۔ اگر کوئی کام نہ ہوتا تو یہ محکمہ غیر ضروری سمجھکر توڑ دیا جاتا۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح کام نکالا گیا۔

ہندوستانیوں کو داخلے کی اجازت کے لئے اس محکمہ میں درخواست دینی پڑتی تھی۔ مدت کے بعد درخواست کا جواب ملتا تھا۔ داخلے کے خواہشمند بے شمار تھے اور اجازت میں یہ دشواریاں اس لئے بہت سے دلّال پیدا ہوگئے تھے جنہوں نے افسروں کے ساتھ مل کر غریب ہندوستانیوں کو خوب لوٹا۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ بغیر سفارش کے پروانہ نہیں مل سکتا اور بعض وقت تو سفارش بھی کافی نہیں ہوتی بلکہ سو پونڈ تک رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس لئے تمہیں اجازت ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں نے اپنے پرانے دوست ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ سے جاکر کہا "مہربانی کرکے پرمٹ کے افسر سے میرا تعارف کرا دیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ٹرانسوال میں عرصے تک رہ چکا ہوں"۔ انہوں نے فوراً ہیٹ سر پر رکھی اور میرے ساتھ جاکر مجھے پروانہ دلوا دیا۔ میری گاڑی چھوٹنے میں مشکل سے ایک گھنٹہ باقی تھا مگر میرا سامان پہلے سے بندھا رکھا تھا۔ میں نے مسٹر الیگزینڈر کا شکریہ ادا کیا اور پریٹوریا روانہ ہوگیا۔

اب مجھے اپنے کام کی دشواریوں کا اندازہ ہوا۔ پریٹوریا پہنچتے ہی میں نے عرضداشت مرتب کرلی۔ جہانتک مجھے یاد ہے ڈربن میں ہندوستانیوں سے وفد کے ارکان کی فہرست پہلے سے نہیں مانگی گئی تھی۔ مگر یہاں تو نیا محکمہ موجود تھا۔ اس نے یہ تیخ لگادی۔ پریٹوریا کے ہندوستانیوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ اس محکمے کے افسر میرا نام وفد سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔

یہ واقعہ افسوسناک بھی تھا اور مضحک بھی۔ مگر اسے بیان کرنے کے لئے ایک اور باب کی ضرورت ہے۔

دوسرا باب

ایشیا سے آئے ہوئے صاحب بہادر

نئے محکمے کے افسر حیران تھے کہ میں ٹرانسوال میں کیونکر داخل ہوا۔ انھوں نے ان ہندوستانیوں سے جو ان سے ملنے جایا کرتے تھے دریافت کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ انھیں یہ شبہ تھا کہ شاید میں پرانے تعلقات سے فائدہ اُٹھا کر بے اجازت چلا آیا۔ اگر یہ صورت تھی تو میں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی بڑی لڑائی ختم ہوتی ہے تو حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں بھی یہی ہوا تھا۔ حکومت نے ضابطۂ تحفظ امن کے نام سے ایک ہنگامی قانون پاس کیا تھا جس کی رو سے وہ شخص جو بغیر پروانۂ راہداری کے ٹرانسوال میں داخل ہو گرفتاری اور قید کا مستوجب تھا۔ نئے محکمے کے افسروں میں صلاح ہوئی کہ اس ضابطے کے ماتحت مجھے گرفتار کریں مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مجھ سے پروانہ مانگے۔

ان افسروں نے ڈربن تار دیکر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں پروانہ لے کر آیا ہوں۔ انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر یہ ہار ماننے والے اسامی نہ تھے۔ انھوں نے کہا یہ شخص ٹرانسوال آگیا تو آجائے مگر اسے مسٹر چیمبرلین سے نہ ملنے دیں گے۔

اسی لئے ہندوستانیوں سے کہا گیا کہ وفد کے ارکان کے نام بھیجیں۔ رنگ کا تعصب تو جنوبی افریقہ میں ہر جگہ نظر آتا تھا مگر مجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہاں کے افسروں میں بھی وہی کمینہ پن کی حرکتیں اور کاٹ پھانس کی ترکیبیں ہوں گی جن سے مجھے ہندوستان میں

سابقہ پڑا کرتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں پبلک محکمے وہاں کے باشندوں کی فلاح وبہبود کے لئے قائم کئے گئے تھے اور رائے عامہ کے ماتحت تھے۔ اس لئے ان کے عہدے داروں میں شائستگی اور بربادی پائی جاتی تھی جس کا تھوڑا بہت فائدہ کالے آدمیوں کو بھی پہنچتا تھا۔ ایشیا سے جو افسر آئے وہ ایشیائی مطلق العنانی اور دوسری عادتیں جو مطلق العنانی سے پیدا ہوتی ہیں ساتھ لائے۔ جنوبی افریقہ میں تو کسی قدر آئینی حکومت اور جمہوریت بھی تھی مگر ایشیا سے جس مال کی کھیپ آئی اس میں خالص مطلق العنانی تھی۔ ایشیا والے غیر قوم کے ماتحت تھے انہیں ذمہ دار حکومت کہاں نصیب؟ جنوبی افریقہ میں فرنگی لوگ باہر سے آکر آباد ہوئے تھے۔ انھیں افریقی شہریوں کے حقوق اور محکمے کے افسروں پر اقتدار حاصل تھا۔ اب ایشیا کے صاحب بہادر پہنچے اور بیچارے ہندوستانی غم صیاد و قدر باغباں کی دو عملی میں پھنس گئے۔

میں خود اس مطلق العنانی کا شکار رہا اس لئے مجھے اس کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا۔ پہلے مجھے اس محکمے کے افسر اعلیٰ نے بلا بھیجا۔ شائد "بلا بھیجنے" کے لفظ سے کسی کو غلط فہمی ہو اس لئے میں تصریح کئے دیتا ہوں۔ مجھے کوئی تحریری حکم نہیں بھیجا گیا تھا۔ ہندوستانی لیڈر اکثر اس محکمے کے افسروں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار سیٹھ طیب جی حاجی خان محمد افسر اعلیٰ سے ملنے گئے تو انھوں نے پوچھا کہ یہ گاندھی کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔ طیب سیٹھ نے کہا "وہ ہمارے مشیر ہیں اور ہمارے بلانے پر آگئے ہیں۔"

صاحب بہادر نے پوچھا "پھر ہم لوگ کس لئے ہیں؟ ہم اسی لئے تو مقرر کئے گئے ہیں کہ تمہارے حقوق کی حفاظت کریں۔ گاندھی کو یہاں کے حالات کی کیا خبر؟"

طیب سیٹھ سے جو کچھ جواب بن پڑا انھوں نے دیا:

"بے شک آپ ہماری حمایت کے لئے موجود ہیں مگر گاندھی ہمارے آدمی ہیں۔ وہ

ہماری زبان جانتے ہیں اور ہماری طبیعتوں کو سمجھتے ہیں۔ آپ لاکھ کہیں ہوں پھر بھی سرکاری عہدہ دار ہیں۔"

صاحب بہادر نے طیب سیٹھ کو حکم دیا کہ مجھے لے جاکر اُن کے سامنے پیش کریں۔ میں طیب سیٹھ اور کچھ اور لوگوں کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کسی سے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا گیا، ہم سب کھڑے رہے۔

صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے؟"

میں نے جواب دیا "میں اپنے ہم وطنوں کے کہنے سے آیا ہوں کہ انھیں مشورہ دوں۔"

"مگر کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہیں ٹرانسوال آنے کا کوئی حق نہیں؟ جو پروانہ تمہارے پاس ہے وہ غلطی سے دیدیا گیا تھا۔ تم نو آباد ہندوستانی قرار نہیں دیے جا سکتے۔ تمھیں فوراً واپس جانا پڑیگا۔ مسٹر چیمبرلین سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ "ایشیائی محکمہ" خاص طور سے ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اچھا اب تم جاؤ۔" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے بغیر جواب کا موقع دئے رخصت کر دیا مگر میرے ساتھیوں کو روک لیا۔ ان لوگوں کو انہوں نے خوب ڈانٹا اور کہا کہ گاندھی کو رخصت کر دو۔ وہ کھسیائے ہوئے لوٹے۔ اب ہمارے سامنے ایسی صورتِ حال تھی جس کے لئے ہم بالکل تیار نہ تھے۔

تیسرا باب

ذلّت چپ چاپ سہ لی

مجھے اس توہین سے بڑی تکلیف ہوئی مگر میں پہلے بہت ذلتیں اُٹھا چکا تھا اور ان کا عادی ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ یہ ذلت بھی چپ چاپ سہ لوں گا اور جو کچھ کروں گا صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد کروں گا۔

"ایشیائی محکمے" کے افسر اعلیٰ کے یہاں سے ایک خط آیا کہ چونکہ گاندھی ڈربن میں مسٹر چیمبرلین سے مل چکے ہیں اس لئے ان کا نام اس وفد سے خارج کر دیا گیا ہے جو اب موصوف کی خدمت میں جانے والا ہے۔

اس خط کو دیکھ کر میرے رفیقوں میں ضبط کی تاب نہ رہی۔ انہوں نے یہ تجویز کی کہ وفد کا خیال ہی ترک کر دیا جائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ مناسب نہیں" اگر آپ لوگ اپنے مطالبات مسٹر چیمبرلین کے سامنے پیش نہ کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ کے کوئی مطالبات ہی نہیں ہیں۔ اصل چیز تو عرضداشت ہے اور وہ لکھی جا چکی ہے۔ اسے میں پڑھوں یا کوئی اور بات ایک ہی ہے۔ مسٹر چیمبرلین ہم سے بحث تو کریں گے نہیں۔ میرے خیال میں تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس ذلت کو چپ چاپ سہ لیں۔"

ابھی میں نے بات ختم نہ کی تھی کہ طیب سیٹھ بول اُٹھے "کیا تمہاری ذلت ساری برادری کی ذلت نہیں ہے؟ آخر تم ہمارے نمائندے ہو یا نہیں؟"

میں نے جواب دیا "یہ بالکل بجا ہے۔ مگر اس طرح کی ذلتیں برادری کو بھی سہنا پڑیں گی۔ سوائے اس کے چارہ ہی کیا ہے؟"

طیب سیٹھ نے کہا "چاہے جو کچھ ہو مگر ہمیں یہ ذلت برداشت نہیں کرنا چاہئے۔ آخر کوئی ہمارا کر کیا لے گا؟ ہمارے ایسے کون سے بہت حقوق ہیں جو چھن جائیں گے؟"

مجھے یہ تیکھا جواب پسند آیا مگر میں جانتا تھا کہ اس تیکھے پن سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اپنی برادری کی کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ میں نے اپنے دوست کو دھیما کیا اور انھیں یہ صلاح دی کہ میری جگہ مسٹر گاڈفرے (ایک ہندوستانی بیرسٹر) کو لے جائیں۔

چنانچہ مسٹر گاڈفرے کی سرکردگی میں وفد گیا۔ مسٹر چیمبرلین نے اپنے جواب میں میرے واقعے کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے تالیفِ قلوب کی غرض سے کہا "کیا یہ بہتر نہیں کہ بار بار ایک ہی نمائندے کے آنے کی بجائے اب کی نیا شخص آیا ہے؟"

مگر ان باتوں سے بجائے اس کے کہ کوئی فیصلہ ہو میرا اور میری برادری کا کام اور بڑھ گیا۔ ہمیں نئے سرے سے ابتدا کرنی پڑی۔

لوگ مجھے یہ کہہ کر طعنے دینے لگے "تمہارے ہی کہنے سے برادری نے لڑائی میں مدد کی تھی۔ اب تمہیں دیکھو کہ اس کا کیا نتیجہ ہوا۔" مگر مجھ پر اس طعن کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے جواب دیا "میں نے جو مشورہ دیا تھا اس کا مجھے ذرا بھی افسوس نہیں۔ میرے نزدیک تو ہم لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ جنگ میں شریک ہوئے۔ یہ ہمارا فرض تھا جو ہم نے ادا کر دیا۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنی محنت کے معاوضے کی توقع رکھیں۔ مگر مجھے دل سے یقین ہے کہ اچھے کام کا پھل ضرور ملتا ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب ہمیں آئندہ کی فکر کرنا چاہئے۔" اس بات سے سب نے اتفاق کیا۔

پھر میں نے کہا "سچ پوچھئے تو جس کام کے لئے آپ نے مجھے بلایا تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو مجھے ابھی ٹرانسوال ہی میں رہنا چاہئے گو آپ مجھے واپسی کی اجازت بھی دیدیں۔ بجائے نٹال میں رہکر کام کرنے کے اب میرے لئے یہیں رہنا مناسب ہے۔ مجھے ایک سال کے اندر ہندوستان واپس جانے کا

خیال چھوڑ کر ٹرانسوال کی عدالت العالیہ سے وکالت کی اجازت لے لینا چاہیئے۔ مجھے اپنے اوپر بھروسا ہے کہ اس نئے محکمے سے اچھی طرح نبٹ لوں گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہماری برادری خوب لُٹے گی اور ہمارا اس ملک میں رہنا دشوار ہو جائے گا۔ روز نئی نئی ذلتوں کا سامنا ہو گا۔ مسٹر چیمبرلین کا مجھ سے نہ ملنا یا اُس عہدہ دار کا اہانت آمیز برتاؤ اُس ذلت کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جو ہماری برادری کو اُٹھانا پڑے گی۔ ہم سے یہ چاہا جائے گا کہ ہم کتوں کی سی زندگی بسر کریں۔ اسے ہم کیونکر برداشت کریں گے؟"

غرض میں نے ہرچہ بادا باد کہہ کر کام شروع کر دیا اور پریٹوریا اور جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں سے مشورہ کر کے جوہانسبرگ میں اپنا دفتر قائم کر دیا۔

مجھے ٹرانسوال کی عدالت العالیہ سے وکالت کی اجازت ملنا بہت مشتبہ تھا، مگر مجلس وکلا نے میری درخواست کی مخالفت نہیں کی اور عدالت نے منظوری دے دی۔ ایک دفتر کے معاملے میں یہ دشواری تھی کہ اچھے محلوں میں کسی ہندوستانی کو مکان نہیں ملتا تھا۔ مگر مجھ سے وہاں کے ایک تاجر مسٹر رچ سے میل جول ہو گیا تھا۔ اُن کے ایک ملاقاتی مکانوں کے ایجنٹ تھے۔ ان کی مہربانی سے مجھے شہر کے اُس حصے میں جہاں عدالتیں تھیں معقول کمرے مل گئے اور میں نے وکالت شروع کر دی۔

چوتھا باب

جوشِ ایثار میں ترقی

ٹرانسوال میں نوآباد ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے جو لڑائی لڑنا پڑی اور ایشیائی محکمے سے جو معرکے پیش آئے اُن کے بیان سے پہلے مجھے اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا تھوڑا سا ذکر کر دینا چاہیے۔

اب تک میرے دل میں ایک دورنگی سی تھی۔ ایثار کے جوش کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ آیندہ کے لئے کچھ سرمایہ جمع کر لوں۔

جس زمانے میں میں نے بمبئی میں اپنا دفتر قائم کیا تھا وہاں ایک امریکی بیمہ ایجنٹ آیا۔ یہ ایک خوش رو اور شیریں زبان تھا اور مجھ سے اس طرح گھل مل کے باتیں کرنے لگا جیسے برسوں کا دوست ہو۔ اس نے میری آیندہ زندگی کی فلاح و بہبود کا ذکر کرتے ہوئے کہا " امریکہ میں آپ جیسی حیثیت کے لوگ سب اپنی زندگی کا بیمہ کراتے ہیں۔ آپ کو بھی آیندہ کی فکر کر لینا چاہیے۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ ہم امریکہ والے بیمہ کرانا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ میرا کہنا مانیے اور ایک چھوٹی سی بیمہ پالیسی خرید لیجیے۔"

اس سے پہلے مجھے جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں جتنے بیمہ ایجنٹ ملے میں نے سب کو سوکھا ٹال دیا تھا کیونکہ میں زندگی کا بیمہ کرانے کو بزدلی اور منافی توکل سمجھتا تھا۔ مگر اس وقت مجھ پر اس امریکی ایجنٹ کا جادو چل گیا۔ ادھر وہ یہ گفتگو کر رہا تھا اور ادھر میری نظروں میں بیوی بچوں کی تصویر پھر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا " بھلے آدمی تو نے اپنی بیوی کا سارا زیور بکوا دیا۔ کل کو تجھے کوئی سانحہ پیش آجائے تو

تیرے بیوی بچوں کی کفالت غریب بھائی کے سر ہوگی جس نے اپنے اوپر تکلیفیں اُٹھاکر تجھے بیٹے کی طرح رکھا۔ اس وقت تجھے شرم تو نہ آئیگی؟" اسی قسم کی دلیلوں سے میں نے اپنے دل کو سمجھایا اور دس ہزار روپئے کی پالیسی خرید لی۔

مگر جنوبی افریقہ پہنچ کر میری زندگی بدل گئی اور اسی کے ساتھ خیالات بھی بدلے، اس امتحان کے وقت میں نے جو کچھ کیا خدا کے لئے کیا اور اُسی کے بھروسے پر کیا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ جنوبی افریقہ میں کب تک رہنا ہے۔ یہ ڈر تھا کہ شاید کبھی ہندوستان واپس نہ جاسکوں اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ بیوی بچوں کو ساتھ رکھنا چاہیے تاکہ وہ میری جدائی میں نہ تڑپیں اور صرف اتنا کمانا چاہیئے کہ ان کی پرورش کے لئے کافی ہوجائے۔ ان خیالات کے سبب سے میں بہت پچھتایا کہ میں نے بیمہ ایجنٹ کے فقروں میں آکر پالیسی خرید لی۔ میں نے اپنے دل میں کہا اگر میرے بھائی واقعی باپ کے برابر ہیں تو ضرورت کے وقت میری بیوہ کی پرورش ان پر ہرگز بار نہ ہوگی۔ اور آخر یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ مجھے دوسروں سے پہلے موت آجائیگی؟ حافظِ حقیقی خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ میری یا میرے بھائی کی کیا بساط ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بیمہ کراکر اپنے بیوی بچوں کو آپ بل سے محروم کر دیا۔ انھیں کیوں نہ ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ آخر دنیا میں اتنے غریب آدمی مرتے ہیں ان کے بیوی بچے کیسے بسر کرتے ہیں؟ میں بھی اپنے آپ کو ان میں سے کیوں نہ سمجھ لوں؟

اس قسم کے بیشمار خیالات میرے دل میں آئے مگر ان پر فوراً عمل نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے جنوبی افریقہ میں بیمہ پالیسی کی کم سے کم ایک قسط ضرور ادا کی تھی۔

مگر خارجی واقعات سے میرے ان خیالات کو اور مدد ملی۔ پہلی بار جنوبی افریقہ کے قیام کے زمانے میں میرے دل میں مذہبی احساس کو عیسائیوں کے اثر نے قائم کر رکھا تھا اس مرتبہ تھیوسوفی اثر نے اسے اور گہرا کر دیا۔ مسٹر رچ تھیوسوف تھے اور ان کے

ذریعے سے میری رسائی جوہانسبرگ کی تھیوسوفی جماعت میں ہوئی۔ مجھے اس کے عقائد سے بہت سی باتوں میں اختلاف تھا اس لئے میں اس کا ممبر تو نہیں ہوا مگر مجھے قریب قریب کل تھیوسوفیوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقع ملا۔ مجھ سے ان سے روزانہ مذہبی بحث ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تھیوسوفی کتابیں پڑھی جاتی تھیں اور ایک آدھ بار مجھے ان کے جلسوں میں تقریر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ تھیوسوفی میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اخوت کے اصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر اکثر بحث ہوتی تھی اور اگر مجھے کسی بات میں ممبروں کا عمل اُن کے نصب العین کے منافی معلوم ہوتا تھا تو میں ان پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اس تنقید سے مجھے بھی فائدہ پہنچا۔ اس کی بدولت مجھے مشاہدۂ نفس کا موقع ملا۔

پانچواں باب

مشاہدۂ نفس کا نتیجہ

۱۸۹۳ء میں جب مجھے عیسائی دوستوں سے میل جول پیدا کرنے کا موقعہ ملا میں محض مبتدی تھا۔ یہ لوگ انتہائی کوشش کرتے تھے کہ مجھے مسیح کا پیام سمجھا کر ان کا پیرو بنا لیں اور میں کھلے دل سے ادب اور عاجزی کے ساتھ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں، جہاں تک مجھ سے ممکن تھا میں ہندو دھرم کا مطالعہ اور دوسرے مذہبوں کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

۱۹۰۳ء میں صورت حال ذرا بدل گئی تھی۔ اب تھیوسوف دوست مجھے اپنی صحبت میں کھینچ بلاتے تھے مگر ان کی غرض یہ تھی کہ مجھ سے ہندو دھرم کے متعلق کچھ معلومات حاصل کریں۔ تھیوسوفی کتابیں ہندو دھرم کے اثرات سے بھری ہوئی ہیں۔ ان دوستوں کو یہ بہت توقع تھی کہ مجھ سے انھیں ان کتابوں کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ میری سنسکرت کی استعداد بہت معمولی ہے۔ میں نے ہندو دھرم کی اصل کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور ترجمے بھی بہت سرسری طور پر پڑھے ہیں۔ مگر چونکہ وہ "سمسکار" (پہلے جنم کے اثرات) اور پنر جنم (دوبارہ پیدا ہونے) کے قائل تھے اس لیے انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور دے سکوں گا۔ غرض میری وہ مثل تھی کہ اندھوں میں کانا راجا۔ میں نے بعض دوستوں کے ساتھ سوامی ویویکانند کی "راج یوگ" اور بعض کے ساتھ م۔ ن۔ دیویدی کی "راج یوگ" کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک دوست کے ساتھ پتن جلی کی "یوگ شاستر" اور کچھ اور حضرات کے ساتھ

بھگوت گیتا بھی پڑھتا تھا۔ ہم سب طالبانِ حق نے ایک کلب سا بنا لیا جہاں سب ملکر پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ گیتا کا میں پہلے ہی سے معتقد تھا اور میرے دل کو اس سے ایک خاص تعلق تھا۔ اب مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا اور گہرا مطالعہ کروں۔ میرے ساتھ دو ایک ترجمے تھے جن کی مدد سے میں اصل سنسکرت متن کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور روز دو ایک اشلوک زبانی یاد کر لیتا تھا۔ اس کے لیئے میں نے صبح کا وقت مخصوص کر لیا۔ مجھے روز دانت مانجنے میں پندرہ منٹ اور نہانے میں بیس منٹ لگتے تھے۔ اسی دوران میں میں گیتا کے اشلوک یاد کرتا تھا۔ دانت میں مغربی طریقہ پر کھڑے کھڑے مانجا کرتا تھا۔ سامنے دیوار پر گیتا کے اشلوک کاغذ کے پرچوں پر لکھ کر چپکا دیتا تھا اور اشلوک پڑھتے پڑھتے جہاں بھولتا تھا ان پرچوں کو دیکھ لیتا تھا۔ اتنا وقت روز کا سبق یاد کرنے اور آموختہ دہرانے کے لیئے کافی ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس طرح تیرہ باب حفظ کر لیئے تھے۔ مگر کچھ دن کے بعد اور کاموں کے ہجوم میں یہ مشغلہ چھوٹ گیا۔ ستیاگرہ کا بیج بونے کے بعد میرا سارا وقت اسی پودے کے سینچنے میں صرف ہونے لگا اور اب تک ہوتا ہے۔

گیتا کے مطالعے کا میرے دوستوں پر جو اثر ہوا ہو اسے وہی بتا سکتے ہیں مگر میرے لیئے تو یہ کتاب قانونِ عمل بن گئی۔ میں روزمرہ کے کاموں میں اس کا حوالہ یوں ڈھونڈھتا تھا جیسے کوئی لغت دیکھا کرتا ہے۔ جس طرح مشکل انگریزی الفاظ کے معنی میں انگریزی کی ڈکشنری سے نکالتا تھا اسی طرح اپنی عملی مشکلوں کو اس قاموسِ اخلاق سے حل کرتا تھا۔ "اپری گرہ" (ترکِ املاک) اور "سمبھو" (عدل) جیسے الفاظ میرے دل کو مسخر کر لیتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ یہ "عدل" اختیار کیونکر کیا جائے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس حکم کے کیا معنی ہیں کہ میں ان دل آزار، بدتمیز، رشوت خوار عہدہ داروں سے [illegible] سکار روڑے اٹکا رہے تھے اسی

طرح پیش آؤں جیسے اپنے پرائے محسنوں سے؟ اور انسان کل املاک کو کیونکر ترک کرسکتا ہے؟ خود ہمارا جسم بھی تو ہماری ملک ہے؟ بیوی بچے بھی تو املاک میں داخل ہیں؟ کیا میں اپنی کتابوں کی الماریوں کو آگ لگا دوں؟ کیا میں اپنی "کشتی" پھونک دوں، اپنا گھر بار لٹا دوں، اور "اُس" کے پیچھے ہولوں؟ میرے دل کی گہرائیوں سے یہ جواب ملا "جب تک تو گھر بار نہ لٹا دے، اُس کی راہ پر نہیں چل سکتا"۔ میرا قانون انگلستان کا مطالعہ اسو قت بہت کام آیا۔ مجھے اسنیل کی بحث اصول عدالت پر یاد آگئی۔ میں اس میں "ٹرسٹی" (امین یا متولی) کا لفظ دیکھا کرتا تھا مگر اس کا صحیح مفہوم اب جا کر گیتا کی تعلیم کی بدولت سمجھ میں آیا۔ میں نے گیتا کے "ترک املاک" کے حکم کا مطلب یوں سمجھا کہ جو لوگ نجاتِ ابدی چاہتے ہیں انھیں چاہئے کہ اپنے مال سے ٹرسٹی کا سا تعلق رکھیں جو بڑی بڑی رقموں اور جائدادوں کا انتظام کرتا ہے مگر اس میں سے ایک کوڑی کو بھی اپنی ملک نہیں سمجھتا۔ مجھ پر یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی کہ "ترک املاک" اور "عدل" کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنا طرز خیال بالکل بدل دے۔

میں نے ریوا شنکر بھائی کو لکھا کہ بیمہ پالیسی کو ضبط ہو جانے دیں۔ اگر کچھ مل جائے تو لے لیں ورنہ جتنی قسطیں دی جا چکی ہیں اُن سے ہاتھ دھولیں کیونکہ اب میرا یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ وہی خدا جس نے مجھے اور میرے بیوی بچوں کو پیدا کیا ہے ان کو رزق پہنچائیگا۔ اپنے بھائی کو جنھوں نے مجھے ہمیشہ بیٹے کی طرح رکھا تھا میں نے یہ اطلاع دی کہ اب تک میں اپنا اندوختہ آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا مگر اب آپ مجھ سے کچھ توقع نہ رکھئے کیونکہ اب میں جو کچھ جمع کروں گا وہ ہندوستانی برادری کی بہبود کیلئے صرف کیا جائے گا۔

بھائی کو اس فیصلے کی وجوہ سمجھانے میں مجھے بڑی دقت ہوئی۔ انہوں نے خفگی کے الفاظ میں مجھے میرے فرائض اور اپنے حقوق سے آگاہ کیا۔ انہوں نے لکھا کہ تمہیں والد سے زیادہ دانشمند بننے کا حوصلہ نہیں کرنا چاہئے اور جس طرح میں خاندان کی مدد

کرتا ہوں تمہیں بھی کرنا چاہیئے۔ میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ میں بھی وہی کر رہا ہوں جو والد کرتے تھے۔ آپ خاندان کے مفہوم کو کسی قدر وسیع کر دیجئے تو میرے طرز عمل کی مصلحت سمجھ میں آجائے گی۔

بھائی صاحب میری طرف سے مایوس ہو گئے، اور انہوں نے مجھ سے خط و کتابت بند کر دی۔ مجھے بہت رنج ہوا مگر جس چیز کو میں اپنا فرض سمجھتا تھا اُسے چھوڑ دیتا تو اس سے بڑھ کر رنج ہوتا۔ اس لئے میں اپنی بات پر قائم رہا۔ مگر مجھے ان سے جو محبت اور عقیدت تھی اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ انھیں زیادہ صدمہ اسی لئے تھا کہ وہ مجھ سے بیحد محبت رکھتے تھے۔ میرے روپے کی انھیں اتنی پروانہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں اپنے خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ مگر آخری وقت میں انھیں میرے نقطۂ نظر کی قدر ہوئی۔ بستر مرگ پر انھیں یہ محسوس ہوا کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ ایک دردناک خط میں انہوں نے مجھ سے اس انداز میں معذرت کی جیسے باپ بیٹے کے آگے اظہار ندامت کرتا ہے اور لکھا کہ میں اپنے بیٹوں کو تمہارے سپرد کرتا ہوں جسطرح جی چاہے ان کی تربیت کرو۔ پھر ان کا تار آیا کہ میں جنوبی افریقہ آنا چاہتا ہوں۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ ضرور تشریف لائیے۔ مگر تقدیر کو یہ منظور نہ تھا۔ روانگی سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بیٹوں کے بارے میں بھی ان کی خواہش پوری نہونے پائی۔ ان لوگوں نے پُرانی فضا میں پرورش پائی تھی اور اب وہ اپنا طرز زندگی بدل نہیں سکتے تھے۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے مانوس ہو جائیں مگر کامیابی نہیں ہوئی، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ہر شخص کی طبیعت ایک دریا ہے جس کے دھارے کو وہ روکنا بھی چاہے تو نہیں روک سکتا۔ پیدائش کے وقت اُس کے دل کی لوح پر جو گہرے نقوش ہوتے ہیں وہ اس کے مٹائے نہیں مٹتے۔ یہ اُمید فضول ہے کسی کی اولاد یا وہ بچے جو اس کی ولایت میں ہیں اُسی راہ ارتقا پر چلیں گے جس پر وہ خود

چلتا ہے۔

اِس مثال سے کسی قدر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ اولاد ہونا کتنی بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔

— ( ) —

چھٹا باب

نباتاتی مشرب کے لئے ایک قربانی

جوں جوں میں سادگی اور ایثار کے نصب العین سے قریب تر ہوتا جاتا تھا میری روزمرہ زندگی میں مذہبی احساس اور نباتاتی مشرب کی تبلیغ کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے تبلیغ کا صرف ایک ہی طریقہ معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کی مثال پیش کرے اور جو لوگ حق کے طالب ہیں ان سے بحث مباحثہ کرے۔

جوہانسبرگ میں ایک جرمن نے جو کوہنے کے "پانی کے علاج" کا قائل تھا ایک نباتاتی ریستوراں[1] قائم کیا تھا۔ میں خود اس ریستوراں میں جاتا اور اپنے انگریز دوستوں کو بھی لے جاتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ یہ ریستوراں چلنے والا نہیں کیونکہ یہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتا ہے۔ میں اُسے جتنی مدد کا مستحق سمجھتا تھا اُس میں میں نے دریغ نہیں کیا مگر آخر میں اسکے مالک کو ریستوراں بند ہی کرنا پڑا۔

اکثر تھیوسوفسٹ کم وبیش نباتاتی مشرب رکھتے ہیں۔ ایک باہمت خاتون نے جو تھیوسوفی انجمن کی ممبر تھیں ایک نباتاتی ریستوراں بہت بڑے پیمانے پر کھولنے کا ارادہ کیا مگر اُن کی طبیعت کو اس کام سے مناسبت نہ تھی۔ وہ فنونِ لطیفہ کی شائق فضول خرچی کی عادی اور حساب کتاب سے ناواقف تھیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ انھوں نے ابتدا میں ایک چھوٹا سا ریستوراں کھولا تھا مگر اب یہ چاہتی تھیں کہ اس

---

[1] Restaurant

کے لئے بڑا مکان لیں اور اسے وسیع پیمانے پر لے آئیں۔ انہوں نے مجھ سے اس کام میں مدد مانگی۔ مجھے اُس وقت تک ان کی مالی حالت معلوم نہیں تھی۔ میں نے ان کے اعتبار پر یہ سمجھ لیا کہ جو تخمینہ انھوں نے مجھے بتایا ہے صحیح ہے۔ میرے لئے ان کی مدد کرنے کی ایک صورت بھی نکل آئی۔ میرے موکل میرے پاس بڑی بڑی رقمیں رکھوایا کرتے تھے۔ ان میں ایک سے اجازت لے کر میں نے اس کی طرف سے ایک ہزار پونڈ ان خاتون کو قرض دیدئے۔ یہ بڑا دل والا آدمی تھا اور جس پر اعتبار کرتا تھا اُس پر پوری طرح کرتا تھا۔ یہ ابتداءً میں "پابند مزدور" کی حیثیت سے جنوبی افریقہ آیا تھا۔ جب میں نے اس سے روپیہ قرض دینے کی اجازت مانگی تو اُس نے کہا "آپ کا جی چاہے تو یوں ہی دے ڈالئے۔ میں ان باتوں کو نہیں جانتا۔ میں تو آپ کو جانتا ہوں۔" اس شخص کا نام بدری تھا۔ اس نے آگے چل کر ستیاگرہ میں بہت نمایاں حصہ لیا اور قید بھی بھگتی۔ غرض میں نے اس اجازت کو کافی سمجھ کر روپیہ قرض دے دیا۔

دو تین مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ روپیہ واپس ملنے کی کوئی اُمید نہیں۔ میرے لئے اس نقصان کو برداشت کرنا سہل نہ تھا۔ مگر روپیہ تو ڈوب ہی گیا تھا۔ اتنے روپے سے میرے اور بہت سے کام چلتے۔ میں نے سوچا بیچارہ بدری جو مجھ پر اتنا اعتبار کرتا ہے کیوں نقصان اُٹھائے۔ اُس نے تو میرے بھروسے پر دیا تھا۔ میں نے یہ رقم اپنے پاس سے ادا کر دی۔

ایک موکل نے، جس سے میں نے اس معاملے کا ذکر کیا تھا، مجھے بہت ملامت کی۔ انہوں نے کہا: "بھائی، (خوش قسمتی سے میں اس وقت تک "مہاتما" کیا "باپو" بھی نہیں کہلاتا تھا، میرے دوست مجھے "بھائی" کے پیارے لقب سے مخاطب کرتے تھے)، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ یہ تو سوچئے کہ ہم لوگ آپ پر کتنا بھروسہ کرتے ہیں۔ اب اس رقم سے ہاتھ دھو رکھیئے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آپ بدری کا نقصان

نہ ہونے دیں گے اور یہ روپیہ اپنے پاس سے بھریں گے۔ لیکن آپ اپنے اصلاحی کاموں کی امداد موکلوں کے روپئے سے کرتے رہے تو ایک دن یہ بیچارے بھی تباہ ہو جائینگے اور آپ بھی بھیک مانگنے لگیں گے۔ آپ ہمارے رہنما ہیں اگر آپکی یہ نوبت ہوئی تو ہمارا سارا قومی کام رک جائے گا۔"

یہ دوست خدا کے فضل سے ابتک زندہ ہیں۔ میں نے جنوبی افریقہ میں بلکہ کہیں بھی ان سے بڑھکر پاک نفس آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر انھیں کسی شخص پر شبہہ ہو جائے اور ان کا شبہ بے بنیاد ثابت ہو تو وہ جا کر اس سے معافی مانگتے تھے اور عرقِ ندامت سے اپنے دل کو دھو کر پاک کرتے تھے۔

ان کی تنبیہہ بالکل بجا تھی۔ میں نے بدری کے نقصان کی تو تلافی کر دی لیکن اگر پھر کسی معاملے میں اسی طرح نقصان ہوتا تو میں ہزار پونڈ کہاں سے لاتا؟ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے قرض لینا پڑتا جو میں نے آجتک کبھی نہیں کیا اور جس سے مجھے سخت نفرت ہے۔ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ اصلاح کے جوش میں بھی انسان کو جائز حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ میں نے اپنے موکل کی احسانمندی سے فائدہ اٹھا کر اس کا روپیہ قرض دیدینے میں گیتا کے اس اہم ترین حکم کی خلاف ورزی کی تھی کہ عادل کو کسی کام میں معاوضے کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ ٹھوکر میرے لئے شمع ہدایت بن گئی۔

یہ قربانی جو میں نے نباتاتی مشرب کے لئے کی جان بوجھ کر نہیں کی اور نہ مجھے پہلے سے اس کی خبر تھی۔ یہ تو مارے باندھے کی نیکی تھی۔

ساتواں باب

مٹی پانی کے علاج کے تجربے

میری زندگی میں جتنی سادگی بڑھتی گئی اُسی قدر میرا دل دواؤں سے پھرتا گیا۔ جن دنوں میں ڈربن میں وکالت کرتا تھا مجھے کچھ عرصے تک گٹھیا کی شکایت رہی جس کے سبب سے بدن سوج گیا اور نقاہت بہت بڑھ گئی۔ مگر ڈاکٹر پ۔ ج مہتا کے علاج سے صحت ہوگئی اور اس کے بعد سے ہندوستان جانے تک کبھی کوئی ایسی شکایت نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو۔

مگر جوہانسبرگ آنے کے بعد مجھے اکثر قبض اور درد سر رہتا تھا۔ کھانے میں احتیاط رکھنے سے اور کبھی کبھی ملین دواؤں کے استعمال سے میری صحت سنبھلی رہی۔ مگر اس حالت میں میں اپنے آپ کو تندرست نہیں کہہ سکتا تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح ملین دواؤں کے جنجال سے نجات ملے۔

اسی زمانہ میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا کہ منچسٹر میں ایک انجمن ان لوگوں کی بنی ہے جنہوں نے ناشتہ ترک کر دیا ہے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ انگریز بار بار کھاتے ہیں اور بہت کھاتے ہیں۔ صبح سے آدھی رات تک کھانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹروں کی فیسیں دیتے دیتے اُن کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ اگر انھیں اس کی اصلاح منظور ہے تو انھیں کم سے کم ناشتہ ترک کر دینا چاہیے۔ اگرچہ میری حالت انگریزوں جیسی نہ تھی پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک حد تک یہ الزام مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ میں دن میں تین بار پیٹ بھر کے کھانا کھاتا تھا اور سہ پہر کی چائے اس کے علاوہ

تھی میں ہمیشہ سے خوش خوراک واقع ہوا تھا اور جتنے مزیدار نباتاتی کھانے بے مرچ مسالے کے پک سکتے تھے سب اُڑایا کرتا تھا۔ میں صبح چھ سات بجے سے پہلے سو کر نہیں اُٹھتا تھا (اور چند گھنٹے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت آجاتا تھا) اس لئے میں نے سوچا کہ میں بھی ناشتہ چھوڑ دوں۔ شائد اس طرح سے سر کا درد جاتا رہے۔ میں نے اس کا تجربہ کیا۔ چند روز تک ذرا بھوک کی تکلیف تو رہی مگر سر کا درد بالکل جاتا رہا۔ اس لئے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میری غذا ضرورت سے زیادہ تھی۔

مگر ناشتے کے ترک کرنے سے قبض کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے کوہنے کے "کمر اور کولے کے غسل" کا تجربہ کیا۔ اس سے کچھ تخفیف تو ہوئی مگر پوری طرح ازالہ نہیں ہوا۔ اسی اثنا میں اس جرمن نے جو ریستوران کا مالک تھا یا کسی اور دوست نے مجھے جسٹ کی کتاب "رجوع بہ فطرت" دی۔ اس کے پڑھنے سے مجھے مٹی کے علاج کا طریقہ معلوم ہوا۔ مصنف نے اس پر بھی زور دیا تھا کہ تازے پھل اور "نٹ"[1] (اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ) انسان کی قدرتی غذا ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کیا کہ سوائے پھلوں کے اور سب چیزیں یک لخت چھوڑ دی ہوں مگر مٹی کا علاج فوراً شروع کر دیا اور اس سے حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ علاج کا طریقہ یہ تھا کہ ایک باریک کپڑے کی پٹی لے کر اس پر صاف مٹی کی تہ جما دی اور اسے پانی سے تر کر کے پیٹ پر باندھ لیا۔ میں سوتے وقت یہ پٹی باندھ لیتا تھا اور صبح کو یا رات میں جس وقت آنکھ کھلے کھول ڈالتا تھا۔ یہ تدبیر تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اس کے بعد میں نے بارہا اس علاج کا تجربہ خود کیا ہے اور اپنے دوستوں کو کرایا ہے اور ہمیشہ فائدہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں مجھے اس کا پورا تجربہ کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ایک جگہ جم کر رہنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر مجھے اس پر اب بھی وہی عقیدہ ہے جو پہلے تھا۔ آج بھی میں یہ

---

[1] Nuts

ایک حد تک مٹی پانی کے علاج پر عامل ہوں اور ضرورت کے وقت اپنے دوستوں کو بھی یہی بتاتا ہوں۔ گو میں اپنی عمر میں دو بار سخت بیمار ہوا مگر میرا عقیدہ ہے کہ انسان کو دواؤں کے استعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہزار مریضوں میں سے نو سو ننانوے محض غذا میں احتیاط کرنے، مٹی پانی کے علاج اور اسی قسم کے گھریلو چٹکلوں سے اچھے ہو سکتے ہیں۔ جو شخص ذرا ذرا سی بات کے لئے ڈاکٹر، وید یا حکیم کے پاس دوڑا جاتا ہے اور دنیا بھر کی نباتاتی اور معدنی دوائیں نگلا کرتا ہے اُس کی زندگی ہی نہیں گھٹ جاتی بلکہ وہ اپنے جسم کا غلام بن کر ضبط نفس کھو دیتا ہے اور انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔

میں یہ باتیں اس وقت لکھ رہا ہوں جب میں خود بستر علالت پر ہوں۔ مگر اس بنا پر کسی کو ان کی سچائی میں شبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے اپنی بیماری کے اسباب معلوم ہیں، مجھے پوری طرح احساس ہے کہ اس میں سراسر میرا ہی قصور ہے اور اسی احساس کی وجہ سے مجھے بے صبری نہیں بلکہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کر دیا اور ہر قسم کی دواؤں سے پرہیز کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری اس ضد سے میرے معالج ڈاکٹروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر ان کی مہربانی ہے کہ وہ ان باتوں کو برداشت کرتے ہیں اور میرے علاج سے دست کش نہیں ہوتے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب مجھے اصل قصے کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ مگر اس سے پہلے اس کتاب کے پڑھنے والوں کو ایک بات سے متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو لوگ اس باب کے مطالعے کی بنا پر جسٹ کی کتاب خریدیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے حرف بحرف صحیح ہے۔ جو شخص کوئی کتاب لکھتا ہے وہ اکثر ایک خاص نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے حالانکہ ہر مسئلے پر غور کرنے کے مختلف نقطۂ نظر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر نقطۂ نظر اپنی اپنی جگہ صحیح ہو مگر ایک ہی وقت میں اور ایک ہی صورت حال میں یہ سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی کتابیں خریدار بہم پہونچانے کے

لئے اور نام ونمود کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کو چاہیئے
کہ بہت سمجھ بوجھ سے کام لیں اور نئے تجربے کرنے سے پہلے کسی تجربہ کار سے مشورہ کرلیں یا خود
ہی ان کتابوں کو اس قدر غور سے پڑھیں کہ ان کے مطالب پر پوری طرح حاوی ہو جائیں
اور اس کے بعد ان پر عمل کریں۔

———— ‹ (۰) › ————

آٹھواں باب

تنبیہہ

بیچ میں ایسی بات چھڑ گئی ہے کہ مجھے یہ پورا باب اسی کی نذر کرنا پڑیگا۔ مٹی کے علاج کے تجربوں کے ساتھ ساتھ میں غذائیات کے تجربے بھی کرتا رہا۔ یہاں میں ان کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں اور آگے بھی مناسب موقعوں پر ان کی طرف اشارہ کروں گا۔

غذائیات کے تجربوں پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان پر گجراتی میں ایک سلسلۂ مضامین لکھ چکا ہوں۔ بہت دن ہوئے یہ مضامین "انڈین اوپنین" میں چھپے تھے اور پھر انگریزی میں "رہنمائے صحت" کے نام سے ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئے۔ میری مختصر تصانیف میں ہی رسالہ مشرق اور مغرب میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اصل میں یہ "انڈین اوپنین" پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کا اثر مشرق اور مغرب میں بہت سے ایسے لوگوں کی زندگی پر پڑا ہے جنھوں نے کبھی "انڈین اوپنین" کی شکل تک نہیں دیکھی۔ بہت سے لوگ مجھ سے اس بارے میں خط و کتابت کرتے رہے اور اب تک کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کا ذکر کر دیا جائے میں نے جو خیالات اس میں ظاہر کیے تھے ان پر اب بھی قائم ہوں لیکن میرے عمل میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں جن سے اس رسالے کے پڑھنے والے واقف نہیں ہیں۔ انھیں ان تبدیلیوں سے آگاہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دوسری کتابوں کی طرح میں نے یہ رسالہ بھی روحانی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔

میرا ہر عمل اسی مقصد کا تابع ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ آج کل میں اس رسالے
کے بعض اصولوں پر عمل نہیں کر سکتا۔

میرا قطعی عقیدہ ہے کہ انسان کو بجز ماں کے دودھ کے جو وہ بچپن میں پیتا ہے، دودھ کے
استعمال کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس کی غذا میں سوائے دھوپ میں پکے ہوئے پھلوں
اور مونگ پھلی، اخروٹ وغیرہ کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے رگ پٹھوں کے لئے
جتنی غذا کی ضرورت ہے وہ انگور جیسے تازہ پھل اور بادام جیسے خشک میوے سے حاصل
ہو سکتی ہے۔ جو شخص ان چیزوں پر بسر کرتا ہے اُسے شہوت جنسی اور دوسرے جذبات
کی روک تھام میں آسانی ہوتی ہے۔ میں نے اور میرے رفیقوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ
ہندوستان کی مثل "آدمی جس قسم کی غذا کھائے گا ویسی ہی اسکی طبیعت بنجائیگی" بڑی حد تک صحیح
ہے۔ یہی خیالات اس رسالے میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں مجھے اپنے بعض اصولوں کے خلاف عمل کرنا پڑا۔
جن دنوں میں کھیڑا میں رنگروٹ بھرتی کر رہا تھا کھانے میں کچھ بے احتیاطی ہوئی اور
میں ایسا بیمار پڑا کہ بچنے کی اُمید نہ رہی۔ اس بیماری نے میرے جسم کو توڑ دیا۔ میں نے
لاکھ کوشش کی کہ بغیر دودھ کے قوت آئے مگر کسی طرح کام نہ چلا۔ میں نے اپنی جان
پہچان کے سارے ڈاکٹروں، ویدوں اور سائنس دانوں سے پوچھا کہ دودھ کا بدل کیا
ہو سکتا ہے بعض نے مونگ کا پانی بتایا بعض نے مہوا کا تیل، اور بادام کا شیرہ تجویز کیا۔
میں نے ان چیزوں کا تجربہ کر کر کے اپنے جسم کو گھلا ڈالا مگر کسی طرح اتنی قوت نہ آئی کہ
بستر سے اٹھ سکوں۔ .... ویدوں نے مجھے چرک پڑھکر سنائی کہ دوا علاج میں
مذہبی خدشوں کو دخل نہیں دینا چاہیئے۔ اس لئے ان سے یہ توقع بیکار تھی کہ مجھے بغیر
دودھ کے جینے کی کوئی تدبیر بتائیں گے۔ جب ان کا یہ حال تھا تو وہ لوگ جو گائے کے
گوشت کی یخنی اور برانڈی تجویز کرتے ہیں مجھے دودھ سے بچنے کی تدبیر کیسے بتا سکتے تھے؟

گائے بھینس کا دودھ استعمال کرنے سے تو میں اپنے عہد کی وجہ سے معذور تھا۔ اصل میں عہد کا منشا تو یہی تھا کہ ہر قسم کا دودھ ترک کر دیا جائے مگر کچھ اس خیال سے کہ عہد کرتے وقت میرے پیش نظر گائے اور بھینس کا دودھ تھا اور کچھ اس لئے کہ مجھے زندگی کی خواہش تھی میں نے اپنے دل کو پھسلا کر اس پر راضی کر لیا کہ عہد کے الفاظ کی پابندی پر قناعت کرے اور میں بکری کا دودھ استعمال کرنے لگا۔ جب میں نے پہلی بار بکری کا دودھ پیا تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اپنے عہد کے اصل مقصد کو برباد کر رہا ہوں۔

مگر مجھے اس زمانے میں رولٹ ایکٹ کو منسوخ کرانے کی دُھن تھی۔ اس لئے زندگی کی خواہش غالب آگئی اور میری زندگی کا اہم ترین تجربہ ادھورا رہ گیا۔

مجھے معلوم ہے بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ روح کچھ کھاتی پیتی نہیں اس لئے ہمارے کھانے پینے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انسان پیٹ میں کیا چیز ڈالتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دل و دماغ سے کیا بات نکالتا ہے۔ مگر میں اس کا جواب دینے کے بجائے محض اس پر قناعت کرتا ہوں کہ اپنا دلی عقیدہ ظاہر کر دوں۔ میرے نزدیک طالبِ حق کے لئے جو خوفِ خدا میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور دیدارِ الٰہی کی آرزو رکھتا ہے اپنے خیال اور کلام کی طرح اپنی غذا کے کیف و کم میں بھی ضبطِ نفس سے کام لینا ضروری ہے۔

مگر جب میں خود اس معاملے میں اپنے اصول پر عمل نہ کر سکا تو مجھے محض واقعات بیان کرنے پر اکتفانہ کرنا چاہئے بلکہ دوسروں کو متنبہ بھی کر دینا چاہئے۔ جن لوگوں نے میرے اصول کے مطابق دودھ کا استعمال چھوڑ دیا ہے انھیں میں تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اسے ترک کر دیں۔ البتہ اگر انھیں اسمیں ہر طرح فائدہ محسوس ہوتا ہو یا تجربہ کار طبیبوں کی رائے ہو تو ضرور جاری رکھیں۔ اب تک مجھے ہندوستان کے تجربے سے یہی معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ صاحبِ فراش ہیں یا جن کا ہاضمہ کمزور ہے اُن کے لئے

دودھ جیسی ہلکی اور مقوی اور کوئی غذا نہیں ہے۔
اگر کوئی شخص جسے ان معاملات میں درک ہو، کتابوں کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربے سے، مجھے دودھ کا کوئی نباتاتی بدل بتا سکے جو اسی قدر مقوی اور زود ہضم ہو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

=(۰)=

نواں باب

حکومت سے مقابلہ

اب ایشیائی محکمے کا حال سنیئے:

اس کے عہدہ داروں کا جتنا زور جوہانسبرگ میں تھا اور کہیں نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں، چینیوں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے بجائے اور الٹا انھیں پیس رہے تھے۔ روزمرہ اس قسم کی شکایتیں سننے میں آتی تھیں "جو داخلے کے حقدار ہیں وہ داخل نہیں ہونے پاتے اور جنھیں کوئی حق نہیں وہ سو سو پونڈ دے کر چلے آتے ہیں۔ اگر تم اس اندھیر کی روک تھام نہیں کروگے تو کون کرے گا؟" میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں دل میں کہتا تھا کہ اگر میں اس بلا کو دور نہ کرسکا تو میرا ٹرانسوال میں رہنا بیکار ہے۔

اس لیے میں نے ان شکایتوں کے ثبوت فراہم کرنا شروع کیے۔ اور جب کافی مسالہ جمع ہوگیا تو میں کمشنر پولیس کے پاس پہنچا۔ وہ منصف مزاج آدمی نکلا۔ مجھے ٹالنے کے بجائے اس نے بہت صبر سے میری باتیں سنیں اور کہا کہ تمہارے پاس جو کچھ ثبوت ہے مجھے دکھاؤ۔ اس نے خود گواہوں کی شہادت سن کر اپنا پورا اطمینان کرلیا۔ مگر وہ بھی جانتا تھا اور میں بھی جانتا تھا کہ جنوبی افریقہ میں کوئی فرنگیوں کی جوری کالے آدمیوں کے مقابلہ میں گورے افسروں کو ملزم نہیں ٹھہرائے گی۔ مگر اس نے کہا "کم سے کم ایک بار کوشش تو کرنا چاہیے۔ یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ ایسے مجرموں پر محض اس خوف سے ہاتھ نہ ڈالا جائے کہ جوری انہیں رہا کردے گی۔ میں تو انھیں گرفتار کیے بغیر نہ مانوں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا۔"

مجھے اس کے بے کہے اس بات کا یقین تھا۔ مجھے بہت سے عہدہ داروں پر شبہہ تھا
مگر چونکہ میرے پاس اُن سب کے خلاف قطعی شہادت نہیں تھی اس لئے میں نے صرف دو
شخصوں کے نام وارنٹ جاری کرائے جن پر جرم بالکل ثابت تھا۔

میری یہ عادت نہیں کہ اپنی نقل وحرکت پوشیدہ رکھوں۔ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ
میں قریب قریب روزانہ کمشنر پولیس کے یہاں جاتا ہوں۔ جن دو عہدہ داروں کی گرفتاری
کے لئے وارنٹ جاری ہوئے تھے انہوں نے مخبر لگا رکھے تھے۔ یہ لوگ میرے دفتر
کے گرد چکر کاٹا کرتے تھے اور میری نقل وحرکت کی رپورٹ اُن عہدہ داروں کو پہونچاتے
تھے۔ مگر یہ دونوں اس قدر بدطینت تھے کہ انہیں جاسوس بھی مشکل سے ہی ملتے ہونگے۔
ہندوستانی اور چینی تو ان سے اس قدر نالاں تھے کہ انہوں نے ان کی گرفتاری میں
پولیس کی امداد کی ورنہ ان کا ہاتھ آنا مشکل تھا۔

ان میں سے ایک تو فرار ہوگیا تھا۔ کمشنر پولیس نے اُس کی سپردگی کے لئے وارنٹ
جاری کرا کر دوسری حکومتوں کے پاس بھیجا اور وہ گرفتار کرکے ٹرانسوال لایا گیا۔ ان دونوں
کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور باوجودیکہ ان کے خلاف بہت قوی شہادت تھی اور
جوری کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں سے ایک فرار ہوگیا تھا۔ مگر دونوں بے قصور قرار
دے کر بری کردے گئے۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کمشنر پولیس کو بھی بہت رنج ہوا۔ میرا دل قانون کے
پیشے سے پھر گیا بلکہ مجھے سرے سے ذہنی قابلیت سے نفرت ہوگئی کیونکہ میں نے دیکھا کہ
یہ روپیے کے بدلے مجرموں کے جرم پر پردہ ڈالنے میں صرف کی جاتی ہے۔

مگر ان دونوں عہدہ داروں کا جرم اتنا کھلا ہوا تھا کہ ان کے بری ہو جانے پر
بھی حکومت انھیں اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکی۔ دونوں برخاست کردے گئے۔ ایشیائی محکمہ
پہلے کے مقابلے میں پاک صاف ہوگیا اور ہندوستانیوں کے تھوڑے بہت آنسو پچھ گئے۔

اس واقعے سے میری دھاک بیٹھ گئی اور میرے پاس کثرت سے مقدمے آنے لگے۔ ہماری برادری جو سیکڑوں پونڈ رشوت کے ہر مہینے دیا کرتی تھی اُس میں سے بہت بڑا حصہ بچ گیا۔ سب اس لئے نہیں بچ سکا کہ بے ایمان لوگوں نے اب بھی اپنی حرکتیں نہیں چھوڑیں مگر کم سے کم اتنا ہو گیا کہ اب ایماندار لوگ اپنی ایمانداری قائم رکھ سکتے تھے۔

گو یہ عہدہ دار اتنے بدکردار تھے مگر مجھے ان سے کوئی ذاتی مخالفت نہیں تھی۔ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ آڑے وقت میں انہوں نے میرا سہارا ڈھونڈھا اور میں نے اپنے مقدور بھر ان کی مدد کی۔ انھیں جوہانسبرگ کی میونسپلٹی میں ملازمت مل رہی تھی مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں اس تجویز کی مخالفت نہ کروں۔ ان کے ایک دوست کے کہنے سننے سے میں اس پر راضی ہو گیا کہ اس معاملے میں مزاحمت نہ کروں گا چنانچہ دونوں کو جگہ مل گئی۔

میرے اس طرز عمل کا یہ اثر ہوا کہ جن عہدہ داروں سے مجھے سابقہ تھا ان کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا اور باوجود اس کے کہ مجھے اکثر ان کے محکمے سے لڑنا پڑتا تھا اور انھیں سخت سست کہنے کی بھی نوبت آجاتی تھی ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ اس وقت تک مجھے پوری طرح اس بات کا احساس نہ تھا کہ یہ رواداری میری سرشت میں ہے۔ آگے چلکر مجھے معلوم ہوا کہ یہ ستیاگرہ کی جان اور "اہمسا" کی شان ہے۔

انسان کی ذات اور اُس کے افعال یہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اچھے فعل پر تحسین اور بُرے پر نفرین کرنا چاہیئے لیکن فاعل اگر اچھا ہے تو عزت کا اور بُرا ہے تو رحم کا مستحق ہے۔ "نفرت جرم سے کرو مجرم سے نہ کرو" ایسی تعلیم ہے جس کا سمجھنا تو سہل ہے مگر اس پر عمل بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفرت کا زہر دنیا میں پھیل رہا ہے۔

یہی "اہمسا" تلاش حق کی بنیاد ہے۔ مجھ پر روز بروز یہ بات روشن ہوتی جاتی ہے کہ حق تک رسائی کی کوشش بے "اہمسا" کے زینہ کے بالکل فضول ہے۔ کسی نظام

کی مزاحمت یا تخریب کی کوشش جائز ہے مگر اس کے بانی کے آزار کے درپے ہونا خود اپنے ساتھ بدسلوکی کرنا ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں، ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بحرِ حقیقت کا قطرہ ہے اور قطرہ بحر کی طرح نامحدود ہے۔ کسی قطرے کو حقیر سمجھنا دریا کی حقارت کرنا ہے کسی بندے کا دل دکھانا ساری خدائی کو دکھ دینا ہے۔

دسواں باب

ایک گناہ اور اُس کی ندامت

میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مجھے مختلف مذہب وملت کے لوگوں سے سابقہ رہا اور ان تجربوں کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اپنے اور غیر، دیسی اور بدیسی، گورے اور کالے، ہندو مسلمان، پارسی، عیسائی، یہودی میں فرق نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میری طبیعت میں اس طرح کا فرق کرنے کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس میں میری کوئی تعریف نہیں کیونکہ میں نے یہ صفت اپنی سعی سے حاصل نہیں کی بلکہ یہ میری سرشت میں ہے۔ برخلاف اس کے "اہمسا" "برہمچاریہ" "اپری گرہ" اور دوسری بنیادی نیکیوں کے حصول کے لیے مجھے مسلسل کوشش کرنا پڑی اور اب بھی کرنا پڑتی ہے۔

جب میں ڈربن میں وکالت کرتا تھا تو میرے دفتر کے محرر اکثر میرے گھر میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض گجراتی ہندو تھے، اور بعض تامل عیسائی۔ میں انھیں اپنے عزیزوں کی طرح رکھتا تھا اور میری بیوی کبھی اس میں مزاحمت کرتی تھیں تو مجھ سے ان سے ان بن ہو جاتی تھی۔ انھیں محرروں میں ایک عیسائی تھا جس کے ماں باپ "پنچم"[1] تھے۔

ہمارا مکان مغربی وضع کا تھا۔ اس کے کمروں میں نالیاں نہیں تھیں اور ہونا بھی

---

[1] یہ ایک نیچ ذات سمجھی جاتی ہے۔

نہیں چاہئے تھیں۔ ہر کمرے میں "پاٹ" رکھ دئے گئے تھے۔ مجھے یہ پسند نہ تھا کہ انھیں مہتر سے
یا نوکروں سے صاف کراؤں اس لئے میں خود یا میری بیوی انھیں صاف کیا کرتی تھیں۔
جو محرر ہم لوگوں میں گھل مل گئے تھے وہ اپنے "پاٹ" آپ صاف کرلیا کرتے تھے۔ مگر
یہ عیسائی محرر نیا نیا آیا تھا اس لئے اس کے کمرے کی صفائی کرنا ہمارا فرض تھا۔ دوسروں
کے "پاٹ" صاف کرنے میں میری بیوی نے کبھی عذر نہیں کیا مگر جو شخص "پنچم" سے عیسائی
ہوا تھا اس کا میلا اُٹھانا انھیں کسی طرح گوارا نہیں ہوا۔ اس بات پر ہم دونوں میں ان بن
ہوگئی۔ اُن سے نہ تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ میں اس شخص کا "پاٹ" اُٹھاؤں اور نہ وہ خود
اُٹھانا پسند کرتی تھیں۔ میری آنکھوں میں آج تک وہ تصویر پھرتی ہے کہ وہ پاٹ ہاتھ میں
لئے سیڑھی سے اُتر رہی ہیں، آنکھیں غصے سے لال ہیں، رخساروں پر آنسو بہ رہے ہیں
اور مجھے بُرا بھلا کہہ رہی ہیں۔ مگر مجھے ان سے جو محبت تھی وہ ظلم کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ میں
اپنے آپ کو اُن کا معلم سمجھتا تھا۔ میری اندھی محبت سے اُن کی جان عذاب میں تھی۔

صرف اُن کا "پاٹ" اُٹھا لینا میرے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ
یہ خدمت خندہ پیشانی سے انجام دیں اس لئے میں نے درشتی کے ساتھ کہا "مجھے اپنے
گھر میں یہ بیہودگی پسند نہیں۔"

یہ لفظ اُن کے دل میں تیر کی طرح لگے۔

انہوں نے جھنجھلا کر جواب دیا "تمہیں اپنا گھر مبارک ہو مگر میرا ایمان نباہ نہیں ہو سکتا۔"

میں یہ سن کر اپنے آپے میں نہ رہا اور میرے دل میں رحم کا ہر چشمہ خشک ہو گیا۔ میں
اُن بیچاری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا سیڑھی کے سامنے پھاٹک میں لے گیا اور دروازہ کھولنے
لگا کہ انھیں باہر ڈھکیل دوں۔ وہ زار و قطار روتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں "تمہیں
ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ آدمیت سے گذرے جاتے ہو۔ آخر میں جاؤں کہاں؟ یہاں
نہ میرے ماں باپ ہیں نہ بھائی بند ہیں جو میرے سر پر ہاتھ رکھیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں

اس لئے تم چاہتے ہو کہ بس ٹھوکریں کھاؤں اور اُف نہ کروں؟ خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ دروازہ بند کرو۔ لوگ ہمیں اس حالت میں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟"

بظاہر میں تیس مار خاں بنا رہا لیکن دل میں بہت شرمندہ ہوا اور میں نے دروازہ بند کر دیا۔ نہ میری بیوی مجھے چھوڑ سکتی تھیں نہ میں انھیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہم دونوں میں اکثر لڑائیاں ہوئیں مگر ہمیشہ صلح پر خاتمہ ہوا۔ میری بیوی کو اپنے بے مثل صبر و تحمل کی بدولت ہر معرکے میں فتح ہوئی۔

آج میں اس واقعہ کو کسی قدر بے تعلقی کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں کیونکہ یہ اس دور کا ذکر ہے جس سے میں خوش قسمتی سے گذر چکا ہوں۔ اب میں وہ محبت سے اندھا شوہر نہیں ہوں اور نہ اپنی بیوی کا معلم بنتا ہوں۔ اب اگر وہ چاہیں تو مجھے اتنا ہی ستا سکتی ہیں جتنا میں انھیں پہلے ستایا کرتا تھا۔ ہم دونوں میں ایسی دوستی ہے جو بہت سے امتحانوں میں پوری اُتر چکی اور اب ہم ایک دوسرے کو خواہشاتِ نفسانی کا موضوع نہیں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے میری بیماریوں میں ہمیشہ بڑی بے نفسی سے میری تیمار داری کی۔

یہ واقعہ ۱۸۹۸ء میں ہوا جب مجھے برہمچاریہ کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ان دنوں میں بیوی کو شوہر کی رفیق مددگار اس کے رنج و راحت کی شریک نہیں بلکہ اس کی خواہشاتِ نفسانی کا کھلونا سمجھتا تھا۔

۱۹۰۰ء میں ان خیالات میں کایا پلٹ ہو گئی اور ۱۹۰۶ء میں انہوں نے ایک معینہ صورت اختیار کر لی۔ مگر اس کا ذکر میں مناسب موقعے پر کروں گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میری نفسانی خواہشوں کے معدوم ہو جانے سے میری گھریلو زندگی روز بروز پُر امن، خوشگوار اور مسرت بخش ہوتی جاتی ہے۔

اس واقعے سے، جس کی یاد کو میں تبرک سمجھکر عزیز رکھتا ہوں، کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم دونوں کے تعلقات میاں بیوی کے اتحاد کا کامل نمونہ ہیں یا میرا اور میری بیوی کا نصب العین

بالکل ایک ہے۔ یوں تو ان بیچاری کو احساس بھی نہیں کہ وہ کوئی علیحدہ نصب العین رکھتی ہیں مگر بہت ممکن ہے کہ میری بعض باتیں انھیں اب بھی پسند نہ ہوں۔ ہم دونوں میں کبھی ان چیزوں پر گفتگو نہیں ہوتی۔ میں اسے بیکار سمجھتا ہوں کیونکہ ان غریب کو نہ تو ان کے ماں باپ نے پڑھایا اور نہ میں نے اس زمانہ میں تعلیم دی جو اس کے لئے مناسب تھا۔ ان میں یہ بہت بڑا وصف ہے جو ایک حد تک سب ہندو بیویوں میں ہوتا ہے کہ چاہے ان کا جی چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو، انھیں اس کا احساس ہو نہ ہو انھوں نے ہمیشہ میری پیروی کو باعث سعادت سمجھا اور میری ضبط نفس کی سعی میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس لئے گو ہم دونوں کی ذہنی قابلیت میں بڑا فرق ہے مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہماری زندگی اطمینان، مسرت اور ترقی کی زندگی ہے۔

گیارھواں باب

فرنگیوں سے میل جول

اس مقام پر ناظرین کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ آپ بیتی میں نے ہفتہ وار مضامین کی شکل میں لکھی ہے۔

جب میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تو میرے پیش نظر کوئی معینہ خاکہ نہ تھا۔ میرے پاس کوئی روزنامچہ یا دوسری تحریریں نہیں ہیں جن سے اپنے تجربوں کی داستان لکھنے میں مدد لے سکوں۔ مجھ سے استادِ ازل جو لکھواتا ہے قلم برداشتہ لکھ دیتا ہوں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا ہر خیال اور ہر فعل خدا کی طرف سے ہے مگر جب میں ان چھوٹے بڑے کاموں پر غور کرتا ہوں جو میرے ہاتھ سے انجام کو پہنچے تو یہ کہنا بیجا نہیں معلوم ہوتا کہ ان سب میں کچھ ادھر کا اشارہ ضرور تھا۔

مجھے نہ خدا کا دیدار نصیب ہوا نہ اُس کی معرفت حاصل ہوئی۔ ساری خدائی کو خدا کا قائل دیکھ کر میں بھی قائل ہو گیا۔ مگر میرا عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ میں اسے تجربہ کے برابر سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے لوگ یہ اعتراض کریں کہ عقیدے کو تجربہ کہنا حق کا منہ چڑانا ہے۔ اس لئے غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مجھے خدا پر جو عقیدہ ہے اُسے بیان کرنے کے لئے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا۔

اب شائد لوگوں کو میرا یہ فقرہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ میں یہ آپ بیتی اسی طرح لکھتا ہوں جیسے اُستادِ ازل لکھواتا ہے۔ جب میں نے پچھلا باب لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو اس کا عنوان وہ رکھا تھا جو اس باب کا ہے۔ مگر پھر یہ خیال آیا کہ فرنگیوں سے میل جول کا

ذکر کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر ایک واقعہ جو کئی سال پہلے گذرا تھا بیان کر دینا چاہیئے۔ اس لئے میں نے عنوان بدل کر وہ واقعہ لکھ دیا۔

مگر یہ باب شروع کرتے وقت میں پھر الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جن انگریز دوستوں کا ذکر کرنے والا ہوں ان کی کونسی باتیں لکھوں اور کونسی نہ لکھوں اگر ضروری باتیں چھوٹ گئیں تو حقیقت دھندلی ہو کر رہ جائے گی۔ سرسری نظر میں یہ کیسے معلوم ہو کہ کون چیز ضروری ہے؟ مجھے تو اسی میں شبہ ہے کہ اس کتاب کا لکھنا بھی ضروری ہے یا نہیں۔

بہت دن ہوئے میں نے پڑھا تھا کہ آپ بیتی بحیثیت تاریخ کے ناقص ہوتی ہے۔ آج اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ مجھے جتنی باتیں معلوم ہیں سب تو میں اس کتاب میں لکھ نہیں سکتا۔ اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حق کی صحیح تفسیر کے لئے ان میں سے کیا کیا لے لینا چاہیئے اور کیا کیا چھوڑ دینا چاہیئے؟ اور پھر میری زندگی کے متعلق میری یک طرفہ شہادت کی کسی عدالت کی نظر میں کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی شخص میرے پیچھے پڑ جائے اور جتنے باب میں لکھ چکا ہوں اُن کے متعلق مجھ سے جرح کرنے لگے تو شائد ان کا مطلب زیادہ واضح ہو جائے گا۔ اور اگر اُس کی جرح مخالفانہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ اُسے "میرے دعووں کی پول کھول دینے" پر فخر کرنے کا موقع ملے۔

ذرا دیر کے لئے میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس دفتر کو تہ کر دوں۔ مگر جب تک اندرونی آواز مجھے منع نہ کرے گی میں لکھتا جاؤں گا۔ مجھے اس حکیمانہ اصول پر عمل کرنا چاہیئے کہ جو کام ایک بار شروع کر دیا جائے اُسے کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے بجز اس صورت کے کہ اس میں کوئی اخلاقی بُرائی نظر آئے۔

میں یہ آپ بیتی نقادوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں۔ اس کا لکھنا خود تلاش حق کا ایک تجربہ ہے۔ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے رفیقوں کے لئے روحانی غذا اور

تسکین فراہم کروں بلکہ انھیں کے اصرار سے میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کیا۔ اگر جیرام داس اور سوامی آنند کا اصرار نہ ہوتا تو یہ کبھی نہ لکھی جاتی۔ اگر یہ تجویز قابلِ الزام ہے تو میرے ساتھ وہ دونوں بھی ملزم ہیں۔

اب میں اصل مطلب پر آتا ہوں جس کی طرف اس باب کے عنوان میں اشارہ ہے۔ جس طرح ڈربن میں میرے ساتھ ہندوستانی مہمان عزیزوں کی طرح رہتے تھے اسی طرح انگریز بھی رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں کو میرے یہاں رہنا پسند نہ تھا مگر میں اصرار سے رکھتا تھا۔ اس معاملے میں میں نے غلطیاں بھی کیں اور کچھ لوگوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ ہوا جن میں ہندوستانی بھی تھے اور فرنگی بھی۔ مگر باوجود ان تجربوں کے اور باوجود اس پریشانی اور تکلیف کے جو میرے دوستوں کو میری وجہ سے اُٹھانا پڑی ہیں نے اپنا یہ معمول ترک نہیں کیا اور وہ بیچارے بھی میری خاطر سب کچھ سہتے رہے۔ جب کبھی میرے دوستوں کو میرا اجنبیوں سے میل جول رکھنا ناگوار ہوا میں نے ہمیشہ انھیں ملامت کی۔ میرا عقیدہ ہے کہ جن لوگوں کو دوسروں میں اور اپنے آپ میں ایک ہی خدا کا جلوہ نظر آتا ہے انھیں باہمہ اور بے ہمہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنا چاہیئے! اور یہ عادت اسی طرح پڑتی ہے کہ جب آپ ہی آپ دوسروں سے میل جول کا موقع نکل آئے تو انسان پہلو نہ بچائے بلکہ سچے جذبۂ خدمت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرے مگر اپنے دل کو ان سے وابستہ نہ ہونے دے۔

اس لیئے گو جنگِ بوئر کے آغاز کے وقت میرا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا میں نے دو انگریزوں کو جو جوہانسبرگ سے آئے تھے اور ٹھہرا لیا۔ یہ دونوں تھیوسوف تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر کچن تھے جن کا ذکر آگے تفصیل سے آئیگا۔ ان دوستوں کی بدولت میری بیوی اکثر آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں۔ وہ میرے ہاتھوں پہلے بھی اس قسم کی تکلیفیں اُٹھا چکی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریز میرے ساتھ بے تکلفی سے عزیزوں کی طرح آن کر

رہے تھے ۔ میں انگلستان میں انگریزوں کے گھر رہ چکا تھا مگر میں وہاں اُن کے طریقوں کی پابندی کرتا تھا اور پھر اتنی بے تکلفی بھی نہ تھی ۔ یہاں معاملہ بالکل اُلٹا تھا ۔ انگریز دوست ہم میں گھل مل گئے تھے اور انہوں نے بہت سی باتوں میں ہندوستانی طریقہ اختیار کر لیا تھا میرے گھر میں ظاہری ساز و سامان تو مغربی تھا مگر اندرونی زندگی زیادہ تر ہندوستانی تھی ۔ مجھے یاد ہے کہ گو مجھ کو ان سے بے تکلف ہونے میں کسی قدر دقت ہوئی مگر وہ بہت جلد میرے گھر کی زندگی سے مانوس ہو گئے ۔ جوہانسبرگ میں اس قسم کے میل جول کے موقعے ڈربن سے بھی زیادہ ملے ۔

بارھواں باب

فرنگیوں سے میل جول (نمبر ۲)

جوہانسبرگ میں ایک زمانے میں میرے یہاں چار محرّر تھے جنھیں میں اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا تھا۔ مگر کام اتنا تھا کہ یہ بھی کافی نہ ہوئے۔ کاغذات ٹائپ کرنے کی بہت ضرورت پڑتی اور ٹائپ نویسی ہم سب میں اگر کچھ تھوڑا بہت جانتا تھا تو میں ہی جانتا تھا۔ میں نے دو محرروں کو سکھانا چاہا مگر ان کی استعداد انگریزی میں بہت کم تھی اس لئے ترقی نہ کر سکے۔ پھر ان میں سے ایک کو میں محاسب کا کام سکھانا چاہتا تھا۔ نٹال سے کسی کو بلا نہیں سکتا تھا کیونکہ ٹرانسوال میں بغیر پروانے کے داخل ہونے کی ممانعت تھی اور مجھے اپنے ذاتی کام کے لئے پرمٹ افسر کا ممنونِ احسان ہونا منظور نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ کام کی بقایا کا انبار بڑھتا جاتا تھا۔ میں بڑی محنت کرتا تھا لیکن پیشے کا کام اور قومی کام مل کر اتنا ہو گیا کہ کسی طرح نہ سنبھلتا تھا۔ میں اس پر تیار تھا کہ فرنگی محرر رکھوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ کوئی فرنگی مرد یا عورت میرے جیسے کالے آدمی کا کام کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ بہرحال میں نے یہ طے کیا کہ کوشش ضرور کرنا چاہئے۔ میں نے ایک ٹائپ نویسوں کے ایجنٹ سے فرمائش کی کہ مجھے ایک مختصر نویس ڈھونڈھ دو۔ اُس نے کہا کہ نوجوان عورتیں مل سکتی ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو نوکری پر راضی کر دوں گا۔ اُسے ایک نوجوان اسکاچ خاتون مس ڈک مل گئیں جو سیدھی اسکاٹستان سے آئی تھیں۔ یہ جائز طریقے سے روزی کمانے پر تیار تھیں چاہے کسی کا بھی کام کرنا پڑے اور حاجتمند بھی تھیں۔ اس لئے ایجنٹ نے انھیں میرے پاس بھیجدیا۔ میں نے صورت

دیکھتے ہی ان کی طرف سے اچھا خیال قائم کرلیا

میں نے پوچھا "آپ کو ہندوستانی کے یہاں کام کرنے میں تامل تو نہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "مطلق نہیں"۔

"آپ تنخواہ کیا چاہتی ہیں؟"

"یہی سولہ سترہ پونڈ۔ یہ تنخواہ زیادہ تو نہیں؟"

"نہیں اگر آپ کا کام میرے حسب منشا ہو تو زیادہ نہیں۔ آپ کب سے کام شروع کرسکتی ہیں؟"

"آپ چاہیں تو اسی وقت سے شروع کردوں"۔

میں بہت خوش ہوا اور میں نے فوراً خط لکھوانا شروع کردیے۔

تھوڑے ہی دن میں میں انھیں محرر نہیں بلکہ اپنی چھوٹی بہن یا بیٹی کی طرح سمجھنے لگا۔ ان کا کام ہر طرح قابل اطمینان تھا۔ اکثر ان کی تحویل میں ہزارہا پونڈ رہتے تھے اور سارا حساب کتاب وہی رکھتی تھیں مجھے ان پر پورا بھروسا ہوگیا اور وہ بھی مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگیں کہ اپنے دلی خیالات اور جذبات مجھ پر ظاہر کردیا کرتی تھیں۔ انھوں نے شوہر کے انتخاب میں بھی مجھ سے مدد لی اور ان کا نکاحی باپ بھی میں ہی بنا۔ جب مس ڈک مسز میکڈانلڈ ہوگئیں تو انھیں میری ملازمت ترک کرنا پڑی۔ لیکن اس کے بعد بھی جب کبھی کام کی کثرت ہوئی اور میں نے ان سے مدد کی درخواست کی انھوں نے میری بات کبھی نہیں ٹالی۔

مگر اب ان کی جگہ ایک مستقل مختصر نویس کی ضرورت تھی اور خوش قسمتی سے مسٹر کیلن باخ جن کا آگے ذکر آئے گا مس شلیزن کو میرے پاس لے آئے۔ آج کل وہ ٹرانسوال کے ایک ہائی اسکول میں معلمہ ہیں جس زمانے میں وہ میرے یہاں آئیں ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔ بعض وقت ان کی سنک سے مجھے اور مسٹر کیلن باخ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ انھیں کام کرنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی تجربہ حاصل کرنے کی۔ رنگ کا تعصب

ان میں بالکل نہیں تھا۔ مگر اُن لوگوں کا جو عمر یا تجربے میں ان سے بڑے تھے بالکل ادب نہیں کرتی تھیں۔ انھیں کسی شخص کی توہین کرنے میں یا اُسے اُس کے منہ پر بُرا بھلا کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ ان کی تنک مزاجی سے مجھے بعض وقت بڑی مشکل پڑ جاتی تھی مگر ان کی صاف دلی اور سادگی کی بدولت فوراً ہی رفع بھی ہو جاتی تھی۔ میں اکثر ان کے لکھے ہوئے خطوں پر بے نظرِ ثانی کئے دستخط کر دیتا تھا۔ مگر ان کی انگریزی مجھ سے اچھی تھی اور ان کی دیانت داری پر مجھے پورا بھروسا تھا۔

انھوں نے بڑے ایثار سے کام لیا۔ عرصے تک وہ صرف چھ پونڈ ماہوار تنخواہ لیتی رہیں اور انہوں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ کبھی دس پونڈ سے زیادہ نہیں لیں گی۔ جب کبھی میں ان کی تنخواہ بڑھانے پر اصرار کرتا تھا وہ مجھے یہ کہکر جھڑک دیتی تھیں "میں یہاں تنخواہ کے لالچ میں کام نہیں کرتی ہوں۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے اور میں آپ کے نصب العین کی قدر کرتی ہوں۔"

ایک بار انھیں مجھ سے چالیس پونڈ لینے کی ضرورت ہوئی مگر انھیں اصرار تھا کہ یہ رقم انھیں قرض کے طور پر دی جائے اور گذشتہ سال انہوں نے یہ روپیہ ادا کر دیا۔ ان کی ہمت بھی ان کے ایثار سے کم نہ تھی۔ وہ ان معدودے چند عورتوں میں سے ہیں، جن کی ملاقات کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں، جن کا دل آئینہ کی طرح صاف ہے، جن کی ہمت پر سورماؤں کو رشک آتا ہے۔ اب وہ سنِ کہولت کو پہنچ گئی ہیں۔ مجھے اب ان کی سیرت کا اتنا اندازہ نہیں جتنا اس زمانے میں تھا مگر ان نوجوان خاتون کی یاد کو میں ہمیشہ تبرک سمجھ کر عزیز رکھوں گا۔ اگر میں ان کے اوصاف بیان کرنے میں کمی کروں تو اظہارِ حق کا حق ادا نہ ہو گا۔

وہ قومی کام کے انجام دینے میں دن رات ایک کر دیتی تھیں۔ جب ضرورت ہو اندھیری راتوں میں بیدھڑک اکیلی باہر چلی جاتی تھیں اور اگر کوئی ساتھ چلنے کو کہے تو

خفا ہوتی تھیں۔ ہزاروں ہندوستانی جواں مردان سے رہنمائی کی توقع رکھتے تھے ستیاگرہ
کے دنوں میں جب قریب قریب سارے لیڈر جیل میں تھے وہ اکیلی اس تحریک کو چلاتی
رہیں۔ ان کے ذمے ہزاروں آدمیوں کی نگرانی، بیشمار خطوں کے جواب دینا اور
"انڈین اوپینین" کو چلانا تھا مگر تھکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

میں مس شلیزن کی پوری تعریف لکھوں تو ایک دفتر ہو جائے مگر میں اُن کے متعلق
گوکھلے کی رائے لکھ کر اس باب کو ختم کرتا ہوں۔ گوکھلے میری ہر رفیق کو جانتے تھے، وہ
اُن میں سے اکثر کو پسند کرتے تھے اور اکثر ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر مس شلیزن کو وہ
میرے سارے ہندوستانی اور فرنگی رفیقوں پر فوقیت دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے
"میں نے مس شلیزن میں جو ایثار، پاکبازی اور ہمت دیکھی ہے آج تک کسی شخص میں
نہیں دیکھی۔ میرے نزدیک تمہارے رفیقوں میں سب سے زیادہ قابلِ قدر وہی ہیں۔"

تیرھواں باب

"انڈین اوپینین"

قبل اس کے کہ میں اور فرنگیوں کے ساتھ کا ذکر کروں مجھے دو تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کر دینا چاہیئے۔ مگر ایک فرنگی دوست کا ذکر فوراً کر دینا ضروری ہے۔ مس ڈک کا تقرر میرے لئے کافی نہیں ہوا۔ مجھے اور مددگاروں کی ضرورت تھی۔ مسٹر رچ کا نام اس کتاب میں پہلے بھی آچکا ہے۔ اِن سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ایک تجارتی کارخانے میں منیجر تھے۔ انھوں نے میرے کہنے سے ملازمت ترک کر دی اور میرے ساتھ کام کرنے لگے۔ ان کی بدولت میرا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو گیا۔

اسی زمانے میں مدن جیت جی نے میرے سامنے ایک اخبار "انڈین اوپینین" کے نام سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ وہ ایک مطبع پہلے سے چلا رہے تھے اس لئے میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں جاری کیا گیا اور منسکھ لال جی نظر پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مگر زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا بلکہ اکثر ادارت کے فرائض بھی میں ہی انجام دیتا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ منسکھ لال جی اخبار کو چلا نہیں سکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں عرصے تک اخبار نویسی کر چکے تھے مگر جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسائل پر وہ میرے ہوتے ہوئے قلم اُٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں میری سوجھ بوجھ پر پورا بھروسا تھا اس لئے مقالۂ افتتاحیہ لکھنے کی ذمہ داری انہوں نے مجھ پر ڈال دی۔ یہ اخبار اُس وقت سے اب تک ہفتہ وار ہے۔ ابتدا میں یہ گجراتی، ہندی، تامل، انگریزی میں نکلتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ تامل اور ہندی کے حصے محض برائے نام

ہیں۔ ان کا جو مقصد تھا وہ پورا نہیں ہوتا تھا اور ان کا باقی رکھنا ایک طرح کا دھوکا تھا۔ اس لئے میں نے انھیں نکال دیا۔

پہلے مجھے یہ خیال تک نہ تھا کہ مجھے اس اخبار میں روپیہ لگانا پڑے گا مگر تھوڑے ہی دن میں یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ میری مالی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ہندوستانی اور فرنگی دونوں جانتے تھے کہ گو "انڈین اوپینین" کی ادارت میں میرا نام نہیں ہے مگر اصل میں اس کے چلانے کی ذمہ داری مجھی پر ہے۔ اگر اخبار جاری نہ ہوا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر جاری ہونے کے بعد بند ہونا بہت برا تھا۔ اس میں ذلّت کی ذلّت تھی اور نقصان کا نقصان۔ اس لئے میں اس میں برابر روپیہ لگاتا رہا یہاں تک کہ آخر میں میرے پاس جو کچھ بچتا تھا سب اسی میں کھپ جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک زمانے میں پچھتر پونڈ ماہوار دیا کرتا تھا۔

مگر آج اتنے دنوں کے بعد بھی میرا یہی خیال ہے کہ اس اخبار نے ہماری برادری کی مفید خدمت انجام دی۔ اس کی حیثیت ابتدا سے تجارتی نہ تھی۔ جب تک یہ میری انتظام میں رہا اس کی حالت میری زندگی کے ساتھ بدلتی رہی۔ جس طرح آج "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" میری زندگی کا آئینہ ہیں ان دنوں "انڈین اوپینین" تھا۔ ہر ہفتے میں اس میں اپنی وارداتِ قلب کی داستان، اپنے دردِ دل کی کہانی کہا کرتا تھا اور ستیاگرہ کے اصول اور عمل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیا کرتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یعنی ۱۹۱۴ء تک بجز اس زمانے کے جو میں نے قید میں گزارا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس میں مضمون نہ لکھا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ ان مضامین میں میں نے ایک لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے لکھا ہو یا کبھی جان بوجھ کر مبالغہ یا خوشامد کی ہو۔ سچ پوچھئے تو یہ اخبار نویسی میرے لئے ضبطِ نفس کی تربیت تھی اور میرے دوستوں کے لئے میرے خیالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ۔ نقادوں کو اس پر اعتراض کا موقع بہت کم ملتا تھا بلکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ

"انڈین اوپنین" کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اگر یہ اخبار نہ ہوتا تو ستیاگرہ کبھی نہ چل سکتی۔ ناظرین اسی سے ستیاگرہ کی تحریک کی بہتر کیفیت اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے صحیح حالات معلوم کرتے تھے۔ میرے لئے یہ انسانی فطرت کی نیرنگیوں کے مطالعے کا ذریعہ تھا کیونکہ مجھے ہمیشہ یہ بات مدنظر رہی تھی کہ ایڈیٹر اور ناظرین میں ایک گہرا اور پاک رابطہ قائم رہے۔ میرے پاس بیشمار خطوط آتے تھے جن میں لوگ اپنے دلی خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا لہجہ لکھنے والوں کی مزاجی کیفیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا کسی کا دوستانہ، کسی کا نقادانہ اور کسی کا شدید مخالفانہ۔ ان خطوط کو پڑھنا، ان کے مضمون پر غور کرنا اور ان کا جواب دینا میرے لئے بہت اچھی تعلیم تھی۔ یہ خط وکتابت گویا ایک ساز تھی جس کے پردوں میں مجھے اپنی برادری کے دل کی حرکت سنائی دیتی تھی۔ اس نے مجھے اخبار نویس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ کر دیا اور برادری میں میرا اثر قائم کر دیا جس کی بدولت آگے چل کر ستیاگرہ کے معرکے میں عملی آسانی، اخلاقی شان اور بے پناہ قوت پیدا ہو گئی۔

"انڈین اوپنین" کے جاری ہونے کے بعد پہلے ہی مہینے میں مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اخبار نویسی کا مقصد محض خدمت خلق ہے۔ اخبار بہت بڑی قوت ہے مگر جس طرح پانی کے بے قید سیلاب میں علاقے کے علاقے ڈوب جاتے ہیں اور فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اسی طرح اخبار نویس کے بے روک قلم سے سوائے تخریب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ روک تھام اگر کسی بیرونی قوت کی طرف سے ہو تو مطلق العنانی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو دنیا میں کونسا اخبار اس معیار پر پورا اُترے گا؟ لیکن کسے پڑی ہے کہ بیکار اخباروں کو روکے؟ اور پھر اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟ دنیا میں نیکی اور بدی کی طرح مفید اور غیر مفید چیزیں ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں اور اسی طرح چلی جائینگی۔ ہر انسان کو خود ہی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کسے لے اور کسے چھوڑے۔

چودھواں باب

قلیوں کے باڑے یا "گھیٹو"

بعض ذاتوں کو جو سب سے بڑھ کر ہماری سماجی خدمت کرتی ہیں ہم ہندوؤں نے نجانے کیوں "اچھوت" قرار دے رکھا ہے یہ لوگ شہر یا گاؤں کے بیرونی محلوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ گجراتی میں یہ محلّے "دھیدھاودو" کہلاتے ہیں اور اس نام میں حقارت کی بو آتی ہے۔ مسیحی فرنگستان میں بھی ایک زمانے میں یہودی "اچھوت" سمجھے جاتے تھے اور ان کے لیے جو محلّے مخصوص تھے انھیں لوگ حقارت سے "گھیٹو" کہتے تھے۔ اسی طرح آج ہم لوگوں کی حیثیت بھی جنوبی افریقہ میں اچھوتوں کی سی ہوگئی ہے۔ دیکھیں اینڈریوز کا ایثار اور شاستری کا جادو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی عزت واپس دلانے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے؟

قدیم زمانے میں یہودی اپنے آپ کو دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں خدا کے برگزیدہ بندے سمجھتے تھے جس کی پاداش میں انھیں یہ انوکھی اور حد سے زیادہ سخت سزا بھگتنا پڑی۔ قریب قریب اسی طرح ہندو اپنے آپ کو "آریا" یعنی مہذب اور اپنے بعض بھائی بندوں کو "اناریا" یعنی غیر مہذب سمجھتے ہیں جس کی انوکھی اور شدید مکافات میں جنوبی افریقہ میں وہ خود بھی مبتلا ہیں اور مسلمان اور پارسی بھی محض اُن کے ہم وطن اور ہم رنگ ہونے کے جرم میں لپیٹ میں آگئے ہیں۔

اب ناظرین "باڑے" کے لفظ کو سمجھ گئے ہوں گے جو اس باب کے عنوان میں آیا ہے۔ ہم لوگ جنوبی افریقہ میں حقارت سے "قلی" کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں "قلی" کے معنی محض حمال یا مزدور کے ہیں مگر جنوبی افریقہ میں یہ حقارت کا کلمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا

مفہوم وہی ہے جو ہمارے یہاں "اچھوت" کا ہے اور وہ محلے جو قلیوں کے لئے مخصوص ہیں "قلی باڑے" کہلاتے ہیں۔ جوہانسبرگ میں بھی ایک اس طرح کا محلہ تھا۔ دوسرے مقامات پر تو ہندوستانی ان محلوں میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے مگر یہاں انہوں نے ننانوے برس کا پٹہ حاصل کر لیا تھا۔ اس محلے میں آبادی بڑھتی جاتی تھی مگر رقبہ نہیں بڑھتا تھا اور تھوڑی جگہ میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ میونسپلٹی نے پاخانوں کی صفائی کا تو کچھ برائے نام انتظام کر دیا تھا مگر حفظانِ صحت کی اور تدبیروں سے بالکل غافل تھی سڑکوں اور روشنی کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے؟ جب اسے محلہ والوں کی فلاح وبہبود کی پروا نہ تھی تو محلے کی صفائی کیوں کرتی؟ جو ہندوستانی یہاں رہتے تھے وہ بیچارے عام صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے ناواقف تھے اس لئے بغیر میونسپلٹی کی نگرانی اور مدد کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر یہ سب رابنسن کروسو ہوتے تو اور بات تھی۔ مگر دنیا میں کہیں بھی وہ لوگ جو اپنا وطن چھوڑ کر نوآبادیاں بساتے ہیں رابنسن کروسو نہیں ہوتے۔ عموماً لوگ دولت اور کاروبار کی تلاش میں پردیس جاتے ہیں اور جنوبی افریقہ جانے والے ہندوستانیوں میں سے اکثر جاہل اور مفلس کاشتکار تھے جنھیں دوسروں کی خبرگیری اور امداد کی ضرورت تھی۔ ان کے بعد تاجر اور تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی آگئے تھے مگر بہت کم۔

ایک طرف میونسپلٹی کی مجرمانہ غفلت اور دوسری طرف نوآباد ہندوستانیوں کی جہالت سے یہ محلہ بے حد گندا ہو گیا تھا۔ میونسپلٹی نے محلہ کی حالت سدھارنے کے بجائے اس گندگی کو جو خود اس کی غفلت کا نتیجہ تھی، حیلہ بنا کر اس محلے کو اجاڑنے کی فکر کی اور مجلسِ وضع قوانین سے نوآباد ہندوستانیوں کو بیدخل کرنے کی اجازت لے لی۔ یہ صورت حال تھی جب میں نے جوہانسبرگ میں بود وباش اختیار کی۔

ظاہر ہے کہ اس محلے کے رہنے والوں کو اپنی زمین پر ملکیت کا حق تھا اس لئے وہ ہرجانے کے مستحق تھے۔ انتقالِ اراضی کے مقدموں کی سماعت کے لئے ایک خاص عدالت

قائم کی گئی۔ اگر مکان دار کو میونسپلٹی کی پیش کی ہوئی شرطیں منظور نہ ہوں تو اسے یہ حق تھا کہ اس عدالت میں اپیل کرے اور اگر عدالت میونسپلٹی کی مقرر کی ہوئی رقم سے زیادہ کی ڈگری دے تو مقدمے کا خرچہ میونسپلٹی کو دینا پڑتا تھا۔

اکثر مکانداروں نے مجھے وکیل کیا۔ مجھے ان مقدموں سے روپیہ کمانا منظور نہ تھا، اس لیئے میں نے اُن لوگوں سے کہا کہ میں ہر مقدمے میں صرف دس پونڈ لوں گا اور جتنے مقدمے کامیاب ہوں گے اُن میں عدالت سے جو خرچہ ملے گا وہ میرا ہوگا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنے محنتانے کی آدھی رقم سے میں غریبوں کے لیئے ایک ہسپتال یا اسی قسم کا کوئی اور ادارہ بنوا دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز سے سب کو خوشی ہوئی۔

ستر مقدموں میں سے صرف ایک میں ناکامیابی ہوئی۔ میری یہ فیس کی اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ مگر "انڈین اوپینین" کو ہمیشہ روپے کی ضرورت رہتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سولہ سو پونڈ اسی کی نذر ہوگئے۔ مجھے ان مقدموں میں سخت محنت کرنا پڑی۔ موکل مجھے ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر بہار اور اُس کے قرب وجوار کے ضلعوں کے یا جنوبی ہندوستان کے رہنے والے تھے اور ابتدا میں پابند مزدوروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی شکایتوں کی چارہ جوئی کے لیئے ہندوستانی تاجروں کی انجمن سے الگ ایک جماعت قائم کی تھی۔ ان میں سے بعض صاف دل، فیاض اور عالی منش لوگ تھے۔ ان کے رہنما دو شخص تھے۔ جیرام سنگھ جی صدر تھے اور بدری جی ان کے دست راست۔ ان دونوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ بدری جی کا اور میرا ابہت ساتھ رہا اور اُنھوں نے ستیا گرہ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان دونوں صاحبوں اور بعض اور دوستوں کے توسط سے مجھ سے شمالی اور جنوبی ہندوستان کے بہت سے لوگوں سے میل جول ہوگیا۔ میں ان کا وکیل ہی نہیں بلکہ ان کا بھائی بھی بن گیا اور ہمیشہ ان کے دکھ درد میں، چاہے وہ ذاتی ہو یا ساری برادری سے تعلق رکھتا ہو برابر شریک رہا۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی مجھے کیا کہکر پکارتے تھے۔ عبداللہ سیٹھ میرا نام لینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے۔ یہ بڑی خیر ہوئی کہ کسی نے مجھے کبھی "صاحب" کہہ کر ذلیل نہیں کیا۔ عبداللہ سیٹھ نے ایک بڑا پیارا لقب ڈھونڈھ نکالا۔ وہ مجھے بھائی کہنے لگے۔ دوسرے بھی ان کی تقلید میں مجھے ہمیشہ بھائی کہتے رہے۔ مگر ان لوگوں کی زبان سے جو کبھی پابند مزدور رہ چکے تھے مجھے بھائی کا لفظ اور بھی پیارا معلوم ہوتا تھا۔

———— (۰) ————

پندرھواں باب

کالا طاعون (۱)

میونسپلٹی "قلی باڑے" کے مکانوں پر قبضہ پانے کے بعد ان کے مکینوں کو فوراً نہیں ہٹاتی تھی۔ ان کو بیدخل کرنے سے پہلے ان کے لئے دوسرے مناسب گھر ڈھونڈھنا تھے۔ اس میں میونسپلٹی کو بڑی دقت پیش آئی اس لئے ہندوستانیوں کو اسی گندے محلہ میں رہنے دیا۔ اگر فرق ہوا تو یہ ہوا کہ اُن کی حالت اور بدتر ہوگئی۔ پہلے وہ مکانوں کے مالک تھے اب میونسپلٹی کے کرائے دار بن گئے اور ان کے گرد وپیش گندگی اور بڑھ گئی۔ جب وہ مالک تھے تو انھیں اور کچھ نہیں تو قانون کے خوف سے تھوڑی بہت صفائی رکھنا پڑتی تھی۔ مگر میونسپلٹی کو قانون کا کوئی خوف نہیں تھا! کرایہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اسی کے ساتھ غلاظت بھی بڑھتی گئی۔

اِدھر ہندوستانی اس مصیبت کو رو رہے تھے اُدھر کالا طاعون پھوٹ پڑا۔ یہ نمونیا[ل] کا طاعون بھی کہلاتا ہے اور گلٹی کے طاعون سے کہیں زیادہ مہلک ہے۔

یہ بڑی خیر ہوئی کہ وبا ہندوستانیوں کے محلہ میں نہیں بلکہ شہر کے باہر ایک سونے کی کان میں شروع ہوئی۔ یہاں زیادہ تر حبشی کام کرتے تھے جن کی صفائی کے ذمہ دار اُن کے فرنگی آقا تھے۔ بعض ہندوستانی مزدور بھی تھے جنھیں تیئیس پر وبا کا اثر ہوگیا اور ایک روز شام کو یہ لوگ اپنے محلے میں آتے ہی شدید طاعون میں مبتلا ہوگئے۔ اتفاق سے مدن جیت جی جو اس زمانے میں "انڈین اوپینین" کے خریدار بنا رہے تھے اور چندہ جمع کر رہے تھے وہاں موجود تھے۔ وہ بڑے جری آدمی تھے۔ ان وبازدوں کو

ل پھیپھڑے کا ورم۔

دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور انھوں نے مجھے ایک رقعہ پنسل سے لکھ کر بھیجا جس کا یہ مضمون تھا "کالا طاعون ایک دم سے پھوٹ پڑا ہے۔ آپ کو فوراً آ کر اس کا تدارک کرنا چاہیئے ورنہ یہ سمجھ لیجیے کہ اس کا انجام بڑا مہلک ہے۔ خدا کے لیئے جلد آیئے۔"

مدن جیت جی نے دلیری سے ایک خالی گھر کا قفل توڑ ڈالا اور سب مریضوں کو اس میں رکھا۔ میں بائسکل پر بیٹھ کر ہندوستانیوں کے محلے میں گیا اور میں نے میونسپلٹی کے ہیڈ کلرک کو لکھ دیا کہ ایسی ایسی حالت تھی اس لیئے ہم نے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔

ڈاکٹر ولیم گاڈفرے جو جوہانسبرگ میں مطب کرتے تھے، یہ خبر سنتے ہی مدد کے لیئے دوڑے آئے اور مریضوں کا علاج اور تیمارداری کرنے لگے۔ لیکن تیئیس مریض ہم تین آدمیوں سے نہیں سنبھل سکتے تھے۔

میرا یہ عقیدہ ہے اور تجربہ پر مبنی ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو اس کا چارہ اور چارہ گر خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں میرے دفتر میں چار ہندوستانی تھے، کلیان داس جی، مانک لال جی، گنونت رائے جی دیسائی اور ایک اور شخص جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ کلیان داس کو ان کے والد نے میرے سپرد کیا تھا۔ مجھے جنوبی افریقہ میں کوئی شخص ان سے زیادہ بامروت اور دل و جان سے اطاعت کرنے والا نہیں ملا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور میں ان سے بے تامل بڑے خطرے کے کام لے سکتا تھا۔ مانک لال مجھے جوہانسبرگ میں ملے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیئے میں نے دل میں ٹھان لی کہ ان چاروں کو جو میرے محرر، رفیق، بیٹے سبھی کچھ تھے، قربان کر دوں۔ کلیان داس سے تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسرے بھی کہنے کے ساتھ ہی آمادہ ہو گئے۔ ان کا چھوٹا سا پیارا جواب یہ تھا "جہاں آپ رہیں گے ہم بھی رہیں گے۔"

مسٹر رچ کا بہت بڑا خاندان تھا۔ وہ طیار رہتے تھے کہ اس آگ میں کود پڑیں مگر میں نے

انھیں روک دیا۔ انھیں اس ہلاکت میں گھسیٹتے ہوئے میرا دل دُکھتا تھا۔ اس لئے ان کے سپرد وہ کام کیا گیا جس میں خطرہ نہیں تھا۔

وہ شب بیداری اور تیمارداری کی رات بڑی قیامت کی رات تھی۔ تیمارداری میں پہلے بہت کر چکا تھا مگر کالے طاعون کے مریضوں کی کبھی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر گاڈفرے کی ہمت سے ہم سب کو بڑی تقویت ہوئی۔ تیمارداری میں کچھ ایسی زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ ہمارا کام بس اتنا تھا کہ مریضوں کو دوا پلا دیا کریں، ان کی خبرگیری کرتے رہیں، ان کے بستر صاف ستھرے رکھیں اور انہیں ملول نہ ہونے دیں۔

جس جوش اور دلیری سے نوجوان کام کرتے تھے اُسے دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر گاڈفرے یا مدن جیت جی کے سے پُرانے سپاہی کا ایسی جرأت دکھانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی مگر ناکردہ کار نوجوانوں کے جوش کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے سب مریضوں کی وہ رات بخیر و خوبی گذر گئی۔

مگر یہ واقعہ اتنا پُراثر اور دلچسپ ہے اور میرے لئے اتنی مذہبی اہمیت رکھتا ہے کہ مجھے کم سے کم دو باب اور اس کے لئے وقف کرنا پڑیں گے۔

(۰)

سولھواں باب

کالا طاعون - (۲)

میونسپلٹی کے ہیڈ کلرک نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے خالی مکان پر قبضہ کر لیا اور مریضوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس نے صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا کہ میونسپلٹی خود اس ناگہانی حادثے کا فوری تدارک کرنے سے معذور رہی مگر یہ وعدہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہے وہ ہم لوگوں کی مدد کرے گی۔ اُسے ایک بار اُس کے فرض کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت تھی پھر اُس نے مستعدی سے کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن اُس نے ایک خالی گودام میرے حوالے کر دیا اور مجھے یہ رائے دی کہ مریضوں کو وہاں منتقل کر دوں۔ لیکن اس مکان کی صفائی کا میونسپلٹی نے کوئی انتظام نہیں کیا۔ سارے مکان میں کوڑے کرکٹ کے انبار تھے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دی اور مخیر ہندوستانیوں کی امداد سے پلنگ، بستر اور دوسری چیزیں مہیا کر کے ایک عارضی ہسپتال بنا لیا۔ میونسپلٹی نے ایک نرس بھیجدی جو اپنے ساتھ برانڈی اور دوسری چیزیں جن کی ہسپتال میں ضرورت پڑتی ہے لیتی آئی۔ نگرانی بدستور ڈاکٹر گاڈفرے کی رہی۔

نرس بڑی نیک دل عورت تھی۔ اسے مریضوں کی خدمت کا سچا شوق تھا مگر ہم اس ڈرسے کہ کہیں اُسے چھوت نہ لگ جائے، اسے حتی الامکان مریضوں کے قریب نہیں جانے دیتے تھے۔

ہمیں یہ ہدایت تھی کہ مریضوں کو برانڈی بار بار دیتے رہیں بلکہ نرس نے تو کہا کہ تم لوگ بھی حفظ ماتقدم کے لئے میری طرح برانڈی پی لیا کرو۔ مگر ہم لوگ اسے ہاتھ تک

نہ لگاتے تھے۔ مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ یہ مریضوں کے لئے مفید ہے۔ میں نے ڈاکٹر گاڈفرے کی اجازت سے تین مریضوں پر جو برانڈی سے بچنا چاہتے تھے، مٹی کے علاج کا تجربہ کیا اور ان کے سر اور سینے پر گیلی پٹیاں باندھیں۔ ان میں سے دو بچ گئے۔ باقی بیس گودام ہی میں مر گئے۔

اس عرصے میں میونسپلٹی دوسری تدبیریں کر رہی تھی۔ جوہانسبرگ سے سات میل کے فاصلہ پر لگ جانے والی بیماری کا ہسپتال تھا۔ دو مریض جو بچ رہے تھے اس ہسپتال کے قریب ایک خیمے میں رکھے گئے اور نئے بیماروں کو وہاں پہونچانے کا انتظام کر دیا۔ اس طرح ہمیں اس کام سے چھٹی مل گئی۔

چند روز بعد سنا کہ نیک دل نرس طاعون میں مبتلا ہو کر جھٹ پٹ مر گئی۔ اب خدا جانے وہ دو مریض کیسے بچ گئے اور ہم کیوں کر محفوظ رہے۔ مگر اس تجربے سے میں مٹی کے علاج کا اور بھی قائل ہو گیا اور برانڈی کے طبی فوائد کی طرف سے میری بدعقیدگی اور بڑھ گئی۔ میں جانتا ہوں نہ یہ عقیدہ معقول وجوہ پر مبنی ہے اور نہ یہ بدعقیدگی مگر میرے دل پر اس وقت یہی اثر پڑا اور اب تک ہے۔ میں اسے کسی طرح مٹا نہیں سکتا۔ اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کا ذکر کر دوں۔

جب طاعون شروع ہوا ہے تو میں نے اخباروں میں ایک خط چھپوایا تھا جس میں میونسپلٹی کو اس محلّے کے زمیندار کی حیثیت سے غفلت کا ملزم بلکہ طاعون کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس خط کی بدولت مسٹر ہنری پولک میرے رفیق بن گئے۔ پادری جوزف ڈوک آنجہانی سے میری دوستی کی بنا بھی ایک حد تک یہی تھی۔

میں اوپر کے کسی باب میں کہہ چکا ہوں کہ میں نباتاتی رستوران میں کھایا کرتا تھا۔ یہاں مسٹر البرٹ ویسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ روز شام کو رستوران میں ملتے تھے اور کھانے کے بعد میرے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے مطبع میں حصہ دار تھے انہوں

نے اخبار میں میرا خط وبا پھوٹنے کے متعلق پڑھا اور میری تلاش میں رستوران پہنچے میں وہاں نہیں ملا تو انھیں کچھ تردد سا پیدا ہو گیا۔

میں نے اور میرے ساتھیوں نے وبا پھوٹنے کے بعد سے اپنی غذا میں کمی کر دی تھی۔ میرا عرصے سے یہ دستور تھا کہ وبا کے زمانے میں بہت ہلکی غذا استعمال کرتا تھا۔ اسلئے میں نے اس زمانے میں شام کا کھانا ترک کر دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں دوسرے مہمانوں کے آنے سے پہلے کھا لیا کرتا تھا۔ رستوران کے مالک سے میرے مراسم تھے اور میں نے اس سے کہدیا تھا کہ میں طاعون کے مریضوں کی تیمارداری کر رہا ہوں اس لئے جہانتک ہو سکے میں اپنے دوستوں سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔

مسٹر ویسٹ نے مجھے دو تین دن رستوران میں نہیں پایا تو ایک دن صبح تڑکے جب میں ٹہلنے کے لئے جانے کا قصد کر رہا تھا انھوں نے میرے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو مسٹر ویسٹ کہنے لگے "آپ رستوران میں نہیں ملے تو میں گھبرایا کہ کوئی حادثہ نہ گزرا ہو۔ اس لئے میں نے کہا کہ صبح تڑکے چل کر دیکھوں تاکہ آپ کے ملنے میں شبہ نہ رہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں مریضوں کی تیمارداری کے لئے تیار ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اکیلا آدمی ہوں، نہ بیوی بچے ہیں نہ اور کوئی عزیز جس کی مجھے فکر کرنا ہو۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا "تیمارداری کے لئے آپ کی ضرورت نہیں۔ اگر نئے کیس نہ ہوئے تو ہم لوگ خود دو ایک روز میں فارغ ہو جائیں گے۔ البتہ ایک کام ہے۔"

"کہیے کہیے، کیا کام ہے؟"

"کیا آپ ڈربن جا کر "انڈین اوپینین" کی نگرانی کر سکتے ہیں؟ مدن جیت جی کو غالباً ابھی یہاں رہنا پڑے گا اس لئے ڈربن میں ایک شخص کی ضرورت ہے۔ اگر آپ جا سکیں تو مجھے اُدھر سے پورا اطمینان ہو جائے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرا ایمان مطیع ہے۔ غالباً میں جا سکتا ہوں مگر قطعی جواب شام کو دوں گا۔ شام کو جب ٹہلنے چلیں گے تو اس کے متعلق گفتگو ہوگی۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ شام کو باتیں ہوئیں اور وہ جانے پر راضی ہو گئے۔ تنخواہ کی انھیں کوئی پروانہ تھی کیونکہ ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں تھا۔ پھر بھی یہ طے ہوا کہ دس پونڈ ماہوار ان کی تنخواہ ہو اور اگر کچھ نفع ہو تو اس کا ایک حصہ دیا جائے۔ دوسرے ہی دن شام کی ڈاک سے مسٹر ویسٹ روانہ ہو گئے۔ ان کا کچھ روپیہ لوگوں پر باقی تھا جس کی وصولی وہ میرے سپرد کر گئے۔ اس دن سے لے کر جب تک میں جنوبی افریقہ میں رہا وہ میرے دکھ درد کے شریک رہے۔

مسٹر ویسٹ لوتھ (لنکن شائر) کے کسانوں کے خاندان سے تھے۔ انہوں نے اسکول کی معمولی تعلیم پائی تھی مگر تجربے کے مکتب میں اپنے بل پر بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں نے اتنے دن کے ساتھ میں دیکھا کہ وہ ایک پاکباز، پرہیزگار، خدا پرست، رحمدل انگریز ہیں۔

ان کے اور ان کے خاندان کے مزید حالات آگے چل کر معلوم ہوں گے۔

سترھواں باب

ہندوستانی محلّے میں آگ لگ گئی

مجھے اور میرے رفیقوں کو مریضوں کی تیمارداری سے تو چھٹی مل گئی مگر کالے طاعون کے سبب سے اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کا تدارک باقی تھا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میونسپلٹی ہندوستانی محلّے یا "قلی باڑے" کی طرف سے بالکل بے پروا تھی۔ مگر شہر کے فرنگی باشندوں کی صحت کی اُسے بڑی فکر تھی۔ اُن کی صحت کی خاطر اس نے بہت کچھ صرف کیا تھا اور اب طاعون کو دور کرنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ گو میں نے ہندوستانیوں کے بارے میں میونسپلٹی کو فعل اور ترکِ فعل کے بہت سے گناہوں کا مرتکب ٹھہرایا تھا مگر فرنگی باشندوں کے ساتھ اس کی یہ خیر خواہی دیکھ کر میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا اور مجھ سے اس کارِ خیر میں جو کچھ مدد ممکن تھی دیتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں ساتھ نہ دیتا تو میونسپلٹی کو بڑی دقت پیش آتی۔ اُسے مسلح قوت سے کام لینا پڑتا اور وہ ہر طرح کی سختی بلا تامّل کر بھی گذرتی۔

مگر ان باتوں کی ضرورت نہیں پڑی اور اس کا دامن اس دھبے سے پاک رہا۔

میونسپل حکام ہندوستانیوں کے طرزِ عمل سے بہت خوش ہوئے اور آیندہ کے لئے طاعون کے دفیعے کی تدابیر اختیار کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ میں نے ہندوستانیوں سے میونسپلٹی کی ہدایات پر عمل کرانے میں اپنے پورے اثر سے کام لیا۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ بکھیڑے کرنا سہل نہ تھا مگر جہاں تک مجھے یاد ہے کسی نے میرے مشورے کو قبول کرنے میں تامّل نہیں کیا۔

محلّے کی نگرانی کے لئے پولیس کا ایک بڑا دستہ تعینات کیا گیا۔ بغیر اجازت کے کوئی

شخص آنے جانے نہیں پاتا تھا۔ مجھے اور میرے رفیقوں کو داخلے اور واپسی کے پاس مل گئے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ سارے محلے والوں سے مکان خالی کرائے جائیں اور وہ تین ہفتے تک جوہانسبرگ سے تیرہ میل کے فاصلے پر کھلے میدان میں خیموں میں رکھے جائیں۔ ظاہر ہے کہ کھانے پینے کا سامان اور دوسری ضروریات فراہم کر کے خیموں میں بسنا ذرا دیر طلب کام تھا۔ اسی لئے اس اثنا میں پولس کے پہرے کی ضرورت پڑی۔

لوگ بہت ڈرے ہوئے تھے مگر میری ہر وقت کی موجودگی سے انھیں تسکین رہتی تھی۔ بہت سے غریب لوگوں نے اپنی چھوٹی سی پونجی کو زمین میں گاڑ رکھا تھا۔ یہ روپیہ نکالکر کہیں رکھوانا تھا۔ نہ ان کا کوئی بینک تھا اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتے تھے جسے اپنا روپیہ سپرد کر سکیں اس لئے میں اُن کا خزانچی بن گیا۔ میرے دفتر میں روپیے کے ڈھیر لگ گئے۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ میں ایسے وقت میں ان سے اس کا کوئی معاوضہ لیتا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اس کام کو بھی سمیٹا۔ میرے بینک کا منیجر میرا دوست تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ روپیہ تمہارے یہاں امانت رکھوانا ہے۔ تانبے اور چاندی کے اتنے سکے لینے پر کوئی بینک راضی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ خوف تھا کہ بینک کے محرر طاعون زدہ محلّے سے آئے ہوئے روپیے کو ہاتھ لگانے سے انکار نہ کر دیں۔ مگر منیجر کو میری خاطر ہر طرح منظور تھی۔ یہ طے کیا گیا کہ روپیہ بینک میں بھیجنے سے پہلے جراثیم سے پاک کر لیا جائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی ساٹھ ہزار پونڈ روپیہ اس طرح جمع کیا گیا۔ جن لوگوں کے پاس کافی روپیہ تھا اُنھیں میں نے یہ مشورہ دیا کہ میعادی* تحویل میں رکھوا دیں اور وہ اس پر راضی ہو گئے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سے بعض کو بینک میں روپیہ رکھوانے کی عادت پڑ گئی۔

---

* fixed deposit

محلے کے سب باشندے اسپیشل ٹرین سے جوہانسبرگ کے قریب کلپ اسپروٹ فارم میں پہونچا دئے گئے اور ان کے لئے میونسپلٹی کی طرف سے کھانے پینے کا سامان مہیا کردیا گیا۔ یہ خیموں کا شہر ایک فوجی پڑاؤ سا معلوم ہوتا تھا۔ جو لوگ اس طرح کی زندگی کے عادی نہیں تھے اُن کے لئے یہاں کے انتظامات تعجب انگیز اور تکلیف دہ تھے مگر اصل میں انھیں کوئی خاص تکلیف نہیں تھی۔ میں روزانہ بائسکل پر بیٹھ کر وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر یہی دیکھتا تھا کہ لوگ گلے نے بجائے ہنسنے کھیلنے میں مگن ہیں۔ تین ہفتے کھلی ہوا میں رہنے سے ان کی صحت کو بڑا فائدہ ہوا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے محلہ جس دن خالی ہوا اُس کے دوسرے ہی دن وہاں آگ لگ گئی۔ میونسپلٹی نے کسی چیز کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ انھیں دنوں میونسپلٹی نے اپنی ساری عمارتی لکڑی میں جو بازار میں پڑی تھی خود آگ لگا دی اور دس ہزار پونڈ نقصان برداشت کیا۔ اس حرکتِ مذبوحی کا سبب یہ تھا کہ بازار میں چند مردہ چوہے پائے گئے تھے۔

میونسپلٹی کو بہت روپیہ صرف کرنا پڑا مگر اس نے طاعون کو آگے پھیلنے نہیں دیا اور خدا خدا کرکے شہر کے لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا۔

اٹھارھواں باب

ایک کتاب کا جادو

کالے طاعون کے سبب سے میرا اثر غریب طبقے کے ہندوستانیوں میں بڑھ گیا، میری وکالت خوب چمکی اور میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ بعض فرنگی حضرات سے بڑے گہرے تعلقات ہو گئے اور مجھ پر نئی اخلاقی پابندیاں عائد ہو گئیں۔

مسٹر پولک سے بھی نباتاتی ریستوران میں ملاقات ہوئی جیسے مسٹر ویسٹ سے ہوئی تھی۔ ایک دن میں اس ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک نوجوان نے جو قریب کی میز پر بیٹھے تھے اپنا کارڈ میرے پاس بھیجا جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں اپنی میز پر بلا لیا۔ انھوں نے کہا "میں "کریٹک"[1] کا سب ایڈیٹر ہوں۔ میں نے اخباروں میں آپ کا خط طاعون کے متعلق پڑھا تو بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملوں۔ شکر ہے کہ موقع مل گیا۔"

مسٹر پولک کی اس بے تکلفی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میرا دل ان کی طرف کھنچنے لگا۔ ایک ہی روز میں ہم دونوں میں اچھی خاصی ملاقات ہو گئی اور یہ معلوم ہوا کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ہم دونوں کی رائے بہت ملتی جلتی ہے۔ انھیں سادہ زندگی پسند تھی۔ ان میں یہ عجیب ملکہ تھا کہ جس بات سے ان کا ذہن متاثر ہوتا تھا اسے فوراً عملی صورت میں لے آتے تھے۔ بعض تبدیلیاں جو انھوں نے اپنی زندگی میں کیں فوری بھی تھیں اور قطعی بھی۔

---

[1] Critic (نقاد)۔ اخبار کا نام ہے۔

"انڈین اوپنین" کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ مسٹر ویسٹ کی پہلی ہی رپورٹ بڑی پریشان کن تھی۔ انہوں نے لکھا "آپ کو توی اُمید تھی کہ اس کام میں منافع ہو گا مگر میرے خیال میں اس کی کوئی توقع نہیں۔ بلکہ مجھے تو خسارے کا خوف ہے۔ حساب کتاب باقاعدہ نہیں ہے۔ لوگوں پر بہت سا روپیہ باقی ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت کچھ کانٹ چھانٹ کر کے نئے سرے سے انتظام کرنا پڑے گا۔ مگر آپ گھبرائیے نہیں۔ میں اپنے امکان بھر اصلاح کی پوری کوشش کروں گا۔ چاہے منافع ہو یا نہ ہو میں ہٹنے والا نہیں"۔ ایسی صورت میں کہ فائدے کی کوئی امید نہ تھی مسٹر ویسٹ چاہتے تو علیحدہ ہو جاتے مجھے شکایت کا کوئی حق نہ ہوتا۔ بلکہ وہ اُلٹا مجھے الزام دے سکتے تھے کہ تم نے بغیر کافی ثبوت کے یہ کہہ دیا کہ یہ نفع کا کام ہے۔ مگر انہوں نے ذرا بھی شکایت نہیں کی۔ البتہ مجھے یہ خیال ہے کہ اس واقعے سے مسٹر ویسٹ مجھے زود اعتقاد سمجھنے لگے۔ اور ہے بھی یہی کہ میں نے مدن جیت جی کے تخمینے کو بغیر جانچ پڑتال کئے صحیح مان لیا اور مسٹر ویسٹ سے کہہ دیا کہ منافعے کی اُمید ہے۔

اب مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا ہے کہ قومی خدمت کرنے والے کو کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے جس کی اُس نے اچھی طرح تحقیق نہ کر لی ہو۔ خصوصاً حق کے پرستار کو اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی دوسرے کو ایسی بات کا یقین دلانا جس پر خود پورا وثوق نہ ہو حق کا منہ چڑانا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف ہے کہ باوجود اس علم کے میری زود اعتقادی کی عادت اب تک نہیں گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ذمے اتنا کام لے لینے کا شوق ہے جو مجھ سے سنبھل نہیں سکتا۔ میرے اس شوق کی بدولت مجھ سے زیادہ میرے رفیقوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

مسٹر ویسٹ کا خط آتے ہی میں نٹال روانہ ہو گیا۔ میں نے مسٹر پولک سے سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔ وہ مجھے پہونچانے اسٹیشن آئے۔ انہوں نے مجھے ایک کتاب

رستے میں پڑھنے کے لئے دی اور کہا کہ یہ تمہیں یقیناً پسند آئیگی۔ یہ رسکن کی Unto this last تھی۔
یہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ جب اسے پڑھنا شروع کیا تو بے ختم کئے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔
اس نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ جوہانسبرگ سے ڈربن تک چوبیس گھنٹے کا سفر تھا۔ گاڑی
شام کے وقت ڈربن پہنچی۔ وہ ساری رات مجھے جاگتے گذری۔ میں نے دل میں ٹھان
لی کہ اس کتاب کے نصب العین کے مطابق اپنی زندگی بدل دوں گا۔

اس سے پہلے رسکن کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری تھی۔ طالب علمی کے
زمانے میں میں نے درسی کتابوں کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اور دنیا کے دھندے
میں لگ جانے کے بعد مجھے مطالعے کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس لئے میرا کتابی
علم بہت محدود ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مطالعے کا محدود ہونا میرے حق میں بُرا نہیں ہوا۔
بلکہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے جو کچھ پڑھا وہ دماغ میں اچھی طرح رچ بچ گیا۔
ان میں سے Unto this last ایسی کتاب تھی جس کی بدولت میری زندگی میں فوری
اور عملی تغیر ہو گیا۔ بعد میں میں نے اس کا ترجمہ گجراتی میں "سرودیا" (رفاہ عام) کے
نام سے کیا۔

مجھے رسکن کی اس جید کتاب میں اپنے بعض گہرے عقیدوں کی جھلک نظر آئی۔
اسی لئے اس نے میرے دل کو موہ لیا اور میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ شاعر
وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگا دے۔ شاعروں کے کلام کا اثر
سب پر یکساں نہیں ہوتا کیونکہ جوہر قابل کسی شخص میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ۔

میرے نزدیک Unto this last کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے:

۱۔ ہر فرد کا بھلا اسی میں ہے جس میں سب کا بھلا ہو۔

۲۔ ایک حجام کے کام کی قدر و قیمت وہی ہے جو ایک وکیل کے کام کی ہے کیونکہ
ہر شخص کو حق ہے کہ جس طرح چاہے روزی کمائے۔

۳۔ سب سے اچھی اور پر لطف زندگی مزدور کی یعنی کسان اور کاریگر کی زندگی ہے۔

پہلی بات میں پہلے سے جانتا تھا۔ دوسری کا بھی کچھ خفیف سا احساس تھا۔ مگر تیسری کا کبھی خیال تک نہیں آیا تھا۔ Unto this last کے مطالعے سے مجھ پر یہ روشن ہو گیا کہ پہلی بات میں دوسری اور تیسری بھی شامل ہے۔ اُدھر تڑکا ہوا اِدھر میں دل میں یہ ٹھان کر اُٹھ بیٹھا کہ ان اصولوں پر عمل کروں گا۔

انیسواں باب

فینکس کی بستی

میں نے سارا ماجرا مسٹر وِسٹ سے بیان کیا کہ unto this last کے مطالعے کا مجھ پر یہ اثر ہوا ہے اور میری تجویز ہے کہ "انڈین اوپینین" کا دفتر ایک زراعتی فارم میں رکھا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا اور خالی وقت میں مطبع کا کام کرے اور سب کو مساوی اُجرت دی جائے جو پیٹ کی روٹی اور تن کے کپڑے کو کافی ہو۔ مسٹر وِسٹ نے اس تجویز کو پسند کیا اور یہ قرار پایا کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کا ہو تین پونڈ ماہوار اجرت دی جائے۔

مگر یہ بڑا مشکل سوال تھا کہ دس بارہ آدمی جو مطبع میں کام کرتے ہیں سب کے سب ایک دور افتادہ فارم میں جا کر بسنے اور اتنی کم اُجرت لینے پر راضی بھی ہونگے یا نہیں اسلئے ہم نے یہ طے کیا کہ جو لوگ اس تجویز پر عمل نہ کر سکتے ہوں وہ موجودہ تنخواہ پر کام کرتے رہیں اور آہستہ آہستہ اس بستی کے نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

میں نے سب رفیقوں سے اس کے متعلق گفتگو کی۔ مدن جیت جی کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ محض حماقت ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کام جس کی خاطر انہوں نے سب کچھ تج دیا تھا بیٹھ جائے گا۔ سارے ملازم کام چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ "انڈین اوپینین" اور مطبع دونوں بند ہو جائیں گے۔

مطبع کے ملازموں میں میرے رشتے کے بھائی چھگن لال گاندھی بھی تھے۔ میں نے جس وقت مسٹر وِسٹ سے اس تجویز کا ذکر کیا وہ بھی موجود تھے۔ وہ بال بچوں والے آدمی

تھے مگر انہوں نے بچپن سے میری تربیت میں رہنے اور میرے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ انھیں مجھ پر پورا بھروسا تھا۔ اس لیے انہوں نے بغیر کسی بحث کے یہ تجویز منظور کر لی اور اس دن سے آج تک میرے ساتھ ہیں۔ گووِند سوامی مشین میں شریک ہو گئے۔ دوسروں نے پوری تجویز تو منظور نہیں کی مگر اس پر راضی ہو گئے کہ میں جہاں کہیں مطبع لے جاؤں گا وہ ساتھ چلیں گے۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ان لوگوں سے یہ بحث و بُز کرنے میں مجھے دو دن سے زیادہ نہیں لگے۔ اس کے بعد میں نے فوراً اشتہار دیا کہ ایک زمین کے قطعے کی ضرورت ہے جو ڈربن کے مضافات میں کسی ریل کے اسٹیشن کے قریب واقع ہو۔ اس کے جواب میں فینکس سے پیام آیا۔ میں اور مسٹر ولیسٹ اس زمین کو دیکھنے گئے اور ایک ہفتے کے اندر ہم نے بیس ایکر کا قطعہ خرید لیا۔ اس میں ایک چھوٹا سا خوبصورت چشمہ بہتا تھا اور آم اور نارنگی کے چند درخت بھی تھے۔ اس سے ملا ہوا ایک اسّی ایکر کا قطعہ تھا جس میں بہت سے درخت اور ایک ٹوٹا پھوٹا بنگلہ تھا۔ ہم نے اسے بھی خرید لیا۔ اس میں سب ملا کر ایک ہزار پونڈ صرف ہوئے۔

مسٹر رستم جی آنجہانی اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ میری مدد کیا کرتے تھے۔ انھیں یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے ایک بڑے گودام کی پُرانی لوہے کی چادریں میرے حوالے کر دیں اور بہت سا اور عمارت کا مسالہ بھی دیا۔ ہم نے اس سامان سے تعمیر شروع کر دی۔ چند ہندوستانی معمار اور بڑھئی مل گئے جو میرے ساتھ جنگ بوئر کے زمانے میں کام کر چکے تھے اور ان کی مدد سے ہم نے چھاپے خانے کے لئے ایک پچھتّر فیٹ لمبا اور پچاس فیٹ چوڑا سائبان ایک مہینے کے اندر تیار کر لیا۔ مسٹر ولیسٹ اور بعض اور لوگ بڑی جوکھم اٹھا کر ان کاریگروں کے ساتھ رہتے تھے۔ ساری زمین پر گھاس ہی گھاس تھی اور سانپوں کی اتنی کثرت تھی کہ وہاں رہنے میں جان کا خطرہ تھا۔ پہلے سب خیموں میں رہتے تھے۔ ہم لوگ

ہفتے میں ایک بار اپنا سامان چھکڑوں میں بھر کر فینکس لے جایا کرتے تھے۔ یہ جگہ ڈربن سے چودہ میل اور فینکس اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی۔

"انڈین اوپنین" کا صرف ایک نمبر باہر مرکری پریس میں چھپوانے کی ضرورت پڑی۔ اب میں نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو جو ہندوستان سے روزگار کی تلاش میں میرے ساتھ آئے تھے اور مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے تھے فینکس لے آؤں۔ یہ لوگ روپیہ کمانے کے شوق میں آئے تھے اور انھیں اس زندگی پر آمادہ کرنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی چند لوگ راضی ہو گئے۔ ان میں سے میں صرف مگن لال گاندھی کا ذکر کروں گا کیونکہ اور لوگ تھوڑے دن کے بعد چھوڑ کر چلے گئے اور اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ مگن لال گاندھی عمر بھر کے لئے اپنے کاروبار سے ہاتھ دھو کر میرے ساتھ ہو گئے اور میرے اخلاقی تجربوں میں وہ اپنی قابلیت، ایثار، خلوص اور محنت کے لحاظ سے میرے سب پرانے ساتھیوں سے ممتاز رہے اور دستکاری میں تو انہوں نے بغیر کسی سے سیکھے وہ کمال پیدا کیا کہ ہم میں سے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس طرح سنہ ۱۹۰۴ء میں فینکس کی بستی کی بنیاد پڑی اور شدید مشکلات کے باوجود اب تک "انڈین اوپنین" اسی بستی سے نکلتا ہے۔

مگر اس مہم کی ابتدائی مشکلوں، مختلف تبدیلیوں اور ہماری امیدوں اور مایوسیوں کے بیان کے لئے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔

———— (۰) ————

بیسواں باب

پہلی رات

فینکس سے "انڈین اوپینین" کا پہلا نمبر نکالنے میں ہمیں دانتوں پسینہ آگیا۔ اگر میں نے دو باتوں کی احتیاط نہ کی ہوتی تو پہلا نمبر نہ نکل سکتا یا دیر میں نکلتا۔ مجھے چھاپے خانے میں انجن سے کام لینا پسند نہیں تھا۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ جہاں کھیتی کا کام ہاتھ سے کیا جائے وہاں مشینوں کو بھی ہاتھ سے چلانا زیادہ مناسب حال ہوگا۔ مگر اس طرح کام چلتا نظر نہ آیا تو ہم نے ایک تیل کا انجن لگا دیا۔ پھر بھی میں نے ویسٹ سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسا انتظام کر لینا چاہیے کہ اگر انجن اتفاقاً بند بھی ہو جائے تو مشینیں نہ رکیں۔ انہوں نے ایک چرخی لگا لی جو ہاتھ سے چلائی جا سکتی تھی۔ اخبار کی تقطیع اب تک وہی تھی جو روزانہ اخباروں کی ہوتی ہے۔ مگر فینکس جیسے دور افتادہ مقام پر اس تقطیع کی چھپائی مشکل تھی، اس لیے اس کی فل اسکیپ سائز اختیار کی گئی کہ بروقت ضرورت اخبار چھوٹی مشین پر چھاپا جا سکے۔

ابتدا میں اخبار کی اشاعت کے دن ہم سب کو رات کو دیر تک جاگنا پڑتا تھا۔ چھوٹے بڑے سب مل کر چھپے ہوئے تختوں کو موڑتے تھے اور یہ کام عموماً رات کے دس اور بارہ بجے کے درمیان ختم ہوتا تھا۔

پہلی رات کبھی نہ بھولے گی۔ مشین پر فرمہ کس دیا گیا مگر انجن چلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہم نے ڈربن سے ایک انجنیر بلوایا تھا کہ مشین کو جا کر چالو کر دے۔ اس نے اور ویسٹ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر انجن ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہر شخص پریشان تھا۔ ویسٹ بیچارے کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ میرے پاس آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک

رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے "انجن کسی طرح نہیں چلتا۔ میرے خیال میں پرچہ وقت پر نکلنے کی کوئی اُمید نہیں۔"

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اگر یہ صورت ہے تو مجبوری ہے۔ رونے پیٹنے سے کیا فائدہ؟ پھر بھی ہمیں اپنی جیسی کر لینا چاہیئے۔ کیا اُس چرخی سے کام نہیں چلے گا؟"

انہوں نے جواب دیا "چرخی چلانے کے لئے آدمی کہاں سے آئیں گے؟ یہ اتنے آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔ چار چار کو باری باری سے کام کرنا پڑے گا اور ہم لوگ سب تھکے ہوئے ہیں۔"

تعمیر کا کام ہنوز ختم نہیں ہوا تھا اس لیے بڑھئی ابھی تک موجود تھے۔ سب چھاپے خانے کے سائبان میں پڑے سو رہے تھے۔ میں نے اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا "ایسا کیوں نہ کریں کہ ان لوگوں سے مدد لیں اور رات بھر جاگ کر کام ختم کر ڈالیں؟ میرے خیال میں تو یہ تدبیر ضرور آزمانا چاہیئے۔"

ولیسٹ نے کہا "میری ہمت نہیں پڑتی کہ ان آدمیوں کو جگاؤں اور چھاپے خانے کے آدمی سچ مچ شل ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "خیر یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

ولیسٹ نے کہا "پھر تو ممکن ہے کہ ہم کام کرتے جائیں۔"

میں نے سونے والوں کو جگایا اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ وہ فوراً راضی ہو گئے اصرار کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا "اگر ہم ایسے وقت میں کام نہ آئے تو پھر ہم کس مرض کی دوا ہیں؟ آپ آرام کیجئے ہم چرخی چلاتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔"

ہمارے آدمی تو پہلے ہی سے تیار تھے۔

ولیسٹ بہت خوش ہوئے اور جب ہم لوگوں نے کام شروع کیا تو جوش میں آ کر

ایک مناجات گانے لگے۔ میں اُس فریق میں تھا جس میں بڑھئی تھے۔ دوسرے بھی اپنی اپنی باری کام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ صبح سات بجے تک جاری رہا۔ ابھی بہت سا کام باقی تھا۔ اسلئے میں نے ویسٹ سے کہا کہ انجنیر کو جگا کر اُن سے کہو ایک بار پھر انجن چلانے کی کوشش کریں۔ اگر اب بھی انجن چل جائے تو کام وقت پر ختم ہو سکتا ہے۔

ویسٹ نے جاکر انھیں جگایا اور فوراً انجن گھر پہنچے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ ان کے ہاتھ لگاتے ہی انجن چلنے لگا۔ سارا طبع خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھا۔

میں نے پوچھا "یہ کیا بات ہے؟ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ رات ہم محنت کرتے کرتے تھک گئے اور کچھ نہ ہوا اور آج صبح انجن خود بخود چلنے لگا جیسے کبھی بگڑا ہی نہ تھا؟"

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اس کے جواب میں یہ الفاظ انجنیر نے کہے یا ویسٹ نے "اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا سبب تھا۔ مشینوں کی بھی بعض وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ہماری طرح وہ بھی سستانا چاہتی ہیں۔"

میرے نزدیک انجن کا بند ہونا ہم سب کی آزمایش کے لئے تھا اور اس کا عین ضرورت کے وقت چلنا ہمارے خلوص اور محنت کا اجر تھا۔

اخبار وقت پر بھیج دیا گیا۔ ہم میں سے ہر ایک خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ پہلی ہی بار وقت کی پابندی پر اس قدر زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اخبار ہمیشہ باقاعدہ شائع ہوتا رہا اور فینکس کے لوگوں میں اعتمادِ نفس کی روح پیدا ہو گئی۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ ہم نے اپنی خوشی سے انجن کا استعمال ترک کر دیا اور ہاتھ سے کام کرنے لگے۔

میرے نزدیک یہی دن فینکس کی اخلاقی معراج کے تھے۔

اکیسواں باب

بولک آگے بڑھے

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ گو میں نے فینکس کی بستی بسائی مگر میرے قیام کی صورت یہی رہی کہ کبھی کبھی جا کر کچھ دن وہاں رہ آتا تھا۔ اصل میں میرا ارادہ یہ تھا کہ میں آہستہ آہستہ وکالت ترک کر دوں، اس بستی میں جا کر بس جاؤں، محنت مزدوری سے روزی کماؤں اور فینکس کی ترقی میں کوشش کر کے ذوق خدمت حاصل کروں۔ مگر یہ میری قسمت میں نہ تھا۔ مجھے اکثر تجربہ ہوا ہے کہ انسان کچھ اور سوچتا ہے اور خدا کچھ اور کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ دیکھا کہ اگر اصلی مقصد طلب حق ہی ہو تو خواہ انسان کی ساری تدبیریں الٹی ہو جائیں نتیجہ کبھی اس کے حق میں برا نہیں ہوتا بلکہ اکثر اس کی توقع سے بڑھ کر اچھا ہوتا ہے۔ فینکس میں جو غیر متوقع واقعات پیش آئے وہ ہرگز مضر نہیں تھے۔ البتہ یہ مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے پہلے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں اُن سے بہتر نتیجے حاصل ہوئے۔

ہم نے چھاپے خانے کے آس پاس کی زمین کو تین تین ایکڑ کے قطعوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ہر شخص کھیتی کر کے گذر بسر کے لائق کما لے۔ ایک قطعہ میرے حصے میں بھی آیا۔ ان سب قطعوں میں ہمیں چار و ناچار لوہے کی نالی دار چادروں کے مکان بنانا پڑے۔ ہم تو یہ چاہتے تھے کہ کچی خس پوش جھونپڑیاں یا اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے مکان کسانوں کے رہنے کے لائق بنا لیں مگر اس کا موقع نہ تھا۔ ان مکانوں میں خرچ بھی زیادہ ہوتا اور وقت بھی بہت لگتا اور ہم کو یہ فکر تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ٹھکانے سے بیٹھ کر کام شروع کر دیں۔

اخبار کے ایڈیٹر ابھی تک منسکھ لال نظر تھے۔ انہوں نے نئی تجویز منظور نہیں کی تھی اور اخبار کی نگرانی ڈربن میں رہ کر کرتے تھے جہاں ہمارے دفتر کی شاخ تھی۔ گو ہم

تنخواہ دار کمپوزیٹروں" سے کام لیتے تھے مگر تجویز یہ تھی کہ ہم میں سے ہر شخص "کمپوزنگ" کا کام جو سب سے سہل مگر نہایت تکلیف دہ ہے، سیکھ لے۔ بعض لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ جو نہیں جانتے تھے انہوں نے اب سیکھ لیا۔ میں سب سے بھسڈی رہا اور مگن لال گاندھی سب سے بڑھ گئے۔ اب تک انہوں نے کبھی چھاپے خانے میں کام نہیں کیا تھا مگر تھوڑے ہی دن کی مشق میں وہ نہ صرف "کمپوزنگ" میں بلکہ چھپائی کے سارے کاموں میں برق ہوگئے۔ مجھے ان کی ترقی دیکھ کر تعجب اور خوشی ہوئی۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ان میں جتنی قابلیت ہے اس کا انھیں خود احساس نہیں۔

ابھی ہم ٹھکانے سے بیٹھنے نہیں پائے تھے اور عمارتیں پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھیں کہ مجھے اپنا نیا نشیمن چھوڑ کر جوہانسبرگ جانا پڑا۔ کچھ ایسی صورت تھی کہ میں وہاں کے کام سے زیادہ دن بے توجہی نہیں کر سکتا تھا۔

جوہانسبرگ پہنچ کر میں نے پولک سے اپنے نئے انتظام کا ذکر کیا۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب نے، جو انہوں نے مجھے عاریت دی تھی، یہ انقلاب پیدا کر دیا تو وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ انہوں نے پوچھا "کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ میں اس نئے تجربہ میں شریک ہو سکوں؟" میں نے کہا "ہے کیوں نہیں۔ آپ کا جی چاہے تو آپ نئی بستی میں چل کر ہماری برادری میں داخل ہو جائیے۔" وہ کہنے لگے "تو پھر میں بالکل تیار ہوں۔"

ان کی اولوالعزمی نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے افسر کو ایک مہینے کا نوٹس دیا کہ "کریٹک" کی ادارت سے سبکدوش کر دیئے جائیں اور اس مدت کے گذرنے کے بعد فینکس پہنچ گئے۔ وہ اس قدر ملنسار تھے کہ تھوڑے ہی دن میں انھوں نے سب کے دل کو موہ لیا اور ہمارے خاندان میں گھل مل گئے۔ اور سادگی تو ان کی سرشت میں تھی۔ فینکس کی زندگی انھیں ذرا بھی غیر مانوس یا دشوار نہیں معلوم ہوئی

بلکہ ایسی راس آئی جیسے بط کو پانی۔ مگر میں انھیں زیادہ دن یہاں نہیں رکھ سکتا تھا مسٹر رچ اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے انگلستان جارہے تھے اور میں اکیلا دفتر کا کام نہیں سنبھال سکتا تھا اس لئے میں نے پولک سے کہا کہ تم دفتر کے کام میں میری مدد کرو اور وکالت کا امتحان پاس کرلو۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دن کے بعد ہم دونوں کام چھوڑ کر فینکس میں بس جائینگے مگر اس کی کبھی نوبت نہ آئی۔ پولک اتنے بھولے آدمی تھے کہ جب انھیں کسی دوست پر اعتماد ہوجاتا تھا تو جو وہ کہتا تھا بغیر بحث کے مان لیتے تھے۔ انہوں نے فینکس سے لکھا کہ مجھے یہ زندگی دل سے پسند ہے، یہاں سچی راحت و مسرت حاصل ہے اور میرے دل میں اس بستی کو ترقی دینے کے ولولے اور امیدیں ہیں پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسے چھوڑ کر آپ کے ساتھ دفتر میں کام کرنے اور وکیل بننے سے ہمارا نصب العین جلد حاصل ہوجائے گا تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مجھے اس خط کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ پولک فینکس سے جوہانسبرگ آگئے اور انہوں نے میرے ساتھ کام کرنے کے معاہدے پر دستخط کردئے۔

اسی زمانے میں میں نے ایک اسکاٹی[1] تھیوسوف سے جو مجھ سے ایک ابتدائی قانونی امتحان کی کتابیں پڑھتے تھے کہا کہ تم بھی پولک کی طرح میرے ساتھ کام کرنے کا معاہدہ کرلو اور وہ راضی ہوگئے۔ اُن کا نام میک اِنٹائر تھا۔

غرض میری نیت تو یہ تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو فینکس کے نصب العین تک پہنچوں مگر اسکے لئے جو طریقہ میں نے اختیار کیا تھا وہ مجھے منزل مقصود سے دور لے جارہا تھا اور اگر مشیتِ ایزدی کا دخل نہ ہوتا تو میں اس جال میں جو میں نے سادہ زندگی کے نام سے پھیلا رکھا تھا پھنس کر رہ جاتا۔

جس طریقے سے خدا نے مجھے اور میرے نصب العین کو تباہی سے بچایا اسکا کسی کو سان گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے بیان کرنے کے لئے کئی باب چاہئیں۔

---

[1] Scotch

بائیسواں باب

خدا حافظِ حقیقی ہے

اب میرے ہندوستان جلد واپس جانے کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے ایک سال لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ سال ختم ہوگیا اور واپسی کی کوئی صورت نہ تھی اسلئے میں نے یہ طے کیا کہ بیوی بچوں کو اپنے پاس بلوالوں

جس جہاز میں یہ لوگ جنوبی افریقہ آرہے تھے اُس میں ایک دن میرا منجھلا لڑکا رامداس کپتان کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ یکایک اس کا بازو اُکھڑ گیا۔ کپتان نے اس کی دیکھ بھال بہت اچھی طرح کی اور جہاز کے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا مگر پوری طرح فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے جب وہ جہاز سے اُترا تو اُس پٹی کے سہارے ہاتھ لٹکائے تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی کسی اچھے ڈاکٹر سے مرہم پٹی کرانا چاہیئے۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے مٹی کے علاج کی اتنی دھن تھی کہ میں نے اپنے بعض موکلوں کو، جو مجھ جیسے نیم حکیم پر عقیدہ رکھتے تھے، یہ علاج شروع کرا دیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ رامداس کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ وہ پورے آٹھ برس کا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا اپنی مرہم پٹی مجھے کرنے دوگے؟ اُس نے مسکرا کر کہا "بڑی خوشی سے" اُسے اس عمر میں اتنا شعور تو نہ تھا کہ اپنے بُرے بھلے کو سمجھتا مگر وہ عطائی علاج اور باقاعدہ علاج کا فرق ضرور جانتا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کانپتے ہاتھوں سے پٹی کھولی، زخم دھویا، اور صاف مٹی کی ٹکیاں رکھ کر بازو پر پٹی باندھ دی۔ یہ عمل ایک مہینے تک جاری رہا یہاں تک کہ زخم بھر کر سوکھ گیا۔ اس درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی اور وقت بھی اس سے زیادہ نہیں لگا جتنا بقول جہاز کے

ڈاکٹر کے معمولی علاج میں لگتا۔
اس طرح کے تجربوں سے میرا عقیدہ گھریلو علاج پر اور پختہ ہوگیا اور اب میں زیادہ وثوق سے ان باتوں کا مشورہ دینے لگا۔ میں نے ان طریقوں کے استعمال کا دائرہ وسیع کر دیا اور مٹی پانی اور فاقے کے علاج سے مختلف قسم کے زخموں میں، بخار، ضعف معدہ اور یرقان وغیرہ میں کام لیا اور اکثر کامیاب ہوا۔ مگر اب مجھے اتنا وثوق نہیں جتنا جنوبی افریقہ میں تھا بلکہ اتنے دن کی آزمایش سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس قسم کے تجربوں میں صریحی خطرے ہیں۔

یہاں ان تجربوں کا ذکر کرنے سے یہ غرض نہیں کہ ان کی کامیابی ظاہر کی جائے۔ مجھے اپنے کسی تجربے کے پوری طرح کامیاب ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ اور مجھ پر کیا موقوف ہے ڈاکٹر بھی اپنے تجربوں کے متعلق اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس شخص کو نئے تجربے کرنا ہوں وہ اپنی ذات سے ابتدا کرے۔ اس سے حق کی تلاش میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جو شخص خلوص نیت سے تجربہ کرتا ہے اُسے خدا ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔

فرنگیوں سے میل جول پیدا کرنے کے جو تجربے میں نے کئے اُن میں بھی گھریلو علاج کے تجربوں سے کم خطرے نہیں تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ ان خطروں کی نوعیت دوسری تھی۔ مگر میں نے ان کی کبھی ذرا بھی پروا نہیں کی۔

میں نے پولک کو اپنے گھر ہی میں رکھا اور ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔ ان کی نسبت مسز پولک سے کئی سال قبل ہو چکی تھی مگر شادی کے لئے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ میرا خیال ہے کہ پولک خانہ داری کی زندگی شروع کرنے سے پہلے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہتے تھے۔ وہ رسکن کی تعلیم کو مجھ سے بہتر سمجھتے تھے مگر اس پر فوری عمل کرنے میں ان کا مغربی ماحول حائل تھا۔ میں نے انھیں سمجھایا "جب دو دلوں میں

ایسا اتحاد ہو جیسا تم دونوں میں ہے تو مالی مصلحتوں سے شادی کو ملتوی کرنا جائز نہیں۔ اگر افلاس شادی میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ غریب آدمی کبھی شادی کر ہی نہیں کرسکتے۔ اور پھر تم تو میرے ساتھ رہتے ہو۔ روزمرّہ کے خرچ کی تو فکر ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ میرے خیال میں تو تمہیں جتنی جلدی ہو سکے، شادی کر لینا چاہیئے۔" میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے پولک سے کوئی بات دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ انہوں نے میری دلیل تسلیم کر لی اور فوراً مسز پولک سے جو ان دنوں انگلستان میں تھیں اس معاملے کے متعلق خط و کتابت شروع کر دی۔ مسز پولک خوشی سے راضی ہو گئیں اور چند مہینے میں جوہانسبرگ پہنچ گئیں۔ شادی میں کچھ خرچ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ دولہن کے لیئے نیا لباس بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ان دونوں کو عقد کے لئے مذہبی رسوم کی حاجت نہیں تھی۔ مسز پولک عیسائی مذہب پر پیدا ہوئی تھیں، پولک یہودی مذہب پر۔ ان دونوں کا مشترک مذہب، مذہب اخلاق تھا۔

لگے ہاتھوں اس عقد کے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کر دوں۔ ٹرانسوال میں اس رجسٹرار کو، جو فرنگیوں کی شادی کا اندراج کرتا تھا، کالے آدمیوں کی شادی درج رجسٹر کرنے کا اختیار نہ تھا۔ پولک کی شادی میں دولھا کا ساتھی[1] میں تھا۔ اس کام کے لیئے فرنگی دوست بھی مل سکتے تھے مگر پولک کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا۔ غرض ہم تینوں رجسٹرار کے دفتر میں گئے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ جب تم دولھا کے ساتھی ہو تو مجھے کیوں کر یقین آئے کہ دولھا دولھن فرنگی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ جب تک اچھی طرح تحقیقات نہ کر لے، اس شادی کے اندراج کو ملتوی رکھے۔ دوسرے دن اتوار تھا اور اس کے اگلے دن سال نو کی تعطیل تھی۔ بھلا ہم کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ٹھہری ٹھہرائی شادی اتنی

---

[1] best man

سی بات کے لئے ملتوی کردی جائے۔ مجھہ سے چیف مجسٹریٹ سے جو رجسٹری کے محکمہ کا افسر تھا، ملاقات تھی۔ اس لیئے میں دولھا دولھن کو ساتھہ لیکر اُن کے پاس گیا۔ انہوں نے ہنس کر رجسٹرار کے نام ایک رقعہ لکھدیا اور شادی کا باضابطہ اندراج ہوگیا۔

اب تک جو فرنگی میرے ساتھہ رہتے تھے اُن سے پہلے کی ملاقات تھی مگر اب ایک انگریز خاتون، جو ہمارے لئے بالکل اجنبی تھیں، ہمارے خاندان میں داخل ہوئیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان میاں بیوی سے ہم سے کبھی بگاڑ نہیں ہوا اور فرض کیجے کہ مسنر پولک میں اور میری بیوی میں کبھی ناچاقی ہوئی بھی ہو تو ایسی باتیں تو اچھے اچھے ہمجنس خاندانوں میں بھی پیش آجاتی ہیں۔ ہمارا خاندان تو اس قدر مخلوط تھا کہ اس میں ہر قسم کے اور ہر مزاج کے لوگ جمع تھے۔ اور اگر غور کیجئے تو ہمجنس اور غیر جنس کا فرق محض خیالی ہے۔ ہم سب ایک ہی خاندان کے رکن ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ اسی باب میں ویسٹ کی شادی کا بھی ذکر کردیا جائے۔ اس وقت تک میرے خیالات "برہمچاریہ" کے متعلق پختہ نہیں ہونے پائے تھے اس لئے مجھے اپنے سب کنوارے دوستوں کی شادی کرانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ کچھہ دن کے بعد ویسٹ اپنے والدین سے ملنے لوتھ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ہوسکے تو شادی کرلینا اور اپنی بیوی کو ساتھہ لیتے آنا۔ فینکس ہمارا مشترکہ گھر تھا اور ہم سب کسان بن گئے تھے اس لئے ہمیں شادی کا اور اُس کے لازمی نتائج کا ڈر نہیں رہا تھا۔ ویسٹ نے لیسٹر کی ایک نوجوان حسین خاتون سے شادی کرلی اور انھیں ساتھہ لیکر لوٹے۔ ان کے خاندان والے موچی تھے اور لیسٹر کے ایک کارخانے میں مزدوری کرتے تھے۔ مسنر ویسٹ خود بھی کچھہ دن اس کارخانے میں کام کرچکی تھیں۔ میں نے انھیں حسین اس لئے کہا ہے کہ ان کے حسنِ سیرت نے فوراً میرے دل کو موہ لیا۔ سچ پوچھیے تو سچا حسن پاک دامنی اور پاک باطنی میں ہے۔ مسنر ویسٹ کے ساتھہ ان کی والدہ بھی آئی تھیں۔ یہ ضعیفہ ابتک زندہ ہیں۔ انکی

محنت، مستعدی اور خوش مزاجی پر ہم سب کو رشک آتا تھا۔

جس طرح میں نے فرنگی دوستوں کو شادی کی ترغیب دی اسی طرح ہندوستانی دوستوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے بال بچوں کو وطن سے بلالیں۔ فینکس آہستہ آہستہ چھوٹا سا گاؤں بن گیا۔ اب وہاں چند خاندان بس گئے تھے اور ان کے بال بچوں سے آبادی بڑھتی جاتی تھی۔

تیئیسواں باب

گھر گرہستی کی ایک جھلک

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ڈربن میں میرے گھر کا خرچ بہت تھا مگر میرا میلان سادگی کی طرف ہو چلا تھا۔ جوہانسبرگ میں رسکن کی تعلیم کے مطابق میں نے اس معاملے میں بہت سختی شروع کر دی۔

ایک بیرسٹر کے گھر میں جتنی سادگی ممکن تھی وہ میں نے اختیار کی۔ تھوڑے بہت فرنیچر کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ مکان کی صورت میں اتنی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جتنی مکینوں کی سیرت میں ہوئی۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرنے کا شوق بڑھ گیا۔ میں نے اپنے بچوں کو بھی اس کی تربیت دینا شروع کر دی

نان پاؤ خریدنا چھوڑ دیا گیا اور کوہنے کی ہدایت کے مطابق بے خمیر کی روٹی گھر پر پکنے لگی۔ معمولی کل کی چکی کا پسا ہوا میدہ اس کام کا نہیں تھا اس لئے سادگی، صحت اور کفایت کے خیال سے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ہم خود ہاتھ کی چکی میں آٹا پیسیں۔ میں نے سات پونڈ میں ایک چکی خریدی۔ اس میں ایک لوہے کی چرخی لگی تھی جو ایک آدمی کے بس کی نہ تھی مگر دو آدمی اسے اچھی طرح چلا سکتے تھے۔ عام طور پر میں، پولک اور بچے اسے چلایا کرتے تھے۔ میری بیوی بھی کبھی کبھی ہاتھ بٹا لیتی تھیں، اگرچہ چکی چلانے کا وقت وہی تھا جب وہ پکانا ریندھنا شروع کرتی تھیں۔ جب مسز پولک آئیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئیں۔ بچوں کو چکی چلانے میں بڑی اچھی ورزش ہو جاتی تھی۔ یہ کام، بلکہ کوئی کام بھی، ان سے جبراً نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ان کے لئے ایک کھیل سا تھا۔ جب جی چاہتا آکر

ہاتھ لگا دیتے اور جب تھک جاتے تو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ مگر ان بچوں نے اور دوسروں نے جن کا میں آگے ذکر کروں گا میری مدد میں کبھی کمی نہیں کی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں کوئی کام چور تھا ہی نہیں مگر اکثر ایسے تھے جو جی سے کام کرتے تھے۔ مجھے بہت کم لڑکے یاد ہیں جو کام سے جی چراتے ہوں یا تھکنے کا بہانہ کرتے ہوں۔

ہم نے اوپر کے کام کے لئے ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ وہ بھی عزیزوں کی طرح گھر میں رہتا تھا اور بچے کام میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ میونسپلٹی کا مہتر میلا اُٹھایا کرتا تھا مگر پاخانے کی صفائی ہم نوکر سے نہیں کراتے تھے بلکہ اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ یہ بچوں کے لئے بڑی اچھی تربیت ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں میں سے کسی کو مہتر کا کام کرنے میں عار نہیں اور انھیں قدرتی طور پر حفظانِ صحت کے عام اصولوں پر عمل کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہمارے گھر میں بہت کم یہ اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی بیمار پڑے۔ جب کبھی ایسی صورت پیش آتی تھی تو بچے بڑے شوق سے تیمارداری کرتے تھے۔ میں ان کی کتابی تعلیم کی طرف سے بالکل غافل تو نہیں تھا مگر اسے اس عملی تعلیم پر قربان کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کرتا تھا۔ اس لئے اگر میرے بچوں کو مجھ سے شکایت ہو تو ایک لحاظ سے بجا ہے۔ بعض موقعوں پر انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے اور مجھے ایک حد تک اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ انھیں تعلیم دلانے کی خواہش میرے دل میں تھی بلکہ میں نے خود انھیں پڑھانے کی کوشش کی مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہو گئی اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ مجھے ان کے لئے کوئی اتالیق نہ مل سکا اس لئے میں انھیں روزانہ اپنے ساتھ دفتر لیجاتا تھا۔ یہ پانچ میل کا فاصلہ وہ آتے جاتے پیدل ہی طے کرتے تھے۔ اس سے انھیں اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔ اور اگر کوئی اور ساتھ نہ ہوا جس سے باتیں کرنا ضروری ہو تو میں بچوں کو چلتے چلتے گفتگو کے ذریعے تعلیم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے سب بچوں نے بجز ہری لال کے جو ہندوستان ہی میں رہ گیا تھا جوہانسبرگ میں اسی طرح تعلیم پائی۔ اگر میں انھیں ایک

اس حد تک انھیں ملک کی خدمت کے ناقابل بنا دیتے ہیں۔ اس عقیدے کی وجہ سے میں اپنے بچوں سے خاص کر کے ہمیشہ گجراتی میں باتیں کرتا تھا۔ پولک کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں بچوں کی آیندہ ترقی کی جڑ کاٹ رہا ہوں۔ وہ انتہائی محبت اور اصرار سے کہتے تھے کہ اگر لڑکے بچپن سے انگریزی جیسی عالمگیر زبان سیکھ لیں تو وہ زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے رہیں گے۔ ان کی دلیلوں سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انھیں اپنے طرز عمل کی صحت کا قائل کر دیا یا وہ مجھے خود رائے اور ضدی سمجھ کر چپ ہو رہے۔ یہ بیس برس کی بات ہے اور اس عرصے میں تجربے نے میرے عقیدے کو اور بھی راسخ کر دیا ہے۔ گو میرے لڑکوں کو مکمل ادبی تعلیم نہ ملنے سے نقصان پہونچا ہے مگر اس کی بدولت انھوں نے مادری زبان میں اور زیادہ ترقی کر لی ہے جس میں ان کا اور ان کے ملک کا سراسر فائدہ ہے کیونکہ اب وہ اپنے دیس میں پردیسی نہیں معلوم ہوتے۔ پھر بھی ان کا علم محض اپنی زبان تک محدود نہیں انگریز دوستوں کے وسیع حلقے میں اٹھنے بیٹھنے اور ایسے ملک میں رہنے سے جہاں زیادہ تر انگریزی بولی جاتی ہے انھیں خود بخود انگریزی بولنے اور لکھنے کی خاصی مشق ہو گئی ہے۔

(۰)

اس حد تک انھیں ملک کی خدمت کے ناقابل بنا دیتے ہیں۔ اس عقیدے کی وجہ سے میں
اپنے بچوں سے خاص کر کے ہمیشہ گجراتی میں باتیں کرتا تھا۔ پولک کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ
سمجھتے تھے کہ میں بچوں کی آیندہ ترقی کی جڑ کاٹ رہا ہوں۔ وہ انتہائی محبت اور اصرار
سے کہتے تھے کہ اگر لڑکے بچپن سے انگریزی جیسی عالمگیر زبان سیکھ لیں تو وہ زندگی کی دوڑ
میں دوسروں سے آگے رہیں گے۔ ان کی دلیلوں سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ مجھے یاد
نہیں کہ میں نے انھیں اپنے طرزِ عمل کی صحت کا قائل کر دیا یا وہ مجھے "خود رائے اور ضدی"
سمجھ کر چپ ہو رہے۔ یہ بیس برس کی بات ہے اور اس عرصے میں تجربے نے میرے عقیدے
کو اور بھی راسخ کر دیا ہے۔ گو میرے لڑکوں کو مکمل ادبی تعلیم نہ ملنے سے نقصان پہنچا ہے
مگر اس کی بدولت انھوں نے مادری زبان میں اور زیادہ ترقی کر لی ہے جس میں ان کا
اور ان کے ملک کا سراسر فائدہ ہے کیونکہ اب وہ اپنے دیس میں پردیسی نہیں معلوم ہوتے۔
پھر بھی ان کا علم محض اپنی زبان تک محدود نہیں۔ انگریز دوستوں کے وسیع حلقے میں اُٹھنے بیٹھنے
اور ایسے ملک میں رہنے سے جہاں زیادہ تر انگریزی بولی جاتی ہے انھیں خود بخود انگریزی
بولنے اور لکھنے کی خاصی مشق ہو گئی ہے۔

چوبیسواں باب

زولو "بغاوت"

بظاہر میں جوہانسبرگ میں بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب میں نہ تھی۔ عین اس وقت جب میں یہ سمجھتا تھا کہ ذرا اطمینان سے بیٹھوں گا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بالکل توقع نہ تھی۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں زولو "بغاوت" شروع ہو گئی ہے۔ مجھے زولو قوم سے کوئی خلش نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی ہندوستانیوں کو نقصان نہیں پہونچایا تھا۔ مگر اس زمانے میں میرا یہ عقیدہ تھا کہ دولتِ برطانیہ دنیا کی بہبود کے لئے قائم ہے۔ میں برطانیہ کا اتنا سچا وفادار تھا کہ دل میں بھی اس دولتِ عظمیٰ کو ضرر پہنچنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے مجھے اس سے سروکار نہ تھا کہ بغاوت بجا ہے یا بے جا۔ نٹال میں ایک والنٹیر ڈیفنس فورس[1] تھی اور اسے مزید رنگروٹوں کے بھرتی کرنے کا اختیار تھا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ "بغاوت" کو فرو کرنے کے لئے اس دستے کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

میں اپنے آپ کو نٹال کا شہری سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایمبولینس کور قائم کرنے کے لئے تیار رہوں۔ انہوں نے فوراً منظوری بھیجدی۔

مجھے اپنی درخواست اس قدر جلد قبول ہو جانے کی امید نہیں تھی۔ اچھا ہوا کہ

---

[1] رضا کاروں کا دستہ ملک کی حفاظت کے لئے۔

میں نے یہ خط لکھنے سے پہلے ہی ضروری انتظام کر لیا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر میری درخواست قبول ہوئی تو جوہانسبرگ کے گھر کو چھوڑ دوں گا۔ پولک ایک چھوٹے مکان میں رہیں گے اور میری بیوی فینکس چلی جائیں گی۔ وہ اس فیصلے میں بالکل میری ہم رائے تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ اس قسم کے معاملوں میں انہوں نے کبھی میری راہ میں رکاوٹ ڈالی ہو۔ اس لئے جیسے ہی گورنر کا جواب آیا میں نے مالک مکان کو ایک مہینے کا معمولی نوٹس دیدیا اور اپنا سامان کچھ فینکس بھجوا دیا اور کچھ پولک کے یہاں رکھوا دیا۔

میں نے ڈربن جا کر رنگروٹوں کے لئے تحریک کی۔ بہت بڑے دستے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم کل چوبیس آدمی تھے جن میں میرے علاوہ چار گجراتی تھے اور سب جنوبی ہند کے لوگ تھے جو ابتدا میں "پابند مزدوروں" کی حیثیت سے آئے تھے۔ ایک پٹھان تھا جو کسی کا پابند نہیں تھا۔

چیف میڈیکل افسر نے دستور کے مطابق مجھے سرجنٹ میجر کا عارضی منصب دے دیا تاکہ میری ایک حیثیت بھی ہو جائے اور کام میں بھی آسانی ہو اور میری تجویز سے انہوں نے تین آدمیوں کو سرجنٹ اور ایک کو کارپورل بنا دیا۔ ہمیں حکومت کی طرف سے وردیاں بھی ملیں۔ ہماری کور چھ ہفتے تک لام پر رہی۔ "بغاوت" کے مقام پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ "بغاوت" کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ کسی قسم کی مزاحمت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ شورش محض اتنی بات پر "بغاوت" کہی جانے لگی کہ ایک زولو سردار نے ایک نئے ٹیکس کے ادا کرنے سے انکار کیا تھا اور جو سرجنٹ وصولی کے لئے گیا تھا اُسے نیزہ مار کر ختم کر دیا تھا۔ بہر حال مجھے زولو قوم سے دلی ہمدردی تھی اور جب صدر کیمپ پہنچکر میں نے یہ سنا کہ ہم لوگوں کا کام زیادہ تر زولو زخمیوں کی تیمارداری کرنا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میڈیکل افسر کو ہمارا آنا بہت غنیمت معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ گورے لوگ زولو زخمیوں کی تیمارداری دل سے نہیں کرتے۔ ان غریبوں کے زخموں میں کیڑے

پڑ گئے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس نے ہم لوگوں کے پہنچنے کو ان سکتا ہوں کے لئے ایک نعمت سمجھا۔ ہمیں پٹیاں، زخم صاف کرنے کی دوائیں وغیرہ دے کر عارضی ہسپتال میں لے گئے۔ زولو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ گورے سپاہی ہسپتال کے باہر کھڑے جنگلے کی سلاخوں سے جھانکا کرتے اور ہمیں سمجھاتے کہ ان زخمیوں کی دیکھ بھال نہ کرو۔ جب ہم ان کی باتوں پر توجہ نہ کرتے تو وہ جھلا کر زولو قیدیوں کو بری بری گالیاں دینے لگتے۔

رفتہ رفتہ ان گوروں سے مجھ سے میل جول بڑھ گیا اور انہوں نے میرے کام میں مداخلت ترک کر دی۔ کمانڈنگ افسروں میں کرنل اسپارکس اور کرنل وائلی بھی تھے جنھوں نے ۱۸۹۶ء میں بڑی سختی سے میری مخالفت کی تھی۔ انھیں میرے اس طرز عمل سے بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے خاص طور پر مجھے بلا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے مجھے جرنل مکنزی سے ملایا۔ یہ لوگ پیشہ ور سپاہی نہیں تھے۔ کرنل وائلی ڈربن کے ایک نامی وکیل تھے۔ کرنل اسپارکس ڈربن کے ایک مشہور گوشت کے کارخانے کے مالک تھے۔ جرنل مکنزی کے نٹال میں بہت بڑے فارم تھے۔ یہ سب حضرات والنٹیر تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے فوجی تربیت اور تجربہ حاصل کیا تھا۔

جو زخمی ہماری نگرانی میں تھے وہ لڑائی میں مجروح نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض مشتبہ سمجھ کر گرفتار کر لئے گئے تھے اور جرنل نے ان کے کوڑے لگوائے تھے۔ کوڑوں نے ان کے بدن میں گہرے زخم ڈال دئے تھے اور مرہم پٹی نہ ہونے کے سبب سے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ باقی وفادار زولو تھے۔ انھیں "دشمن" سے ممتاز کرنے کے لئے خاص بلّے دیدئے گئے تھے پھر بھی گوروں نے غلطی سے ان پر بندوقیں چلا دی تھیں۔

اس کے علاوہ مجھے گوروں کے ہسپتال میں کمپونڈری بھی کرنا پڑتی تھی۔ اس میں

مجھے کوئی دقت نہ تھی کیونکہ میں ڈاکٹر توبتھ کے چھوٹے سے ہسپتال میں ایک سال تک کام کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں مجھ سے بہت سے فرنگیوں سے ملاقات ہو گئی۔

ہم لوگ ایک تیز رَو دستے کے ساتھ کر دیے گئے۔ اسے یہ حکم تھا کہ جس جگہ سے خطرے کی خبر آئے وہاں فوراً پہنچ جائے۔ اس میں زیادہ تر پیدل سپاہی تھے جو جلدی کے خیال سے گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ جیسے ہی ہمارا کیمپ روانہ ہوتا تھا ہمیں بھی ڈولیاں کندھوں پر رکھ کر پیچھے پیچھے چلنا پڑتا تھا۔ دو تین بار تو ہمیں دن میں چالیس چالیس میل چلنے کا اتفاق ہوا۔ مگر شکر ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے خلقِ خدا کی خدمت ہی کرتے تھے۔ ہمارا کام یہ تھا کہ جو وفادار زَولو غلطی سے زخمی کر دیے جائیں اُنھیں ڈولی میں اُٹھا کر لے جائیں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔

—— (۰) ——

پچیسواں باب

احتسابِ نفس

زولو بغاوت کے سلسلے میں بہت نئے نئے تجربے ہوئے۔ جنگِ بوئر میں مجھے لڑائی کے خوفناک نتائج کا اتنا اندازہ نہیں ہوا تھا جتنا اس بغاوت میں ہوا۔ یہ نام کو لڑائی تھی مگر اصل میں آدمیوں کا شکار تھا۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ بہت سے انگریز جن سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا، یہی کہتے تھے۔ روز صبح اٹھ کر بے گناہوں کی جھونپڑیوں پر رائفلوں کی باڑھ چلتے سننا، جیسے شب برات میں پٹاخے چھوٹتے ہوں، ہمارے لئے ایک عذاب تھا، مگر میں مجبوراً یہ زہر کے گھونٹ پیتا تھا۔ اس خیال سے تسکین ہو جاتی تھی کہ ہماری کور کا کام صرف زولو زخمیوں کی خدمت کرنا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ہم لوگ نہ ہوتے تو غریب زولو کس مپرسی میں پڑے رہتے۔

لیکن اور بہت سی چیزیں تھیں جن سے غور و فکر اور مشاہدۂ نفس کی تحریک ہوتی تھی۔ ملک کا یہ حصہ کم کم آباد تھا۔ سیدھی سادی اور "وحشی" زولو قوم کی بستیاں پہاڑوں اور وادیوں میں دور دور پر واقع تھیں۔ جب میں زخمیوں کو لے کر یا خالی ان سنسان رستوں سے جہاں ہُو کا عالم رہتا تھا گذرتا تو اکثر گہرے خیالات میں ڈوب جاتا۔

میں نے "برہمچاریہ" کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور میرا عقیدہ اور بھی گہرا ہو گیا۔ میں نے اپنے رفیقوں سے اس بارے میں گفتگو کی۔ مجھے اس وقت تک یہ احساس نہ تھا کہ "برہمچاریہ" معرفتِ نفس کے لئے کس قدر ناگزیر چیز ہے مگر اتنا جانتا تھا کہ جو شخص دل و جان سے اپنے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے اس کا کام بغیر اسکے

کسی طرح نہیں چل سکتا۔ میں نے دیکھا کہ جس قسم کی خدمت میں کر رہا ہوں اس کے موقعے اکثر پیش آئیں گے اور اگر میں گرہست کی زندگی میں مگن رہا تو اپنے فرض سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا۔

مختصر یہ ہے کہ میں جسم اور روح دونوں کی بندگی ساتھ ساتھ نہیں کر سکتا تھا مثلاً اس زمانے میں اگر میری بیوی حاملہ ہوتیں تو میں اس معرکے میں شریک نہ ہو سکتا بغیر "برہمچاریہ" کے خاندان کی خدمت کا قومی خدمت کے ساتھ جمع ہونا محال تھا۔ "برہمچاریہ" کے ہوتے ہوئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔

ان خیالات نے مجھے قطعی عہد کرنے کے لئے بیتاب کر دیا۔ اس عہد کے تصور سے روح کو ایک طرح کی بالیدگی محسوس ہونے لگی تخیل کی بلند پروازی خدمت کی نامحدود فضا کے منظر دکھانے لگی۔

ادھر میں اس جسمانی اور ذہنی مشقت میں مبتلا تھا ادھر یہ خبر آئی کہ بغاوت کے فرو کرنے کا کام قریب قریب ختم ہو گیا اور ہم لوگ بہت جلد سبکدوش کر دئے جائیں گے۔ اس کے دو تین دن بعد سبکدوشی کا حکم بھی پہنچ گیا اور ہم سب گھر واپس آ گئے۔

کچھ عرصے کے بعد میرے نام گورنر کا خط آیا جس میں انہوں نے ایمبولینس کور کی خدمات کا شکریہ ادا کیا تھا۔

فینکس پہنچ کر میں نے بڑے شوق سے چھگن لال، مگن لال، ویسٹ اور دوسرے دوستوں سے "برہمچاریہ" کا ذکر چھیڑا۔ انھیں یہ بات پسند آئی اور انہوں نے تسلیم کر لیا کہ عہد کرنا ضروری ہے مگر اس کی مشکلات کا بھی ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے ہمت کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا جن میں سے بعض کو کامیابی ہوئی۔

میں نے ہر چہ بادا باد کہہ کر عمر بھر کے لئے "برہمچاریہ" کا عہد کر لیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت تک اس راہ کی صعوبتوں سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ آج تک مجھے

اس میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مگر اس کی خوبیاں بھی مجھ پر روز بروز روشن ہوتی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک بغیر "برہمچاریہ" کے زندگی بے لطف ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان حیوان بن جاتا ہے۔ بہائم اپنی فطرت کے تقاضے سے ضبطِ نفس پر قادر نہیں۔ انسان کا جوہر اور انسانیت کا معیار یہی ضبطِ نفس ہے۔ ہماری مذہبی کتابوں میں ضبطِ نفس کی جتنی تعریف کی گئی ہے وہ مجھے پہلے مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھی مگر اب روز بروز یہ حقیقت کھلتی جاتی ہے کہ یہ تعلیم حرف بہ حرف صحیح اور تجربے پر مبنی ہے۔

میں نے دیکھا کہ "برہمچاریہ" جس میں عجیب و غریب قوتیں پنہاں ہیں، کچھ سہل نہیں ہے۔ اسے محض جسم تک محدود سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ اس کی ابتدا بیشک جسمانی خواہشات کے ضبط سے ہوتی ہے مگر انتہا یہ نہیں ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ ناپاک خواہش دل میں نہ آنے پائے۔ سچے برہمچاری کو خواب میں بھی جسمانی لذت کا خیال نہیں آتا۔ جب تک انسان اس درجے پر نہ پہنچ جائے وہ منزل سے بہت دور ہے۔

مجھے تو جسمانی "برہمچاریہ" میں بھی بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے ایک حد تک اپنے اوپر بھروسا ہے۔ مگر خیال پر پورا قابو، جو "برہمچاریہ" کی جان ہے اب تک حاصل نہیں ہوا۔ میری طرف سے ارادے یا کوشش کی کمی نہیں مگر یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ناپاک خواہشیں کس رُخ سے دبے پاؤں آکر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انسان کے پاس وہ چیز موجود ہے جس سے بُری خواہشوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی تلاش ہر شخص کو اپنے طور پر کرنا ہے۔ رشیوں اور عارفوں نے اپنی وارداتِ قلب کے تذکرے ہماری ہدایت کے لیے چھوڑے ہیں لیکن کوئی ایسی تدبیر نہیں بتائی جو ہر موقعے پر کام دے اور ہر شخص کے کام آئے۔ روحانی کمال یا عصمت بغیر توفیقِ ایزدی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے طالبانِ حق ہمیں "رام نام" جیسے منتر بتا گئے ہیں جن میں انکی پاک نفسی اور

پاکبازی کا رنگ جھلکتا ہے۔ کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پورا قابو حاصل ہونا محال ہے۔ ہر مذہبی صحیفہ یہی تعلیم دیتا ہے اور مجھے کامل "برہمچاریہ" کی کوشش میں ہر لحظہ اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

اس جدوجہد اور کشمکش کا ذکر آئندہ بابوں میں آئے گا۔ یہاں میں صرف یہ کہے دیتا ہوں کہ میں نے "برہمچاریہ" کی ابتدا کیونکر کی۔ پہلے پہل کے جوش میں مجھے اس کی پابندی بالکل سہل معلوم ہوئی۔ سب سے پہلی تبدیلی میں نے اپنے طرز زندگی میں یہ کی کہ جس پلنگ پر میری بیوی سوتی تھیں اس پر سونا اور اُن سے تنہائی میں ملنا جلنا ترک کر دیا۔

غرض جو "برہمچاریہ" میں ۱۹۰۰ء سے جبراً قہراً برت رہا تھا اُس پر ۱۹۰۶ء کے وسط میں دائمی عہد کی مہر لگ گئی۔

(۰)

چھبیسواں باب

ستیاگرہ کا آغاز

جوہانسبرگ میں حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر رہے تھے کہ میرا یہ تزکیۂ نفس گویا ستیاگرہ کا دیباچہ تھا۔ مجھے اب یہ احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی کے خاص خاص واقعات جن میں سب سے اہم "برہمچاریہ" کا عہد تھا مجھے در پردہ اس چیز کے لئے تیار کر رہے تھے۔

ستیاگرہ کی تحریک پہلے شروع ہوئی اور یہ نام بعد میں رکھا گیا۔ جب یہ اصول دریافت ہوا تو مجھے اس کے لئے کوئی نام نہیں ملتا تھا ہم لوگ گجراتی میں بھی اس کے لئے انگریزی لفظ Passive resistance (مقاومتِ مجہول) استعمال کرتے تھے۔

جب مجھے یوروپیوں کے ایک جلسے میں یہ معلوم ہوا کہ Passive resistance کے معنی بہت محدود ہیں، یہ کمزوروں کی تلوار سمجھی جاتی ہے، اس میں نفرت کا مفہوم بھی آ سکتا ہے اور تشدد کی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے تو مجھے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت پڑی کہ ہندوستانی تحریک ان سب چیزوں سے بری ہے اور اس کی ماہیت بالکل دوسری ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جد و جہد کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی نیا لفظ تلاش کرنا ضروری ہے۔

میں نے لاکھ کوشش کی مگر مجھے کوئی نیا نام نہیں سوجھا۔ اس لئے میں نے "انڈین اوپینین" میں اعلان کیا کہ اس کے پڑھنے والوں میں جو شخص سب سے اچھا نام تجویز کرے گا اُسے ایک چھوٹا سا انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ مگن لال گاندھی نے "ست آگرہ" (ست = حق، آگرہ = ثبات) کا لفظ وضع کیا۔ مگر میں نے سہولت کے خیال سے اسے بدل کر ستیاگرہ کر دیا۔ اس وقت سے گجراتی میں اس تحریک کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس معرکے کی تاریخ اصل میں سرگذشت ہے میری بقیہ زندگی کی جو میں نے جنوبی افریقہ میں گذاری خصوصاً ان تجربوں کی جو میں نے اس عرصے میں تلاش حق میں کیے۔ اس تاریخ کا بہت بڑا حصہ میں نے یراودا کی جیل میں لکھا اور جو کچھ باقی رہ گیا اُسے رہا ہونے کے بعد پورا کر دیا۔ پہلے یہ نوجیون میں نکلتی رہی پھر کتاب کی شکل میں شائع ہو گئی۔ والجی دیسائی اس کا ترجمہ Current Thought میں چھاپنے کے لیے کر رہے ہیں۔ مگر میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ انگریزی ترجمہ[1] بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع ہو جائے تاکہ جن لوگوں کو شوق ہو وہ میرے اہم ترین تجربوں سے جو میں نے جنوبی افریقہ میں کیے تھے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ جن ناظرین کی نظر سے یہ کتاب نہ گذری ہو انھیں میں مشورہ دیتا ہوں کہ اسے ضرور پڑھیں۔ میں جن واقعات کا ذکر اس میں کر چکا ہوں انھیں یہاں نہیں دہراؤں گا مگر آئندہ بیس پچیس بابوں میں اپنی جنوبی افریقہ کی زندگی کے چند ذاتی واقعات بیان کروں گا جو اس تاریخ میں ترک کر دیے گئے ہیں اور اس کے بعد اپنے ہندستان کے تجربے لکھوں گا۔ اس لیے جو لوگ ان تجربوں کا مطالعہ صحیح تاریخی ترتیب کے ساتھ کرنا چاہیں انھیں مناسب ہے کہ جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھیں۔

---

[1] اس عرصے میں یہ ترجمہ ایس گنیشن نے، ٹرپلیکین، مدراس سے History of Satyagraha in South Africa کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

ستائیسواں باب

غذائیات کے مزید تجربے

میری دلی خواہش تھی کہ خیال، قول اور عمل میں "برہمچاریہ" برتوں بیں یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ "ستیاگرہ" کی جدوجہد میں صرف کروں اور اس تیاری کے لئے ضبطِ نفس بہت ضروری تھا۔ اس لئے مجھے غذا کے معاملے میں اور تبدیلیاں کرنا پڑیں اور مزید احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس سے پہلے جتنی تبدیلیاں ہوئیں وہ زیادہ تر صحت کے خیال سے ہوئی تھیں مگر اب جو تجربے کئے جانے والے تھے ان میں مذہبی مقصد مدنظر تھا۔

اب میری زندگی میں فاقہ اور غذا کی احتیاط نے خاص اہمیت حاصل کرلی۔ انسان کے دل میں اکثر ہوائے نفس اور زبان کی چاٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ بھی تھی۔ مجھے اپنی شہوانی خواہش اور اپنے ذائقے پر قابو پانے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں اور اب بھی میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے ان دونوں چیزوں کو بالکل مغلوب کرلیا ہے۔ میں اپنے نزدیک بہت زیادہ کھاتا ہوں۔ میرے دوست سمجھتے ہیں کہ میں ضبطِ نفس سے کام لیتا ہوں لیکن میرا یہ خیال نہیں ہے۔ اگر میں اتنی احتیاط بھی نہ کرتا تو میری زندگی جانوروں سے بدتر ہوتی اور اب تک ٹھکانے لگ چکا ہوتا۔ بہرحال چونکہ مجھے اپنے نقائص اچھی طرح معلوم تھے میں نے ان سے نجات پانے کی پوری کوشش کی اور اسی کی برکت ہے کہ میں اپنے جسم کو اتنے دن گھسیٹتا رہا اور تھوڑا بہت کام بھی کرلے گیا۔

مجھے اپنی کمزوری کا احساس تو تھا ہی اتفاق سے کچھ ہم خیال بھی مل گئے اور میں نے یہ معمول کر لیا کہ اکادشی کے دن صرف پھل یا خشک میوہ کھاتا تھا یا بالکل فاقہ کرتا تھا۔ جنم اشٹمی اور دوسری تعطیلوں میں بھی یہی التزام تھا۔

میں نے میوے پر بسر کرنے کی عادت ڈالنا شروع کی مگر ضبط نفس کے اعتبار سے مجھے غلّے اور میوے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔ میوہ خوری میں غذا کی مقدار تو کم ہوگئی مگر ذائقے کی لذت اتنی ہی رہی بلکہ عادت پڑنے کے بعد اور بڑھ گئی۔ تہوار کے دن فاقہ کرنا یا صرف ایک وقت کھانا زیادہ مفید معلوم ہوا اس لئے میں نے اسی کو اختیار کیا۔ اور اگر کفّارے وغیرہ کا کوئی موقع آتا تھا تو بھی میں فاقہ ہی کرتا تھا۔

مگر اس میں بھی میں نے دیکھا کہ جسم کی رطوبت کم ہو جانے کے سبب سے کھانے میں زیادہ مزا آنے لگا اور بھوک بڑھ گئی۔ مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ فاقے سے ضبط نفس اور لذت نفس دونوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ خود میرے اور دوسرے لوگوں کے تجربے اس حیرت انگیز حقیقت کی شہادت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنا جسم بھی بنانا چاہتا تھا مگر اس وقت تو مجھے زیادہ تر ذائقے کو قابو میں لانے کی فکر تھی اس لئے میں برابر غذائیں بدلتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ مقدار میں بھی کمی کرتا رہا۔ مگر ذائقہ بلا بن کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ جب میں ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کرتا تھا تو اس میں اور زیادہ مزا آتا تھا۔

ان تجربوں میں میرے کئی ساتھی تھے جن میں ہرمان کیلن باخ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں نے "جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ" میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اُسے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ مسٹر کیلن باخ فاقوں میں اور غذا کے تجربوں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیتے تھے۔ ستیاگرہ کے شباب کے زمانے میں میں انھیں کے گھر پر رہتا تھا۔ ہم دونوں اپنی غذا کی تبدیلیوں کے بارے میں گفتگو کیا کرتے اور نئی

غذاؤں کے تصور سے اور زیادہ خوش ہوتے تھے۔ ان دنوں یہ باتیں دل کو بھلی لگتی تھیں اور ان میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔ مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ غذا کے معاملے میں ذائقے پر زور دینا بڑی غلطی ہے۔ غذا کا مقصد کام و دہن کی لذت نہیں بلکہ جسم کی بقا ہے۔ اگر ہمارے کُل حواس ہمیشہ جسم کی اور جسم کے واسطے سے روح کی خدمت میں مصروف رہیں تو ان کی مخصوص لذت باقی نہیں رہتی اور وہ منشا جس کے لئے فطرت نے انھیں خلق کیا ہے پورا ہو جاتا ہے۔

فطرت سے یہ ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔ مگر بڑا افسوس ہے کہ آج کل اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمیں ذرا شرم نہیں آتی کہ ہم جسم فانی کو سنوارنے اور اس کی زندگی چند لمحے بڑھانے کے لئے ہزاروں جانوں کا خون کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہماری جسمانی اور روحانی ہلاکت ہے۔ ایک بیماری کو دور کرنے کے لئے ہم سیکڑوں نئی بیماریاں مول لیتے ہیں۔ حسّی لذت کا لطف اُٹھانے کی فکر میں ایک دن لطف اُٹھانے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ تماشے روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن جو دیکھنا نہ چاہے اُس سے بڑھ کر اندھا کوئی نہیں۔ غذائیاتی تجربوں کا مقصد اور اصول بتانے کے بعد اب میں ان تجربوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کروں گا۔

اٹھائیسواں باب

کستوری بائی کی ہمت

میری بیوی اپنی زندگی میں تین بار اتنی سخت بیمار ہوئیں کہ مرتے مرتے بچیں۔ ہر بار انھیں گھریلو دواؤں سے فائدہ ہوا۔ پہلا موقع وہ تھا جب ستیاگرہ شروع ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ ان پر مرض کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ خون نکلنے سے بہت کمزور ہو گئیں۔ ایک ڈاکٹر دوست نے اپریشن کی رائے دی جس پر وہ کچھ تامل کے بعد راضی ہو گئیں۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں اس لئے ڈاکٹر کو بے کلوروفارم سنگھائے اپریشن کرنا پڑا۔ اپریشن تو کامیاب ہوا مگر انھیں بڑی سخت اذیت ہوئی۔ انہوں نے ان تکلیفوں کو جس استقلال سے برداشت کیا اُسے دیکھکر حیرت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی نے، جو تیماردار تھیں، اُن کی بڑی خدمت کی۔ یہ ڈربن کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے جوہانسبرگ جانے کی اجازت دیدی اور کہا کہ آپ مریضہ کی طرف سے بالکل اندیشہ نہ کیجیے۔

مگر چند روز میں میرے پاس یہ خط پہنچا کہ کستوری بائی کی حالت اور خراب ہو گئی ہے، وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ نہیں سکتیں، اور ایک بار بیہوش بھی ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ مریضہ کو بغیر میری اجازت کے شراب یا گوشت نہیں دے سکتا۔ اس لئے اُس نے مجھے جوہانسبرگ میں ٹیلیفون کیا اور گائے کے گوشت کی یخنی دینے کی اجازت مانگی۔ میں نے جواب دیا کہ "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا اگر میری بیوی اس قابل ہوں کہ اپنی رائے ظاہر کر سکیں تو ان سے پوچھئے انھیں اختیار ہے جیسا چاہیں کریں"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا "میں اس معاملہ میں مریضہ سے ہرگز رائے نہیں لوں گا۔ آپ کو خود یہاں

آنا چاہیئے۔ اگر آپ مجھے یہ آزادی نہیں دیتے کہ جو غذا چاہوں تجویز کروں تو میں آپ کی بیوی کی زندگی کا ذمہ دار نہیں۔"

میں اُسی دن ڈربن پہنچا اور ڈاکٹر سے ملا۔ انہوں نے سہولت سے مجھے یہ افسوسناک خبر سنائی "میں تمہیں ٹیلیفون کرنے سے پہلے ہی مسز گاندھی کو یخنی دے چکا تھا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب، میرے نزدیک تو یہ دغابازی ہوئی۔"

اُس نے بہت استقلال سے جواب دیا "مریض کے لئے دوا یا غذا تجویز کرنے میں دغابازی کا کوئی سوال نہیں بلکہ ہمیں تو اگر مریضوں کی جان بچانے کے لئے انہیں یا اُن کے رشتہ داروں کو دھوکا دینا پڑے تو ہم اِسے نیکی سمجھتے ہیں۔"

مجھے بہت دُکھ ہوا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ ڈاکٹر بڑا اچھا آدمی تھا اور میرا دوست تھا۔ اُس نے اور اس کی بیوی نے مجھ پر بڑا احسان کیا تھا لیکن مجھ میں اس کے طبی اخلاق کو برداشت کرنے کی تاب نہ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب، اب یہ بتائیے کہ آیندہ آپ کیا صورت اختیار کریں گے۔ مجھے اپنی بیوی کی موت گوارا ہے مگر انھیں گوشت دینا گوارا نہیں۔ ہاں اگر وہ خود چاہیں تو اور بات ہے۔"

"آپ کو اپنا فلسفہ مبارک۔ میں نے تو آپ سے کہہ دیا کہ جب تک آپ کی بیوی میرے علاج میں ہیں مجھے یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ انھیں جو جی چاہے دوں۔ اگر آپکو یہ منظور نہیں تو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ آپ انھیں یہاں سے لیجائیے۔ میں انھیں اپنے گھر میں دم توڑتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا آپ کا یہ منشا ہے کہ میں انھیں فوراً لے جاؤں؟"

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ انھیں لے جائیے۔ میں تو علاج میں پوری آزادی چاہتا ہوں۔ آپ اس پر راضی ہیں تو میں اور میری بیوی دونوں ان کی خدمت کرنے

میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔ آپ اطمینان سے اپنے کام پر جائیے مطلق اندیشہ نہ کیجیے لیکن اگر یہ سیدھی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو گویا آپ خود مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ آپ کی بیوی کے علاج سے دست بردار ہو جاؤں۔"

مجھے خیال ہے کہ میرا ایک لڑکا میرے ساتھ تھا۔ وہ میری رائے سے بالکل متفق تھا کہ اُس کی ماں کو یخنی نہ دی جائے۔ اس کے بعد میں نے خود کستوری بائی سے گفتگو کی۔ سچ پوچھیے تو وہ اتنی کمزور تھیں کہ انھیں اس معاملہ میں زحمت دینا مناسب نہ تھا لیکن میں نے اسے اپنا ناگوار فرض سمجھا اور دل کڑا کر کے انھیں اپنی اور ڈاکٹر کی گفتگو سنائی۔ انھوں نے عزم و استقلال کے ساتھ جواب دیا "میں یخنی نہیں پیوں گی۔ دنیا میں انسان کا جنم بار بار نصیب نہیں ہوتا۔ مجھے آپ کی گود میں مرجانا قبول ہے مگر اپنے جسم کو ان ناپاک چیزوں سے آلودہ کرنا قبول نہیں۔"

میں نے انھیں بہت سمجھایا کہ اس معاملے میں میری تقلید آپ پر لازم نہیں اور بہت سے ہندو دوستوں کی مثالیں دیں جو گوشت اور شراب دوا کے طور پر استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے مگر ان کے قدم کو لغزش نہ ہوئی۔ انھوں نے کہا "نہیں صاحب۔ خدا کے لئے مجھے اسی دم یہاں سے لے چلیے۔"

مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ کچھ دیر پس و پیش کرنے کے بعد میں نے انھیں لیجانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے ارادے سے مطلع کیا۔ وہ غصے میں چلا اُٹھے "اس بے دردی کی کوئی انتہا ہے؟ ان بیچاری کی تو یہ حالت ہے اور آپ نے ان سے اس معاملہ کا ذکر کر دیا۔ آپ کو شرم بھی نہیں آئی۔ میں آپ سے کہے دیتا ہوں آپ کی بیوی میں ہرگز اتنی طاقت نہیں کہ سفر کر سکیں۔ وہ ذرا سی حرکت بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ رستے ہی میں ان کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ اب بھی اس پر مصر ہیں تو آپ کو اختیار ہے۔ اگر آپ انھیں یخنی دینے پر راضی

نہیں ہوتے تو میں انھیں ایک دن بھی اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ میں اس خطرے کی ذمہ داری اپنے سر کیسے لے لوں؟"

اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ مریضہ کو لے کر فوراً روانہ ہو جائیں۔ اُس وقت بوندیں پڑ رہی تھیں اور اسٹیشن کسی قدر دور تھا۔ ہمیں ڈربن سے فینکس اسٹیشن تک ریل میں جانا تھا اور وہاں سے ہماری بستی سڑک کے رستے سے ڈھائی میل تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہم بڑے خطرے کا کام کر رہا تھا مگر ہم خدا کے بھروسے پر چل کھڑا ہوا۔ میں نے ایک شخص کو پہلے سے فینکس روانہ کر دیا اور ویسٹ کو کہلا بھیجا کہ ایک گرم دودھ کی بوتل، ایک گرم پانی کی بوتل، ایک بیمار ڈولی اور چھ آدمی اُسے اُٹھانے کے لئے لے کر اسٹیشن پہنچ جائیں۔ پھر ہم لوگ مریضہ کو اس خطرناک حالت میں ایک رکشا میں بٹھا کر لے چلے کہ سب سے پہلی گاڑی سے فینکس روانہ ہو جائیں۔

مجھے کستوری بائی کی دلدہی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی بلکہ اُلٹی وہ مجھے تسکین دیتی رہیں "میں اچھی طرح پہنچ جاؤں گی۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے۔"

انھیں مدت سے غذا نہیں ملی تھی اس لئے ان میں ہڈی چمڑے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم بہت بڑا تھا اور رکشا اندر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے گاڑی تک پہنچنے کے لئے کچھ دور پیدل چلنا تھا۔ میں نے مریضہ کو گود میں اُٹھا کر ریل کے ڈبے میں پہونچایا۔ فینکس کے اسٹیشن سے ہم انھیں بیمار ڈولی میں لے گئے اور گھر پہنچ کر پانی کا علاج شروع ہوا جس سے ان کے بدن میں رفتہ رفتہ تھوڑی بہت طاقت آئی۔

فینکس پہنچنے کے دوسرے تیسرے دن ہمارے یہاں ایک سوامی جی آئے۔ اُنھوں نے سنا تھا کہ ہم نے کس عزم واستقلال سے ڈاکٹر کا مشورہ رد کر دیا اور وہ بزرگانہ شفقت سے ہمیں سمجھانے کے لئے آئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اُس وقت

میرا منجھلا لڑکا منی لال اور منجھلا رام داس بھی موجود تھا۔ سوامی جی نے اُپدیش دیا کہ دھرم کی رو سے گوشت کھانے میں کوئی ہرج نہیں اور منو کے اقوال سند میں پیش کئے۔ مجھے ان کا میری بیوی کے سامنے یہ بحث چھیڑنا ناگوار ہوا لیکن میں اخلاقاً خاموش رہا۔ میں منو سمرتی کے ان مقامات سے واقف تھا لیکن میرے عقیدے پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اول تو مجھے معلوم تھا کہ بعض لوگ ان عبارتوں کو الحاقی سمجھتے ہیں دوسرے میرے جو خیالات نباتاتی مشرب کے متعلق تھے وہ مذہبی کتابوں کے پابند نہ تھے۔ کستوری بائی کا عقیدہ بھی بڑا راسخ تھا۔ وہ مذہبی کتابوں کے سمجھنے سے معذور تھیں مگر ان کے لئے وہ دھرم جو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا تھا کافی تھا۔ بچے بھی اپنے باپ کا کلمہ پڑھتے تھے اس لئے ان پر سوامی جی کے اپدیش کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کستوری بائی نے یہ کہہ کر بحث کا خاتمہ کر دیا "سوامی جی آپ کچھ بھی کہیں مجھے تو یخنی پی کر اچھا ہونا قبول نہیں۔ خدا کے لئے آپ مجھے دق نہ کیجئے۔ آپ کا جی چاہے تو میرے شوہر اور بچوں سے بحث کیجئے۔ مگر مجھے جو فیصلہ کرنا تھا میں کر چکی"۔

(۰)

انتیسواں باب

گھر کے اندر ستیاگرہ

مجھے جیل جانے کا اتفاق پہلے پہل ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قیدیوں کے لئے جو ضابطے بنائے گئے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ہر "برہمچاری" یعنی ضبط نفس کے طالب کو اپنی خوشی سے اختیار کرنا چاہئیں مثلاً یہ کہ شام کا کھانا غروب آفتاب سے پہلے کھا لیا جائے۔ ہندوستانی اور افریقی قیدیوں کو چائے اور کافی کی ممانعت تھی۔ کھانے میں وہ چاہیں تو اوپر سے نمک ڈال سکتے تھے مگر محض ذائقے کی خاطر انھیں کوئی چیز نہیں دی جاتی تھی۔ میں نے جیل کے میڈیکل افسر سے یہ درخواست کی کہ ہمیں گرم مسالہ وغیرہ دیا جائے اور نمک کھانا پکتے میں پڑ جایا کرے۔ اس نے جواب دیا "آپ لوگ یہاں ذائقے کا لطف اُٹھانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ صحت کے اعتبار سے گرم مسالے کی کوئی ضرورت نہیں اور نمک چاہے پکتے میں ڈالا جائے یا اوپر سے ایک ہی بات ہے۔"

آگے چل کر بڑی مشکلوں سے یہ بندشیں کچھ کم ہوئیں مگر اصل میں یہ دونوں قاعدے صحت کے لئے بہت مفید تھے۔ جو سختیاں کسی بیرونی قوت کی طرف سے عائد کی جائیں ان کی پابندی میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے لیکن اگر انھیں کو انسان اپنے اوپر خود عائد کرے تو ان کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے جیل سے رہا ہوتے ہی میں نے ان دونوں قاعدوں کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ جہاں تک ممکن تھا میں چائے کے استعمال سے پرہیز کرتا تھا اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے کھا لیتا تھا۔

اب ان دونوں باتوں کی پابندی میں مطلق دقت نہیں ہوتی۔
مگر ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے نمک بالکل ترک کر دینا پڑا اور یہ صورت متواتر دس سال تک باقی رہی۔ میں نے نباتاتی مشرب کی بعض کتابوں میں پڑھا تھا کہ نمک غذا کا کوئی ضروری جزو نہیں ہے بلکہ بے نمک کی غذا صحت کے لئے بہتر ہے۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ برہمچاری کے لئے بھی بے نمک کی غذا مفید ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ جو لوگ کمزور ہیں انھیں ہر قسم کی دال سے پرہیز کرنا چاہیئے اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی تھی۔ مجھے دال کا بہت شوق تھا۔
اتفاق سے کستوری بائی کچھ دن کے افاقے کے بعد پھر گر گئیں اور خون پھر آنے لگا۔ محض پانی کے علاج سے کام چلتا نظر نہیں آتا تھا۔ انھیں میری تدبیروں پر عقیدہ نہیں تھا مگر انہوں نے ان پر عمل کرنے میں کبھی عذر نہیں کیا اور بیرونی علاج کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ جب میری کوئی تدبیر نہیں چلی تو میں نے ان سے بڑی منت سے کہا کہ نمک اور دال کھانا چھوڑ دیجئے۔ میں نے انھیں بہت کچھ سمجھایا اور بڑی بڑی دلیلیں پیش کیں مگر وہ کسی طرح نہ مانیں۔ آخر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو ان چیزوں کی ممانعت کی جاتی تو آپ سے بھی نہ چھوٹ سکتیں۔ مجھے اس بات سے تکلیف ہوئی مگر اسی کے ساتھ یہ خوشی تھی کہ مجھے اپنی محبت کے اظہار کا موقع مل گیا۔ میں نے ان سے کہا "آپ کا خیال غلط ہے۔ اگر ڈاکٹر مجھے مشورہ دیتا کہ ان چیزوں کو یا کسی اور چیز کو چھوڑ دو تو میں بے تامّل چھوڑ دیتا۔ اچھا یوں سہی میں بغیر طبی مشورہ کے خود ہی نمک اور دال ایک سال کے لئے چھوڑتا ہوں چاہے آپ چھوڑیں یا نہ چھوڑیں"۔
ان کے دل پر بڑا دھچکا لگا اور وہ دکھ بھری آواز میں چلا اٹھیں "خدا کے لئے میری خطا معاف کیجئے۔ میں آپ کی طبیعت سے واقف ہوں اس لئے مجھے مناسب نہ تھا کہ آپ کو یوں غصہ دلاتی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان چیزوں کو چھوڑ دوں گی

مگر آپ للّٰہ اپنا عہد واپس لے لیجئے۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔"

"آپ کے لئے ان چیزوں کا ترک کرنا بہت مفید ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی صحت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ رہا میں سو میں ایک ایسے عہد کو جو میں نے سمجھ بوجھ کر کیا ہے واپس نہیں لے سکتا۔ اور اس میں میری بھلائی بھی ہے کیونکہ ضبطِ نفس، خواہ کسی نیت سے کیا جائے انسان کے لئے ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ اس لئے آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ میرے لئے یہ عہد اخلاقی امتحان کا کام دے گا اور آپ کو بھی میرے سبب سے سہارا رہے گا۔"

وہ میری طرف سے مایوس ہو گئیں۔ اُنہوں نے کہا "آپ بڑے ضدی ہیں کوئی سر پٹک کے مر جائے مگر آپ نہ مانیں گے" اور رو رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

میں اس واقعے کو ستیاگرہ کی ایک مثال سمجھتا ہوں اور یہ ان باتوں میں سے ہے جنھیں یاد کر کے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

اس کے بعد کستوری بائی کی طبیعت روز بروز سنبھلنے لگی۔ اب خدا جانے یہ دال اور مسالے کے ترک اور غذا کی اور تبدیلیوں کا کرشمہ تھا، یا دوسری چیزوں میں زیادہ احتیاط کرنے کا اثر تھا یا اُس بالیدگی کی برکت تھی جو مریضہ کی طبیعت کو اس عہد سے حاصل ہوئی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ انھیں بہت جلد صحت ہونے لگی، خون بالکل بند ہو گیا اور میری شہرت عطائی کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی۔

مجھے بھی اس نئے ترکِ لذات سے فائدہ ہوا۔ میں نے جو چیزیں چھوڑی تھیں ان کی کبھی خواہش نہیں ہوئی ایک سال بات کی بات میں گذر گیا اور مجھے اپنے حواس پر پہلے سے زیادہ قابو حاصل ہو گیا۔ اس تجربے سے ضبطِ نفس کا رجحان اور بڑھ گیا اور میں نے ان چیزوں کو ہندوستان آنے کے بہت دن بعد تک استعمال نہیں کیا۔ اس عرصے میں صرف ایک بار ۱۹۱۴ء میں لندن کے قیام کے زمانے میں

ان دونوں چیزوں کے استعمال کا اتفاق ہوا۔ یہ میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ یہ کونسا موقع تھا اور ہندوستان پہنچنے کے بعد میں نے ان دونوں کا استعمال کیوں شروع کر دیا۔

میں نے جنوبی افریقہ میں بے نمک اور بے دال کی غذا کا تجربہ اپنے بہت سے رفیقوں پر کیا اور اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ طبی نقطۂ نظر سے ممکن ہے اس غذا کے متعلق اختلاف ہو مگر اخلاقی اعتبار سے مجھے پورا یقین ہے کہ ہر طرح کے ضبط نفس سے روح کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جس طرح ضبطِ نفس کرنے والے کی زندگی عیش پرست کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح ان دونوں کی غذا بھی مختلف ہونا چاہیے "برہمچاریہ" کے طالب اکثر وہ عادتیں اختیار کر کے جو عیش پرستوں کے لیے موزوں ہیں اپنا کام بگاڑ لیتے ہیں۔

(۰)

تیسواں باب

ضبطِ نفس کی کوشش

میں پچھلے باب میں کہہ چکا ہوں کہ کستوری بائی کی بیماری کے سلسلے میں مجھے اپنی غذا میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اس کے بعد "برہمچاریہ" کی خاطر مزید تبدیلیاں ہوئیں۔

سب سے پہلے میں نے دودھ کا استعمال چھوڑا۔ یہ نکتہ مجھے رائے چند بھائی نے بتایا تھا کہ دودھ سے شہوانی جذبے کو تحریک ہوتی ہے۔ نباتاتی مشرب کی کتابیں پڑھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوئی لیکن جب تک میں نے "برہمچاریہ" کا عہد نہیں کیا تھا دودھ ترک کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مجھ پر بہت دن سے یہ بات روشن ہو گئی تھی کہ دودھ جسم کی پرورش کے لیے ضروری نہیں لیکن اس کا ترک کرنا سہل نہ تھا۔ اب مجھے ضبطِ نفس کی خاطر دودھ ترک کرنے کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسی زمانے میں کچھ رسالے کلکتے کے چھپے ہوئے میری نظر سے گذرے جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ گائے بھینس پالنے والے ان بے زبان جانوروں پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے مسٹر کیلن باخ سے اس معاملے کے متعلق گفتگو کی۔

اگرچہ میں نے مسٹر کیلن باخ کا حال "جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ" میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اس کتاب میں بھی جا بجا ان کا نام لیا ہے پھر بھی یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُن کا تھوڑا سا ذکر کر دوں۔ ان سے میری ملاقات محض اتفاق سے ہو گئی۔ وہ خان صاحب کے دوست تھے۔ خان صاحب کو ان کے دل کی گہرائی میں فکرِ آخرت کی جھلک نظر آئی اس لیے انہوں نے ان کا تعارف

مجھ سے کرا دیا۔

جب میں ان سے ملا تو ان کی عشرت پسندی اور پُر تکلف زندگی دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کُرید کُرید کر مذہب کے متعلق بہت سی باتیں پوچھیں۔ اسی ضمن میں گوتم بدھ کے ترک تعلق کا ذکر بھی آیا۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں میں بڑی گہری دوستی ہو گئی یہاں تک کہ ہمارے خیالات بالکل ایک سے ہو گئے اور ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انھیں بھی اپنی زندگی میں وہی تبدیلیاں کرنا چاہئے جو میں نے کی تھیں۔

اُس وقت تک اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر بھی وہ مکان کے کرائے کے علاوہ اپنی ذات پر بارہ سو روپئے ماہوار خرچ کرتے تھے۔ اب انہوں نے اتنی سادگی اختیار کر لی کہ انکا خرچ صرف ایک سو بیس روپیہ رہ گیا۔ میں جوہانسبرگ سے اپنا گھر بار تو اُٹھا ہی چکا تھا۔ اس لئے جیل سے رہا ہو کر آیا تو انھیں کے ساتھ رہنے لگا۔ ہم دونوں خاصی جفاکشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مجھ سے ان سے دودھ کے بارے میں گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا "ہم آپ ہمیشہ دودھ کے مضر اثرات کا ذکر کیا کرتے ہیں آخر اسے چھوڑ ہی کیوں نہ دیں؟ یقیناً یہ ایسی ضروری چیز نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہ چلے۔" ان کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ میں نے بڑی گرمجوشی سے یہ تجویز قبول کی اور ہم دونوں نے اُسی وقت دودھ ترک کرنے کا عہد کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۲ء میں ٹالسٹائے فارم میں پیش آیا۔

مگر مجھے محض دودھ ترک کرنے سے تسکین نہیں ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی دن کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ صرف پھل اور خشک میوے کھایا کروں گا اور وہ بھی ایسے جو سب میں سستے ہوں۔ ہماری آرزو تھی کہ غریب سے غریب لوگ جیسی زندگی

بسر کرتے ہیں ویسی ہم بھی کریں۔

اس غذا میں آسانی بھی بہت تھی۔ پکانے کا جھگڑا ہی نہیں رہا۔ کچی مونگ پھلی، کیلے، کھجوریں، لیمو، زیتون کا تیل یہ ہماری معمولی غذا تھی۔

یہاں میں "برہمچاریہ" کے طالبوں کو ایک ضروری بات سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرے نزدیک غذا کا "برہمچاریہ" سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن اصل چیز دل ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر ناپاک خیالات دل میں رکھتا ہے اس کا تزکیۂ نفس فاقے سے نہیں ہو سکتا۔ غذا کی تبدیلیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دل کی عیاشی کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسان سختی سے اپنے نفس کا احتساب کرے اور خدا کے سامنے عاجزی سے سر جھکا دے۔ اگر اس کی توفیق شاملِ حال ہوئی تو نجات ممکن ہے۔ مگر دل و دماغ میں اور جسم میں بڑا گہرا تعلق ہے اور لذت پرستوں کا دل ہمیشہ عیش و عشرت کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔ اس رغبت کو کم کرنے کے لئے غذا کی احتیاط اور فاقہ ضروری ہے۔ لذت پرست دل حواس پر حکومت کرنے کی جگہ ان کا محکوم بن جاتا ہے اسلئے جسم کو ہمیشہ پاک صاف غیر محرک غذا کی اور کبھی کبھی فاقے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو غذا کی پابندیوں اور فاقے کو بالکل بیکار جانتے ہیں اور وہ بھی جو اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ مجھے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ضبطِ نفس کی لگن ہوتی ہے انھیں غذا کی پابندیوں اور فاقے سے بڑی مدد ملتی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بغیر ان چیزوں کے دل سے شہوانی خیالات کسی طرح دور نہیں ہوتے۔

(۰)

اکتیسواں باب

فاقہ

جن دنوں میں نے دودھ اور دال کو ترک کر کے خشک و تر میوہ کھانے کا تجربہ شروع کیا اُسی زمانے میں ضبطِ نفس کے لئے فاقے بھی کرنے لگا۔ اس میں بھی مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ شریک تھے۔ میں اس سے پہلے بھی کبھی کبھی فاقہ کرتا تھا مگر محض صحت کے خیال سے۔ یہ بات مجھے ایک دوست سے معلوم ہوئی کہ فاقہ ضبط نفس کے لئے بھی ضروری ہے۔

چونکہ میں وشنو خاندان میں پیدا ہوا تھا اور میری ماں کو طرح طرح کے کٹھن عہد کرنے کی عادت تھی اس لئے میں جب تک ہندوستان میں رہا ایکادشی اور دوسرے تہواروں میں برت رکھتا تھا۔ مگر یہ محض والدین کی تقلید اور انھیں خوش کرنے کی کوشش تھی۔

اس زمانے میں نہ مجھے فاقے کی خوبیاں معلوم تھیں اور نہ اس پر عقیدہ تھا۔ لیکن جن دوست کا میں نے ذکر کیا ہے انھیں فاقے سے فائدہ پہنچتے دیکھا تو میں نے بھی اکادشی کے دن برت رکھنا شروع کر دیا کہ اس سے "برہمچاریہ" کا عہد نباہنے میں مدد ملے گی۔ عموماً ہندو لوگ برت میں پھل اور دودھ کا استعمال جائز سمجھتے ہیں مگر ایسے برت تو میں روز ہی رکھتا تھا اس لئے اب میں پورا فاقہ کرنے لگا یعنی صرف پانی پیتا تھا، کچھ کھاتا نہ تھا۔

جب میں نے یہ تجربہ شروع کیا تو اتفاق سے ہندوؤں کے ساون اور مسلمانوں کے رمضان کا ساتھ ہو گیا تھا۔ گاندھی خاندان وشنو سماج اور شو سماج دونوں کے

تہوار منانا تھا اور وشنو مندر اور شوالے دونوں میں پوجا کرتا تھا۔ خاندان کے بعض افراد ساون کے پورے مہینے میں "پرادوشہ"[1] رکھتے تھے۔ میں نے یہ طے کیا کہ میں بھی یہی کروں گا۔

یہ تجربے اس زمانے میں کئے گئے جب میں اور مسٹر کیلن باخ اور چند ستیاگرہی خاندان اپنے بچوں سمیت ٹالسٹائے فارم میں رہتے تھے۔ ان بچوں کے لئے ہم نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان میں چار پانچ مسلمان لڑکے بھی تھے۔ میں انھیں اس کا شوق دلاتا تھا کہ اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں اور اس میں ان کی ہر طرح مدد کرتا تھا۔ خصوصاً نماز کے لئے میری بڑی تاکید تھی۔ چند پارسی اور عیسائی لڑکے بھی تھے۔ انھیں بھی میں ان کی مذہبی رسوم کی پابندی پر راغب کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اس لئے میں نے رمضان میں مسلمان لڑکوں سے روزے رکھوائے۔ میں تو خود "پرادوشہ" کا ارادہ ہی کر چکا تھا۔ ہندو، پارسی، عیسائی لڑکوں کو بھی میں نے ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ایسے عمل میں جو ضبط نفس کی خاطر کیا جائے دوسروں کے ساتھ شرکت کرنا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ فارم کے رہنے والوں میں سے بہتوں کو میری تجویز پسند آئی۔ ہندو اور پارسی لڑکے ہر ذرا ذرا سی بات میں مسلمان لڑکوں کی تقلید نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ مسلمان لڑکے روزہ افطار کرنے کے لئے غروب آفتاب کے منتظر رہتے تھے مگر دوسرے کچھ پہلے سے کھا پی لیتے تھے تاکہ اپنے مسلمان دوستوں کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلا سکیں۔ سحری میں بھی اور لڑکے مسلمان لڑکوں کے ساتھ شریک نہیں ہوتے تھے اور نہ ان کی طرح پانی ترک کرتے تھے۔

---

[1] صبح سے شام تک کا برت۔

ان تجربوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کو روزے کی خوبیوں کا احساس ہو گیا اور ان میں رفتہ رفتہ برادرانہ خلوص اور محبت کی روح سرایت کر گئی۔

ہم سب لوگ جو ٹالسٹائی کے فارم میں رہتے تھے نباتاتی تھے۔ اس کی وجہ سچ پوچھئے تو یہ تھی کہ سب لوگوں کو میرے احساسات کی رعایت منظور تھی جس کا میں تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ مسلمان لڑکوں کو رمضان میں گوشت نہ ملنے سے یقیناً تکلیف ہوئی ہو گی مگر انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بڑے شوق سے دال ترکاری کھاتے تھے۔ اور ہندو لڑکے انھیں اکثر مزے مزے کی چیزیں جو فارم کی سادہ زندگی کے مناسب حال ہوتی تھیں، پکا کر کھلایا کرتے تھے۔

میں نے بیچ میں یہ ذکر خاص کر کے چھیڑا ہے، کیونکہ ان واقعات کو جن کی یاد میرے لئے بڑی خوشگوار ہے کہیں اور بیان کرنے کا موقع نہ تھا۔ اسی ضمن میں میری یہ خصوصیت بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ مجھے جو بات اچھی معلوم ہوتی ہے اس میں اپنے رفیقوں کو بھی شریک کر لیتا ہوں۔ ان لوگوں کو فاقے کی عادت نہ تھی مگر "پرادوشہ" اور رمضان کے روزوں کی بدولت انھیں یہ محسوس ہو گیا کہ فاقہ ضبطِ نفس کے لئے کس قدر مفید ہے۔

اس طرح فارم میں خود بخود ضبطِ نفس کی فضا پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ فارم کے اور رہنے والے بھی ہمارے ساتھ ادھورے اور پورے فاقے کرنے لگے جو ان کے لئے یقیناً "سراسر مفید تھے۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کے ترک لذات سے ان کے دل پر کہاں تک اثر ہوا اور انھیں حواس پر قابو پانے میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ البتہ اپنی نسبت مجھے یقین ہے کہ اس سے بیحد جسمانی اور اخلاقی فائدہ پہونچا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ فاقے اور اس قسم کی اور ریاضتوں کا اثر سب پر یکساں ہوتا ہے۔

فاقہ حیوانی جذبات کو دبانے میں صرف اُسی صورت میں مفید ہے جب یہ ضبطِ نفس کی خاطر کیا جائے۔ میرے بعض دوستوں کا تو یہ تجربہ ہے کہ فاقے کے بعد حیوانی جذبات اور بھڑک اُٹھے اور ذائقے کی قوت اور تیز ہو گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر فاقے کے ساتھ ہر وقت ضبطِ نفس کا خیال نہ رکھا جائے تو اس سے بالکل کام نہیں چلتا۔ یہ محض خام خیالی ہے کہ اکیلا فاقہ ضبطِ نفس میں مدد دیتا ہے۔ یہ مضمون بھگوت گیتا کے دوسرے باب کے مشہور اشلوک میں بہت خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔

جو شخص صرف ظاہری لذتوں کو ترک کرتا ہے

اس کے دل سے محسوس چیزوں کا خیال دور ہو جاتا ہے؛

آرزو کی خلش نہیں جاتی،

مگر جب اُسے خدا کا جلوہ نظر آ جائے

تو یہ کھٹک بھی نہیں رہتی۔

غرض فاقہ اور اس قسم کی دوسری ریاضتیں محض ضبطِ نفس کا ذریعہ ہیں اور بجائے خود کافی نہیں۔ اگر جسمانی فاقے کے ساتھ ساتھ ضبطِ نفس کا فاقہ نہ ہو تو اس کا انجام ریاکاری اور ہلاکت ہے۔

(۰)

تیسواں باب

معلّم کی حیثیت سے

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ میں ان بابوں میں اُن باتوں کو بیان کر رہا ہوں جن کا ذکر "جنوبی افریقہ کے ستیاگرہ کی تاریخ" میں نہیں آیا یا آیا ہے تو محض سرسری طور پر۔ اس سے پچھلے بابوں کا سلسلہ سمجھ میں آجائے گا۔

جب ہمارے فارم کے رہنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تو اس کی ضرورت پڑی کہ اُن کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ان میں ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی لڑکے تھے اور چند ہندو لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے لئے خاص معلّم رکھنا ممکن بھی نہ تھا اور میں نے اسے ضروری بھی نہیں سمجھا۔ مشکل یہ تھی کہ قابل ہندوستانی معلّم بہت کم تھے اور ان میں سے کسی کو کم تنخواہ پر جوہانسبرگ سے اکیس میل دور جا کر رہنا منظور نہیں تھا۔ اِدھر ہم لوگوں کے یہاں روپیے کا توڑا تھا۔ میرے خیال میں باہر سے معلّم بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں مروجہ طریقہ تعلیم کا قائل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ تجربے اور مشاہدے سے صحیح طریقہ معلوم کروں۔ یہ مجھے یقین تھا کہ کامل نظام معاشرت میں بچوں کو سچی تعلیم والدین ہی سے مل سکتی ہے اور اس صورت میں بیرونی امداد جتنی کم لی جائے اچھا ہے۔ ٹالسٹائے فارم ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا جس میں میں بمنزلہ باپ کے تھا اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مجھی پر رہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تجویز بھی نقائص سے خالی نہیں تھی۔ میرا اور ان سب لڑکے لڑکیوں کا بچپن سے ساتھ نہیں رہا تھا۔ ان کی تربیت جداگانہ حالات اور مختلف ماحول

میں ہوئی تھی اور ان کے مذہبی عقائد بھی مختلف تھے۔ سوال یہ تھا کہ ایسی صورت میں میں افسر خاندان بن کر ان بچوں کی تعلیم کا فرض کما حقہٗ کیوں کر ادا کر سکتا ہوں؟

مگر میں تعلیم میں تہذیبِ نفس اور تعمیرِ سیرت کو سب سے مقدم سمجھتا تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ اخلاقی تربیت سب بچوں کو، خواہ وہ کسی عمر اور کسی خاندان کے ہوں، یکساں دی جا سکتی ہے اس لئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں دن رات ان بچوں کے ساتھ رہوں گا۔ اور پدرانہ شفقت سے ان کی تربیت کی نگرانی کروں گا۔ میرے نزدیک تعمیرِ سیرت تعلیم کی بنیاد ہے اس لئے مجھے یقین تھا کہ اگر بنیاد اچھی پڑ گئی تو اور سب باتیں یہ بچے خود بخود یا دوستوں کی مدد سے سیکھ لیں گے۔

پھر بھی مجھے یہ احساس تھا کہ اس کے علاوہ کتابی تعلیم بھی ضروری ہے اس لئے میں نے مسٹر کیلن باخ اور پراگ جی دیسائی کی مدد سے درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جسمانی تربیت کی طرف سے بھی میں غافل نہیں تھا۔ ان بچوں کو روزمرہ کے کام میں کافی ورزش ہو جاتی تھی، ہمارے فارم میں نوکر تو تھے نہیں اس لئے باورچی سے لے کر مہتر تک کا کام ہمیں لوگ کرتے تھے۔ پھر بہت سے میوہ دار درختوں کی نگرانی کرنا تھی اس لئے باغبانی کا کام بھی کافی تھا۔ مسٹر کیلن باخ کو باغبانی کا بہت شوق تھا اور انہوں نے ایک سرکاری ماڈل گارڈن میں اس کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ سوائے ان لوگوں کے جو باورچی خانے میں کام کرتے تھے اور سب چھوٹے بڑوں کے لئے کچھ دیر باغبانی کا کام کرنا لازمی تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بچے انجام دیتے تھے۔ وہی گڑھے کھودتے، لکڑی کاٹتے بوجھ اٹھاتے۔ ان میں انھیں اچھی ورزش ہو جاتی۔ یہ کام انھیں دل سے پسند تھا اس لئے عموماً کسی اور ورزش یا کھیل کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض، اور کبھی کبھی سب، بیماری کے بہانے سے کام سے جی بھی چراتے تھے۔ بعض اوقات میں ان کی حرکتوں سے چشم پوشی کرتا تھا مگر اکثر سختی سے پیش آتا تھا۔ وہ اس سختی کو پسند نہیں کرتے ہوں گے مگر مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی مزاحمت کی ہو۔ جب ایسی

ضرورت پیش آتی تو میں انھیں دلیلوں سے سمجھاتا کہ کام کو ٹالنا اچھا نہیں ۔ وہ قائل ہو جاتے مگر تھوڑی دیر کے لئے ۔ دم بھر میں پھر کام چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کھیلنے لگتے ۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا اور ان کے جسم ایسے بن گئے کہ دیکھنے کے قابل تھے ۔ فارم میں بیماری کا نام تک نہ تھا ۔ مگر اس میں سچ پوچھئے تو آب و ہوا کی خوبی اور کھانے پینے کے اوقات کی پابندی کو بھی بہت دخل تھا ۔

اسی سلسلے میں پیشے کی تعلیم کا بھی ذکر کر دوں ۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہر لڑکے کو کوئی نہ کوئی مفید دستکاری سکھائیں ۔ اسی غرض سے مسٹر کیلن باخ ایک ٹریپسٹ خانقاہ میں جاکر جوتا بنانا سیکھ آئے ۔ میں نے ان سے یہ ہنر سیکھا اور جو لوگ سیکھنا چاہتے تھے انھیں سکھایا ۔ مسٹر کیلن باخ تھوڑی بہت نجاری بھی جانتے تھے اور ہمارے ایک اور رفیق اس کے ماہر تھے اس لئے ایک چھوٹا سا نجاری کا کلاس بھی کھول دیا گیا ۔ کھانا پکانا قریب قریب سب لڑکوں کو آتا تھا ۔

یہ سب چیزیں ان کے لئے نئی تھیں ۔ انھیں سان گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن انھیں یہ سیکھنا پڑیں گی کیونکہ جنوبی افریقہ میں بچوں کو صرف لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سکھایا جاتا تھا ۔

ٹالسٹائے فارم میں ہم نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ معلّم جو کام خود نہ کرتے ہوں لڑکوں سے نہ کرائیں ۔ جب کبھی لڑکوں کو کوئی کام دیا جاتا تو ہمیشہ کوئی معلّم ان کے ساتھ رہتا اور ان کا ہاتھ بٹاتا ۔ اس لئے انھیں جو کچھ سکھایا جاتا خوشی سے سیکھتے ۔

کتابی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذکر آیندہ بابوں میں آئے گا ۔

تینتیسواں باب

ادبی تعلیم

پچھلے باب میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ ہم نے ٹالسٹائے فارم میں جسمانی تربیت کا اور اسی ضمن میں پیشے کی تعلیم کا کیا انتظام کیا تھا۔ اگرچہ میں اس انتظام سے پوری طرح مطمئن نہ تھا مگر پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کم و بیش کامیابی ہوئی۔

مگر ادبی تعلیم کا معاملہ اس سے مشکل تھا۔ نہ تو میرے پاس ضروری سامان تھا نہ مجھے زبانیں اچھی طرح آتی تھیں اور نہ اتنی فرصت تھی کہ ان کا حسب دلخواہ مطالعہ کر سکوں۔ دن بھر جسمانی مشقت کرنے کے بعد میں شام کو تھک کر چور ہو جاتا تھا اور مجھے آرام کی ضرورت ہوتی تھی۔ عین اس وقت لڑکے میرے پاس پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ پڑھانے کے لئے انسان کو تازہ دم ہونا چاہیئے۔ یہاں اسی کے لئے بڑی کوشش کرنا پڑتی تھی کہ آنکھیں کھلی رہیں نیند نہ آجائے۔ صبح کا وقت فارم کے اور گھر کے کام میں صرف ہوتا تھا اور اسکول کی پڑھائی دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ اور کوئی مناسب وقت تھا ہی نہیں۔

اس تعلیم کے لئے تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ہندی، تامل، گجراتی، اُردو یہ سب زبانیں پڑھائی جاتی تھیں اور ہر لڑکے کو کُل تعلیم اس کی مادری زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔ انگریزی، تھوڑی سی تاریخ، جغرافیہ اور حساب بھی سب کے لئے لازمی تھا۔ گجراتی ہندو لڑکوں کو کسی قدر سنسکرت سیکھنا پڑتی تھی۔

میں تامل اور اردو پڑھاتا تھا۔ تامل میں نے جو کچھ سیکھی سفر میں اور جیل میں سیکھی تھی۔

میری ساری کائنات پوپ کی مشہور کتاب "معلم تامل" تھی۔ اردو رسم الخط میں نے ایک سفر میں تھوڑا بہت سیکھا تھا اور زبان میں میری معلومات اُن عربی فارسی الفاظ تک محدود تھی جو مسلمان دوستوں کی صحبت میں سُنتے تھے۔ سنسکرت میں اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا جتنی ہائی اسکول میں پڑھی تھی بلکہ گجراتی کا بھی یہی حال تھا۔

میری ساری پونجی یہ تھی اور اسی سے مجھے کام چلانا تھا۔ میرے رفیق مجھ سے بھی زیادہ بے مایہ تھے۔ لیکن مجھے اپنے ملک کی زبانوں سے محبت تھی اور اپنی معلّمانہ صلاحیت پر اعتماد تھا۔ پھر میرے شاگردوں کی جہالت اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی خطاپوشی میرے کام آئی۔

جو تامل لڑکے ہمارے اسکول میں تھے ان سب کی پیدائش جنوبی افریقہ کی تھی اس لئے وہ اپنی زبان بہت کم جانتے تھے اور رسم الخط سے تو مطلق واقف نہ تھے۔ اس لئے میں انھیں تامل رسم الخط اور صرف و نحو کی ابتدائی باتیں سکھاتا تھا۔ اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ میرے شاگرد یہ جانتے تھے کہ تامل بولنے میں میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور جب کبھی ایسے تامل لوگ، جو انگریزی نہیں جانتے تھے، مجھ سے ملنے آتے تو لڑکے ترجمانی کرتے تھے۔ مگر میرا کام بڑے مزے میں چلتا تھا کیونکہ میں نے کبھی ان سے اپنی جہالت چھپانے کی کوشش نہیں کی اور ہر چیز میں بھی میں جیسا تھا ویسا ہی میں اپنے آپ کو ان کے سامنے ظاہر کرتا تھا۔ اس لئے باوجود اس کے کہ میں تامل زبان میں بالکل کورا تھا وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور ادب سے پیش آتے رہے۔ مسلمان لڑکوں کو اردو پڑھانا اس سے زیادہ سہل تھا۔ وہ اردو رسم الخط جانتے تھے۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ انھیں پڑھنے کا شوق دلاتا رہوں اور ان کا خط درست کردیا کروں۔

ان میں سے اکثر لڑکے اسکول میں داخل ہونے سے پہلے بالکل اَن پڑھ تھے۔ مگر مجھے تجربے سے معلوم ہوا کہ انھیں بیٹھ کر پڑھانے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ صرف ان کی کاہلی کی

عادت چھڑانا اور ان کے کام کی نگرانی رکھنا کافی ہے۔ میں اسی پر قناعت کرتا تھا۔ اس لئے مختلف عمر کے لڑکے ایک ہی درجے میں بیٹھ کر اپنا اپنا سبق پڑھتے رہتے تھے اور بغیر کسی دقت کے کام چلتا تھا۔

آج کل تعلیم میں درسی کتابوں پر اتنا زور دیا جاتا ہے مگر مجھے تو ان کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ جو تھوڑی بہت کتابیں موجود تھیں ان سے بھی میں نے بہت کام لیا۔ مجھے لڑکوں پر کتابوں کا انبار لاد دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ طالب علم کے لئے بہترین درسی کتاب اُس کا استاد ہے۔ میرے استادوں نے مجھے کتابوں سے جو کچھ پڑھایا اُس میں سے مجھے بہت کم یاد ہے مگر کتاب کے باہر جو باتیں بتائیں وہ آج تک دل پر نقش ہیں۔

بچے کانوں سے سنکر جتنا سیکھتے ہیں اور جتنی آسانی سے سیکھتے ہیں، پڑھ کر نہیں سیکھ سکتے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان لڑکوں کو کوئی کتاب اول سے آخر تک پڑھائی ہو۔ مگر مختلف کتابوں کے مطالعے سے جو باتیں میرے دل میں بیٹھ گئی تھیں وہ میں انھیں اپنی زبان میں سمجھا دیتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ انھیں اب تک یاد ہونگی۔ کتابوں کو پڑھ کر یاد رکھنا ان کے لئے مشکل تھا لیکن جو کچھ میں انھیں زبانی بتاتا تھا وہ آسانی سے ان کے ذہن نشین ہو جاتا تھا اور جب پوچھو فرفر سنا دیتے تھے۔ پڑھنا ان کے لیے بڑا کٹھن کام تھا مگر میری گفتگو سننے میں انھیں لطف آتا تھا بشرطیکہ میرا انداز بیان دلچسپ ہو۔ اور وہ میری گفتگو کی تحریک سے جو سوالات کرتے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کہاں تک سمجھنے کی قوت ہے۔

چونتیسواں باب

روحانی تربیت

ان بچوں کی روحانی تربیت کا مسئلہ ان کی جسمانی اور ذہنی تربیت سے کہیں زیادہ دشوار تھا۔ میں نے اس معاملے میں مذہبی کتابوں سے بہت کم مدد لی۔ میں اس کا ضرور قائل تھا کہ ہر طالب علم کو اپنے مذہب کے بنیادی اصول جاننا چاہیئے اور اپنی مقدس کتابوں سے واقف ہونا چاہیئے اور جہاں تک ممکن تھا میں نے اس تعلیم کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ مگر یہ تعلیم میرے نزدیک ذہنی تربیت میں داخل تھی۔ ٹالسٹائے فارم کے لڑکوں کی تعلیم کا بار اپنے سر لینے سے پہلے مجھے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ روحانی تربیت ایک جداگانہ چیز ہے۔ روح کی تربیت کے معنی ہیں انسان کی سیرت کی تعمیر اور اسے اس قابل بنا دینا کہ خدا کی معرفت اور اپنے نفس کی معرفت حاصل کر سکے۔ میرا خیال تھا کہ یہ روحانی تربیت تعلیم کا اہم عنصر ہے اور بغیر اس کے تعلیم بیکار بلکہ مضر۔

میں نے اکثر یہ بے بنیاد عقیدہ سنا ہے کہ معرفت نفس صرف زندگی کی چوتھی منزل یعنی "سنیاس" میں قدم رکھنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ اس بے بہا تجربے کی تلاش زندگی کے آخری دور پر اُٹھا رکھتے ہیں انھیں معرفت نفس نصیب نہیں ہوتی بلکہ ان کا بڑھاپا بچپن کی بگڑی ہوئی تصویر بن جاتا ہے اور ان کا وجود زمین پر بار ہو جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنی معلمی کے زمانے (یعنی ۱۲-۱۹۱۱ء) میں بھی یہی خیالات رکھتا تھا اگرچہ شاید میں اس وقت انھیں ان الفاظ میں نہ ظاہر کرتا۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ روحانی تربیت کس طریقے سے کی جائے؟ میں بچوں کو بھجن اور

مناجات یاد کراتا تھا اور انھیں اخلاق آموز کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ مگر اس سے میری تسکین نہیں ہوتی تھی۔ جب میں بچوں میں گھل مل گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ روحانی تربیت کتابوں سے نہیں ہو سکتی۔ جیسے جسمانی تربیت کے لیے جسم کی ورزش اور ذہنی تربیت کے لیے ذہن کی ورزش ضروری ہے اُسی طرح روحانی تربیت کے لیے روح کی ورزش ناگزیر ہے۔ اور روح کی ورزش کا دارومدار معلم کی زندگی اور سیرت پر ہے۔ معلم کو بچوں کے سامنے اور ان کے پیچھے ہر وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کوئی نامناسب فعل اس سے سرزد نہ ہو۔ چاہے معلم شاگردوں سے کتنے ہی فاصلے پر ہو مگر اس کے طرزِ زندگی کا اثر اُن کی روحانی نشوونما پر پڑتا ہے۔ اگر میں خود جھوٹ بولوں اور اپنے شاگردوں کو سچ بولنے کی تلقین کروں تو ظاہر ہے کہ کوئی اثر نہ ہوگا۔ بزدل معلم کبھی اپنے شاگردوں کو بہادر نہیں بنا سکتا۔ نفس پرست استاد انھیں ہرگز ضبطِ نفس نہیں سکھا سکتا۔ اس لیے میں نے یہ سوچا کہ مجھے ان لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے جو میری تربیت میں ہیں، اپنی زندگی کو اسوۂ حسنہ بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ گویا یہ بچے میرے استاد تھے اور میں ان کی خاطر نیکی اور عفت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ سچ پوچھیے تو میں ٹالسٹائے فارم میں ضبطِ نفس میں جو اہتمام کرتا تھا وہ زیادہ تر انھیں کے سبب سے تھا۔

ان میں سے ایک وحشی، سرکش، جھوٹا اور جھگڑالو تھا۔ ایک بار اُس نے بڑا فساد برپا کیا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں اپنے شاگردوں کو کبھی سزا نہیں دیتا تھا۔ مگر اس مرتبہ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے خاطر میں نہ لایا۔ آخر میں نے رول اُٹھایا اور اس کے بازو پر مارا۔ میں اس وقت سارے بدن سے کانپ رہا تھا اور میرے خیال میں اسے بھی اس کا احساس تھا۔ وہ رونے لگا اور اُس نے اپنے قصور کی معافی چاہی۔ اس کے رونے کا سبب چوٹ کی تکلیف نہیں تھی اوہ سترہ برس کا مضبوط لڑکا تھا اگر چاہتا تو مجھ پر ہاتھ اُٹھاتا مگر اس نے دیکھا کہ مجھے بالکل مجبور ہو کر

ایسی سخت سزا دینا پڑی اور اس سے مجھے خود سخت اذیت ہوئی۔ اس نے اس کے دل پر اثر کیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے کبھی میری نافرمانی نہیں کی۔ مگر مجھے اس تشدد پر آج تک ندامت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس روز اس لڑکے کے سامنے اپنی روحانیت کا نہیں بلکہ اپنی بہیمیت کا اظہار کیا۔

میں جسمانی سزا کا ہمیشہ سے مخالف ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنے لڑکوں میں سے ایک کو صرف ایک بار مارا ہے۔ اس لئے میں آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ اس روز میرا رُول سے کام لینا جائز تھا یا نہیں تھا۔ غالباً میرا یہ فعل نامناسب تھا کیونکہ اس کا محرک غصہ اور سزا دینے کی خواہش تھی۔ اگر یہ محض میری بے بسی کا اظہار ہوتا تو میں اسے جائز سمجھتا لیکن میری نیت خالص نہیں تھی۔

اس واقعے سے مجھے عبرت ہوئی اور میں نے طالب علموں کی تادیب کا اس سے بہتر طریقہ اختیار کیا میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقہ اس موقعے پر جس کا میں نے ذکر کیا ہے کہاں تک کامیاب ہوتا۔ وہ لڑکا اس واقعے کو بھول بھال گیا اور اس کی سیرت میں کوئی خاص اصلاح نہیں ہوئی۔ مگر میرے دل میں معلّمی کے فرائض کا احساس بڑھ گیا۔

اس کے بعد بھی لڑکوں نے شرارتیں کیں مگر میں نے کبھی جسمانی سزا سے کام نہیں لیا۔ غرض ان لڑکوں اور لڑکیوں کی روحانی تربیت کی کوشش میں مجھ پر روز بروز یہ حقیقت روشن ہوتی گئی کہ روح میں بڑی قوت ہے۔

پینتیسواں باب

پھولوں میں کانٹے

ٹالسٹائے فارم کے قیام کے زمانے میں مسٹر کیلن باخ نے مجھے ایک مسئلے کی طرف توجہ دلائی جو اس سے پہلے کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فارم میں چند لڑکے بد اور سرکش تھے۔ ان میں سے بعض آوارہ بھی تھے۔ میرے تینوں لڑکے اور دوسرے بچے جن کی تربیت انھیں کی طرح ہوئی تھی ان بُرے لڑکوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ مسٹر کیلن باخ کو یہ بات ناگوار تھی مگر انھیں جو کچھ فکر تھی میرے لڑکوں کی تھی۔

ایک دن انھوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا "مجھے یہ بات پسند نہیں کہ آپ اپنے بچوں کو بُرے لڑکوں سے ملنے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بُری صحبت میں پڑکر وہ بھی بگڑ جائیں گے"۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سوال پر مجھے کچھ غور کرنے کی ضرورت ہوئی یا نہیں مگر اپنا جواب یاد ہے۔

"مجھے اپنے لڑکوں اور ان آوارہ لڑکوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے۔ میں دونوں کی تربیت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ لڑکے بھی میرے بلانے سے آئے ہیں۔ اگر میں انھیں کچھ دیکر رخصت کر دوں تو وہ فوراً جوہانسبرگ پہنچ کر اپنی پرانی حرکتیں شروع کر دیں گے۔ وہ خود اور اُن کے والدین یہ سمجھتے ہونگے ان کا یہاں رہنا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ کم سے کم اتنا تو آپ بھی مانیں گے کہ انھیں یہاں بہت تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ میرا اس معاملے میں جو فرض ہے وہ ظاہر ہے۔ میں انھیں یہاں رکھنے پر مجبور

ہوں اور میرے لڑکوں کو ان کی صحبت میں رہنا پڑے گا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے لڑکوں کے دل میں ابھی سے یہ خیال پیدا کردوں کہ وہ دوسروں سے برتر ہیں۔ یہ برتری کا زعم انھیں گمراہ کردے گا۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اُن کے لئے بڑی اچھی تربیت ہے۔ وہ خود بخود نیکی اور بدی میں تمیز کرنے لگیں گے۔ ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ اگر واقعی ان میں نیکی کی صلاحیت ہے تو اس کا اثر ان کے ساتھیوں پر بھی پڑے گا؟ بہرحال میں تو انھیں یہیں رکھوں گا۔ اگر اس میں کوئی خطرہ ہے تو ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے"۔ مسٹر کیلن باخ اس سے مطمئن نہیں ہوئے مگر چپ ہو گئے۔

میرے خیال میں نتیجہ بُرا نہیں ہوا۔ میرے بچوں کو اس تجربے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ اگر ان کے دل میں برتری کے احساس کا کچھ شائبہ تھا تو وہ دور ہو گیا اور انھیں ہر قسم کے لڑکوں میں مل جل کر رہنے کی عادت ہو گئی۔ وہ آگ میں تپ کر اور مضبوط ہو گئے۔

اس طرح کے متعدد تجربوں سے مجھ پر یہ بات ثابت ہو گئی اگر اچھے لڑکے بُری لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں اور ان کی صحبت میں رہیں تو انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بشرطیکہ یہ تجربہ بہت احتیاط سے اُن کے والدین اور اُن کے سرپرستوں کی نگرانی میں کیا جائے۔

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ جو بچے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پاتے ہیں وہ ہر قسم کی ترغیبوں اور بُرے اثروں سے محفوظ رہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب مختلف قسم کی تربیت پائے ہوئے بچے ساتھ رکھے جائیں تو والدین اور معلموں کے لئے بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ انھیں ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے۔

چھتیسواں باب

فاقہ کفارے کی حیثیت سے

مجھے روز بروز یہ احساس ہوتا گیا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کس قدر مشکل چیز ہے۔ میں نے دیکھا کہ اگر میں صحیح معنوں میں ان کا معلم اور سرپرست بننا چاہتا ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ ان کے دل میں جگہ کروں، ان کے دکھ سکھ میں شریک رہوں، ان کی مشکلوں کو حل کروں اور ان کے اُٹھتے جوش اور آرزوؤں کو راہ پر لگاؤں۔

جس زمانے میں بعض ستیاگرہی جیل سے رہا ہوئے ہیں ٹالسٹائے فارم تقریب ویران تھا۔ چند لوگ جو رہ گئے تھے وہ فینکس کے تھے۔ اس لئے میں انھیں لے کر فینکس چلا گیا۔ یہاں مجھے بڑی سخت آزمایش کا سامنا ہوا۔

ان دنوں میں کبھی جوہانسبرگ میں رہتا تھا اور کبھی فینکس میں۔ ایک بار مجھے جوہانسبرگ میں یہ اطلاع ملی کہ فینکس آشرم کے دو شخص فعل شنیع کے مرتکب ہوئے۔ اگر میں یہ سنتا کہ ستیاگرہ کی تحریک بیٹھ گئی تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ مگر اس خبر سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ میں اُسی دن ریل سے فینکس روانہ ہو گیا۔ مسٹر کیلن باخ باصرار میرے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے میری حالت دیکھ لی تھی۔ انھیں کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ مجھے تنہا جانے دیں خصوصاً اس لئے کہ اتفاق سے یہ خبر جس نے میرا دل ہلا دیا، وہی لائے تھے۔

رستے میں میں نے یہ طے کر لیا کہ میرا کیا فرض ہے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ سرپرست یا معلم ایک حد تک ان لوگوں کی لغزشوں کا ذمہ دار ہے جو اس کے زیر نگرانی یا زیر تربیت ہیں اس لئے اس واقعہ کی ذمہ داری صریحاً مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ میری بیوی نے مجھے

پہلے سے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا لیکن میں نے اپنی سادہ دلی سے ان کی باتوں پر توجہ نہیں کی۔

میں نے سوچا کہ جن لوگوں سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے انھیں اپنے قصور اور میرے صدمے کا پورا اندازہ اسی وقت ہو گا جب میں ان کے گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ اس لئے میں نے عہد کر لیا کہ سات دن فاقہ کروں گا اور اس کے بعد ساڑھے چار مہینے تک صرف ایک وقت کھانا کھاؤں گا۔ مسٹر کیلن باخ نے لاکھ کوشش کی کہ مجھے اس ارادے سے باز رکھیں مگر ان کی ایک نہ چلی۔ آخر انھوں نے مان لیا کہ یہ کفارہ بجا ہے اور اس پر اصرار کرنے لگے کہ میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔ میں ان کی اس سچی محبت کو کیوں کر رد کرتا؟

اس فیصلے سے میرا دل ہلکا ہو گیا۔ اس خطا کا ارتکاب کرنے والوں کی طرف سے جو غصہ میرے دل میں تھا وہ دور ہو گیا اور مجھے ان کی حالت پر ترس آنے لگا۔ غرض جب میں فینکس پہنچا تو میری طبیعت کو بہت کچھ سکون ہو گیا تھا۔ میں نے اس معاملے کی مزید تحقیقات کی اور جو تفصیلی باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ معلوم کر لیں۔

میرے فاقے سے سب کو دکھ ہوا مگر آشرم کی فضا پاک صاف ہو گئی۔ ہر شخص کو محسوس ہو گیا کہ گناہ کس قدر ہولناک چیز ہے۔ مجھ میں اور بچوں میں جو رشتہ محبت تھا وہ اور استوار ہو گیا۔

کچھ دن کے بعد اسی واقعے کے سلسلے میں ایک اور شاخ پھوٹی جس کے سبب سے مجھے چودہ دن کا فاقہ کرنا پڑا۔ اس کا اثر میری توقع سے بھی زیادہ ہوا۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جب کبھی شاگرد سے کوئی لغزش ہو جائے تو استاد کا فرض ہے کہ فاقہ کرے۔ مگر میرے خیال میں بعض موقعوں پر اس انتہائی تدبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ خلوص نیت اور روحانی صلاحیت موجود ہو۔ اگر استاد اور شاگرد میں سچی محبت نہیں ہے، اگر استاد کو شاگرد کی لغزش سے

روحانی اذیت نہیں پہنچی ہے۔ اگر شاگرد کے دل میں استاد کا احترام نہیں تو فاقہ بیجا ہے بلکہ اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔ غرض ایسی صورتوں میں خواہ فاقہ مناسب ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ استاد اپنے شاگردوں کی خطاؤں کا ذمہ دار ہے۔

پہلا کفارہ ہم لوگوں کے لئے دشوار نہیں تھا۔ میں بدستور اپنا سارا کام کرتا رہا۔ حالانکہ فاقہ توڑنے کے بعد جتنے دن میں صرف ایک وقت کھانا کھاتا رہا میری غذا پھلوں کے سوا کچھ نہ تھی۔ البتہ دوسرے فاقے کے آخری دن مجھ پر سخت گزرے۔ مجھے اس وقت تک "رام نام" کی برکت کا پورا اندازہ نہ تھا اس لئے میں تکلیفیں سہنے میں کسی قدر کچا تھا۔ اس کے علاوہ میں فاقے کے گروں سے خصوصاً اس اصول سے ناواقف تھا کہ پانی خوب پینا چاہئے چاہے اس سے کتنی ہی متلی کیوں نہ ہو۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پہلا فاقہ آسانی سے گذرنے کی وجہ سے میں بے پروا سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلے فاقے میں میں روزانہ کوہنے کی ہدایت کے مطابق غسل کرتا تھا مگر دوسرے فاقے میں میں نے دو تین دن کے بعد یہ معمول ترک کر دیا اور پانی بھی بہت کم پیا کیونکہ اس سے منہ کا مزا سیٹھا ہو جاتا تھا اور متلی ہونے لگتی تھی۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور آخر میں میری آواز بہت نحیف ہو گئی۔ اس پر بھی میں اپنا لکھنے کا کام اس طرح کرتا رہا کہ میں بولتا جاتا تھا اور کوئی دوسرا لکھتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ روز رامائن اور دوسری کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا اور ضروری معاملوں کے متعلق گفتگو کرنے اور مشورہ دینے سے معذور نہ تھا۔

سینتیسواں باب

گوکھلے سے ملنے کے لئے سفر

جنوبی افریقہ کی اور بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں مگر مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جب ستیاگرہ کی جدوجہد ختم ہوگئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آجاؤ۔ اس لئے میں کستورابائی اور کیلن باخ کو ساتھ لے کر انگلستان روانہ ہوگیا۔

ستیاگرہ کے زمانے میں میں نے تیسرے درجے میں سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے اس سفر میں بھی میں نے تیسرے ہی درجے کا ٹکٹ لیا۔ لیکن اس لائن کے جہازوں کا تیسرا درجہ ہندوستان کے ساحلی جہازوں اور ریلوں کے تھرڈ کلاس سے کہیں بہتر تھا۔ ہندوستان کے جہازوں میں سونا تو الگ رہا بیٹھنے ہی کے لئے کافی جگہ نہیں ملتی اور صفائی کا تو نام بھی نہیں ہوتا۔ بہ خلاف اس کے لندن کے سفر میں تیسرے درجے میں بہت کافی جگہ تھی اور صفائی کا معقول انتظام تھا۔ کمپنی نے ہمارے لئے خاص طور پر آسائش کا سامان مہیا کر دیا تھا اور چونکہ ہم لوگ سوائے میوے کے کچھ نہیں کھاتے تھے اس لئے اسٹیوارڈ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ ہمیں پھل اور اخروٹ وغیرہ دیا کرے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کو یہ چیزیں عموماً نہیں ملتی تھیں۔ ان رعایتوں کی بدولت ہم نے جہاز پر اٹھارہ دن بڑے آرام سے گذارے۔

سفر کے دوران میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جو قابل ذکر ہیں۔ مسٹر کیلن باخ کو دوربین کا بہت شوق تھا اور ان کے پاس دو ایک قیمتی دوربینیں تھیں۔ ہم دونوں میں

ساحلی جہازوں: Coastal boats

ان کے متعلق پر زور بحث رہتی تھی۔ میں انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ ایسی چیز رکھنا سادگی کے نصب العین کے خلاف ہے۔ ایک دن ہم اپنے کیبن کے روشن دان کے قریب کھڑے یہی بحث کر رہے تھے کہ بات بڑھ گئی اور میں نے کہا "ان دوربینوں کے سبب سے ہم دونوں میں روز نزاع رہتی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ انھیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

کیلن باخ بولے "ضرور پھینک دیجئے۔ یہی کمبخت فساد کی جڑ ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھو پھر میں پھینکتا ہوں۔"

انھوں نے بے تامل جواب دیا "میں سچ مچ کہتا ہوں پھینک دیجئے۔"

ان کا یہ کہنا تھا میں نے دوربینیں اٹھا کر سمندر کے حوالے کیں۔ یہ سات پونڈ میں خریدی گئی تھیں مگر ان کی اصل قدر و قیمت یہ تھی کہ مسٹر کیلن باخ ان پر جان دیتے تھے۔ مگر ان کے تلف ہونے کا انھیں مطلق رنج نہیں ہوا۔

میرے اور مسٹر کیلن باخ کے مابین جو محبت کے معاملے پیش آتے تھے یہ اُن کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔ ہم دونوں ہر روز اس مکتب میں نئے سبق سیکھتے تھے کیونکہ دونوں حق کی راہ پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سفر میں غصہ، خود غرضی، نفرت وغیرہ خود بخود رخصت ہو جاتی ہے ورنہ حق کی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔ جو شخص جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے، وہ چاہے کتنا ہی نیک نیت اور سچا ہو حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتا۔ تلاش حق کی سعی تبھی مشکور ہوتی ہے کہ محبت اور نفرت، رنج و راحت کی دوئی سے چھٹکارا مل جائے۔

میرے فاقے کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ مجھے یہ سفر کرنا پڑا۔ میری قوت ابھی اچھی طرح عود نہیں کر پائی تھی۔ میں جہاز کے عرشے پر ٹہلا کرتا تھا کہ تھوڑی سی ورزش ہو جائے اور جو کچھ کھاتا ہوں اُسے ہضم کر لوں۔ مگر یہ ورزش بھی میرے لئے زیادہ تھی اور اس سے میری پنڈلیوں میں درد ہونے لگتا تھا۔ لندن پہنچتے پہنچتے میری حالت اور ابتر ہو گئی۔ وہاں

ڈاکٹر جیوراج مہتا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے اپنے فاقے کا حال اور اس کے بعد کی کیفیت بیان کی۔ انہوں نے کہا "اگر آپ کچھ دن کامل آرام نہیں کریں گے تو اندیشہ ہے کہ آپ کے پیر ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جائیں گے۔"

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص طویل فاقہ کر چکا ہو اسے کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیئے اور کھانے کی حرص کو روکنا چاہیئے۔ فاقہ توڑنے میں فاقہ کرنے سے بھی زیادہ احتیاط اور ضبط نفس کی ضرورت ہے۔

مدیرا میں ہم نے سنا کہ کوئی دن میں بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ بحیرۂ انگلستان میں داخل ہوئے تو خبر ملی کہ لڑائی سچ مچ شروع ہو گئی۔ وہاں ہمارے جہاز کو کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔ جہاز کو تحت بحری بم کے جال میں سے، جو سارے بحیرے میں پھیلا ہوا تھا، نکال کر لیجانا سہل نہ تھا۔ سَتھمپٹن پہنچتے پہنچتے ہمیں دو دن لگ گئے۔ لڑائی کا اعلان ۴/ اگست کو ہوا تھا ہم ۶/ اگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

اڑتیسواں باب

جنگِ عظیم میں میرا حصّہ

انگلستان پہنچکر معلوم ہوا کہ گوکھلے، جو علاج کے لئے پیرس گئے تھے، آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب سے وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک لوٹیں گے۔ میں بے ان سے ملے ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا مگر ان کی واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اتنے دن تک کیا کروں؟ جنگ کے سلسلے میں میرا کیا فرض ہے؟ سہراب جی اداجانیا جو ستیاگرہ میں شریک رہے تھے اور میرے ساتھ جیل گئے تھے اس زمانے میں لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ بڑے پکے ستیاگرہی تھے اس لئے لوگوں نے انھیں قانون پڑھنے بھیجا تھا کہ جب لوٹ کر آئیں تو میری جگہ کام کریں ان کے ساتھ، اور انھیں کے توسط سے، میں ڈاکٹر جیو راج جی مہتا اور دوسرے حضرات سے جو لندن میں تعلیم پا رہے تھے ملا اور میں نے ان سے اس معاملے میں مشورہ لیا۔ ان کی رائے سے ایک جلسہ ان سب ہندوستانیوں کا، جو برطانیۂ عظمیٰ اور آئرستان میں مقیم تھے، منعقد کیا گیا۔ میں نے اس جلسے کے سامنے اپنے خیالات پیش کئے۔

میری یہ رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصّہ لینا چاہیئے۔ جس طرح انگریز طالب علموں نے اپنی خدمات فوج کے لئے پیش کی ہیں ہندوستانیوں کو بھی کرنا چاہیئے۔ اس پر بہت سے اعتراض کئے گئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم غلام ہیں وہ آقا ہیں۔ جب آقا پر بُرا وقت پڑے تو غلام کیوں ساتھ دے؟ اسے تو اس موقعے سے

فائدہ اُٹھاکر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہیئے۔ اس وقت اس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں فرق ہے مگر میری نظر میں ہندوستانیوں کی حالت اتنی بُری نہیں تھی کہ غلامی کہی جائے۔ ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ قصور جو کچھ ہے وہ انگریز حکام کا انفرادی حیثیت سے ہے برطانوی نظام حکومت کا قصور نہیں ہے۔ اگر ہم انگریزوں کی مدد اور ان کے اتحاد عمل سے اپنی حالت سُدھارنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ضرورت کے وقت ان کے کام آئیں۔ ان کی حکومت میں خرابیاں ضرور ہیں مگر اتنی نہیں کہ ناقابل برداشت ہوں۔ اب مجھے برطانوی نظام پر اعتماد نہیں رہا اس لیئے میں حکومت کے ساتھ اتحاد عمل نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ حضرات اسی زمانے سے نظام حکومت اور حکام دونوں سے بدظن تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ ان کا ساتھ کیونکر دے سکتے تھے۔

جو لوگ میری رائے کے مخالف تھے ان کا قول تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات پر زور دینے کا یہی وقت ہے۔

میں یہ کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیئے بلکہ شرافت اور دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے اختتام تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ غرض میں اپنی رائے پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضاکاروں میں لکھوادے۔ مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی اور تقریباً ہر صوبے اور مذہب کے نمائندے رضاکار بن گئے۔

میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا جس میں ان سب واقعات کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر ہماری خدمات کا قبول کیا جانا اس شرط پر منحصر ہو کہ پہلے ہم ایمبولینس[1] کا کام سیکھیں تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔

لارڈ کریو نے کچھ تامل کے بعد ہماری خدمات قبول کرلیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا کہ ہم ایسے

---

[1] Ambulance۔ بیماروں کو اُٹھاکر لانے اور زخمیوں کی خدمت کا کام۔

نازک وقت میں سلطنت کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

رضا کاروں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام مشہور و معروف ڈاکٹر کینٹلی کی نگرانی میں سیکھنا شروع کر دیا۔ صرف چھ ہفتے کی تعلیم تھی مگر اس میں فرسٹ ایڈ کا پورا کورس آجاتا تھا۔

ہماری جماعت میں اسّی آدمی تھے۔ چھ ہفتے کے بعد ہمارا امتحان ہوا جس میں ایک شخص کے سوا سب کے سب کامیاب ہوئے۔ اب حکومت نے ہمیں فوجی قواعد وغیرہ سکھانے کا انتظام کیا۔ کرنل بیکر ہمارے نگراں مقرر ہوئے۔

لندن کی حالت اس زمانے میں دیکھنے کے لائق تھی۔ شہر میں ذرا بھی انتشار نہ تھا سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے میں مصروف تھے جتنے مضبوط جوان تھے وہ تو فوجی قواعد سیکھ ہی رہے تھے۔ مگر ضعیف اور بیمار لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی بیکار نہ تھیں انھوں نے سپاہیوں کی وردیاں اور زخمیوں کی پٹیاں تیار کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔

ایک خواتین کے کلب نے جو لیسیم کہلاتا ہے، فوجی وردیاں بہت بڑی تعداد میں سلوانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مسز سروجنی نائڈو اس کلب کی ممبر تھیں اور بڑے خلوص اور جوش سے کام کر رہی تھیں۔ اسی زمانے میں مجھے ان سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے میرے سامنے بیونتے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا اور کہا کہ انھیں سلوا کر لاؤ۔ میں نے بڑی خوشی سے یہ خدمت قبول کی اور فرسٹ ایڈ کی تعلیم کے زمانے میں دوستوں کی مدد سے جتنے کپڑے سِل سکے سلوا کر انھیں دے۔

اَنتالیسواں باب

روحانی کشمکش

جیسے ہی یہ خبر جنوبی افریقہ پہنچی کہ میں نے اور چند اور ہندوستانیوں نے اپنی خدمات جنگ کے لئے پیش کی ہیں، میرے پاس دو تار آئے۔ ان میں سے ایک مسٹر پولک کا تھا۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ کیا آپ کا یہ فعل "اہمسا" کے عقیدے کے منافی نہیں ہے؟

مجھے پہلے سے خیال تھا کہ یہ اعتراض ہوگا کیونکہ میں نے اپنی کتاب "ہند سوراج" میں جنگ کے مسئلے پر بحث کی تھی اور جنوبی افریقہ میں بارہا اپنے دوستوں سے اس کے متعلق گفتگو کر چکا تھا۔ ہم سب کا خیال تھا کہ جنگ اخلاقاً ناجائز ہے۔ جب میں نے ان لوگوں پر، جنھوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، مقدمہ نہیں چلایا تو میرے دوستوں کو یہ توقع کیونکر ہو سکتی تھی کہ میں جنگ میں شریک ہو جاؤں گا خصوصاً ایسی حالت میں کہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے۔ میرے دوستوں کو معلوم تھا کہ میں جنگ بوئر میں شریک رہ چکا ہوں مگر وہ سمجھتے تھے کہ اس کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جن وجوہ سے میں جنگ بوئر میں شامل ہوا تھا انھیں کی بنا پر میں نے اس بار بھی فیصلہ کیا۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ جنگ میں شریک ہونا "اہمسا" کے منافی ہے۔ مگر انسان کو ہر موقعے پر اپنا صحیح فرض نہیں سوجھتا۔ حق کے طالب کو اکثر اندھیرے میں ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔

"اہمسا" ایک عالمگیر اصول ہے جس میں تشدد کسی صورت میں جائز نہیں۔ ہم بے بس خاک کے پتلے ہر طرف سے "ہمسا" کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ قول کہ جاندار

جانداروں ہی کو کھا کر جیتے ہیں گہری حقیقت پر مبنی ہے۔ انسان جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے "ہمسا" کئے بغیر ایک لحظہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے ہر وقت اس کے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی جان، چاہے وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، ضرور تلف ہوتی ہے اس لیئے "ہمسا" کا طالب اگر اتنا کر سکے کہ اپنے ہر فعل میں خدا ترسی کو مدنظر رکھے، جہاں تک ممکن ہو چھوٹے سے چھوٹے جاندار کی جان لینے سے پرہیز کرے بلکہ اسے دوسروں کے ہاتھ سے بچائے، غرض ہمیشہ "ہمسا" کی زنجیروں کو توڑنے کے لیئے ہاتھ پیر مارتا رہے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنے عقیدے میں پکا ہے۔ اس کے دل میں روز بروز ضبطِ نفس اور خدا ترسی بڑھتی جائے گی مگر ظاہری "ہمسا" سے کامل نجات اُسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ "اہمسا" کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سب جاندار کامل روحانی اتحاد رکھتے ہیں اور ایک کی خطا کا اثر سب پر پڑتا ہے اس لیئے کوئی شخص "ہمسا" سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ انسانی سماج کا رکن ہے وہ اس "ہمسا" میں شریک ہونے پر مجبور ہے جس پر سماج کی زندگی کا دارومدار ہے۔ جب دو قوموں میں لڑائی ہو تو "اہمسا" کے طالب کا فرض ہے کہ وہ لڑائی کو روکے۔ مگر جو شخص یہ فرض ادا نہیں کر سکتا، جو لڑائی کو روکنے کی قوت نہیں رکھتا، جس میں لڑائی روکنے کی قابلیت نہیں ہے وہ لڑائی میں شریک ہو کر بھی دل و جان سے یہ کوشش کر سکتا ہے کہ اپنی قوم کو بلکہ ساری دنیا کو لڑائی سے نجات دے۔

مجھے یہ امید تھی کہ میں برطانوی سلطنت کے ذریعہ سے اپنی اور اپنی قوم کی حیثیت بڑھا سکوں گا۔ میں سوچتا تھا کہ جب تک میں انگلستان میں ہوں برطانوی بیڑے کی حفاظت سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں اور اس مسلح قوت سے فائدہ اُٹھانا گویا اُس تشدد میں شریک ہونا ہی جو اُس کے ہاتھ سے عمل میں آ سکتا ہے۔ اس لیئے اگر میں سلطنت برطانیہ سے تعلق قائم رکھنا اور اس کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہوں تو مجھے ان تین طریقوں میں سے ایک اختیار کرنا چاہیئے۔

یا تو میں کھلم کھلا لڑائی کی مخالفت کروں اور ستیا گرہ کے اصول کے مطابق سلطنتِ برطانیہ سے اس وقت تک ترکِ موالات کروں جب تک وہ اپنی فوجی پالیسی نہ بدل دے، یا میں اس کے قابلِ اعتراض قوانین کی خلاف ورزی کر کے جیل چلا جاؤں، یا لڑائی میں سلطنت کا ساتھ دے کر لڑائی کو روکنے کی قابلیت اور قوت حاصل کروں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تک مجھ میں یہ قابلیت اور قوت نہیں ہے اس لئے مجھے سوائے لڑائی میں شامل ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

میرے نزدیک "اہمسا" کے نقطۂ نظر سے ان سپاہیوں میں جو لڑتے ہیں اور ان لوگوں میں جو فوج کے ساتھ رہ کر دوسری خدمات انجام دیتے ہیں کوئی فرق نہیں۔ جو شخص ڈاکوؤں کے جتھے کے ساتھ شریک ہو کر بار برداری میں مدد دیتا ہے یا جب وہ لڑنے جاتے ہیں تو ان کے گھروں پر پہرہ دیتا ہے یا جب وہ زخمی ہوتے ہیں تو ان کی مرہم پٹی کرتا ہے وہ بھی ان ڈاکوؤں کی طرح ڈکیتی کا مجرم ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو لڑائی میں محض زخمیوں کی خدمت کرتے ہیں لڑائی کے جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔

پولک کا تار پہنچنے سے پہلے میں یہ سب باتیں سوچ چکا تھا۔ جب یہ تار آیا تو میں نے کئی دوستوں سے اس مسئلے پر گفتگو کی اور آخر میں یہی طے کیا کہ میرا فرض ہے کہ اپنی خدمات جنگ کے لئے پیش کروں۔ آج بھی مجھے ان دلیلوں میں کوئی کمزوری نظر نہیں آتی اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ اس زمانے میں میری رائے سلطنتِ برطانیہ کے متعلق اچھی تھی مجھے اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہے۔

مگر میں اس وقت بھی اپنے دوستوں کو اس کا قائل نہ کر سکا کہ میرا طرزِ عمل صحیح ہے۔ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے اور اس میں اختلافِ رائے کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے خیالات کو جہاں تک ممکن ہے وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے جو "اہمسا" پر عقیدہ رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے برتنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ حق کے طالب کو کوئی کام بھی خیالات سے متاثر ہو کر نہیں کرنا چاہئے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا فرض ہے کہ اپنی بات کی پچ نہ کرے اور جب اُسے اپنی غلطی محسوس ہو تو بے تامل سب کے سامنے اس کا اعتراف کرلے اور اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

چالیسواں باب

چھوٹی سی ستیاگرہ

گو میں اپنا فرض سمجھ کر لڑائی میں شریک ہوا تھا مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں اس میں ذاتی طور پر حصہ نہ لے سکا بلکہ مجھے اس نازک موقعے پر ایک چھوٹی سی ستیاگرہ کرنا پڑی۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب ہم لوگ امتحان پاس کر چکے اور ہمارے نام رضا کاروں میں درج ہو گئے تو ایک افسر ہماری تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ ہم صرف قواعد وغیرہ میں اس کے ماتحت رہیں گے اور سب معاملات کی نگرانی میرے سپرد ہو گی اور کمانیر کو جو کچھ کور سے کہنا ہو گا میرے توسط سے کہے گا۔ مگر اس نے پہلے ہی دن ہمارے اس خیالِ خام کو دور کر دیا۔

مسٹر سہراب جی ادا جانیا بڑے ہوشیار آدمی تھے۔ انھوں نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا "اس شخص سے خبردار رہیئے گا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم پر حکومت جتانا چاہتا ہے۔ ہم سے اس کی تابعداری ہرگز نہ ہو گی۔ ہم اُسے اپنا معلّم ضرور سمجھتے ہیں مگر یہ کل کے چھوکرے تک جنھیں اس نے ہمارے سکھانے کے لئے رکھا ہے ہمارے افسر بنتے ہیں۔"

یہ نوجوان جن کا انھوں نے ذکر کیا آکسفورڈ کے طالب علم تھے جو ہمیں قواعد سکھانے آئے تھے۔ انھیں ہمارے کمانیر نے سیکشن افسر مقرر کیا تھا۔

میں نے بھی کمانیر کے تحکمانہ انداز کو محسوس کیا تھا مگر میں نے سہراب جی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر بھلا وہ کب مانتے تھے۔

انھوں نے مسکرا کر کہا " آپ تو ہر شخص پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ باتیں بنا کر آپ کو دھوکا دیتے رہیں گے اور جب آپ خدا خدا کر کے ان کی چالوں کو سمجھیں گے تو ستیا گرہ پر کمر باندھ لیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ بھی برباد ہوں گے اور ہم کو بھی برباد کریں گے۔"

میں نے جواب دیا " آپ لوگ میرا ساتھ دے کر سوائے بربادی کے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ ستیا گرہی تو دھوکا کھانے کے لئے پیدا ہی ہوا ہے۔ کمانیر ہیں شوق سے دھوکا دے۔ میں آپ سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن خود دھوکا کھاتا ہے۔"

سہراب جی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے " اچھا تو پھر آپ دھوکا کھاتے رہئے۔ کسی دن ستیا گرہ میں آپ کا خاتمہ ہو جائے گا اور آپ کے ساتھ ہم جیسے غریبوں کی بھی جان جائے گی۔"

یہاں مجھے مس ایملی ہاب ہاؤس آنجہانی کے وہ الفاظ یاد آگئے جو انھوں نے مجھے ترک موالات کے متعلق لکھے تھے " کوئی تعجب نہیں کہ ایک دن آپ کو حق کے لئے سولی پر چڑھنا پڑے۔ خدا آپ کو راہ راست پر رکھے اور آپ کا حامی اور مددگار رہے۔"

مجھ سے اور سہراب جی سے یہ باتیں کمانیر کے تقرر کے بعد ہی ہوئی تھیں۔ چند روز میں ہمارے اور اس کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ میرے جسم میں چودہ دن کے فاقے کے بعد ابھی اچھی طرح طاقت نہیں آنے پائی تھی کہ میں قواعد میں شریک ہونے لگا جس کے لئے مجھے اکثر گھر سے دو میل پیدل جانا پڑتا تھا۔ اس سے میری پسلی میں ورم ہو آیا اور میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اسی حالت میں مجھے ہفتے کے آخر میں کیمپ میں جانا پڑتا تھا۔ اور لوگ تو وہیں رہ جاتے تھے لیکن میں گھر لوٹ آتا تھا۔ اسی کیمپ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ستیا گرہ کی ضرورت پڑی۔

کمانیر کا تحکم حد سے بڑھنے لگا۔ اُس نے ہم سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل معاملات

میں، چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی، تمہارا افسر ہوں اور اس زعم میں اس نے بیجا سختی شروع کر دی۔ سہراب جی میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ انھیں اس سخت گیری کی برداشت نہ تھی۔ انہوں نے کہا "ہمارے پاس جو حکم آئے وہ آپ کے توسط سے آنا چاہیئے۔ ابھی تو ہم ٹرینگ کیمپ ہی میں ہیں۔ جب ہمیں ابھی سے ایسے مہمل حکم دے جاتے ہیں تو آگے چل کر نہ جانے کیا ہو۔ جو چھوکرے ہمیں قواعد سکھانے آئے ہیں ان کو ہم پر ہر بات میں ترجیح دی جاتی ہے۔ کمانیر سے دو دو باتیں ہو جانا چاہئیں۔ اس طرح سے ہرگز کام نہیں چلے گا۔ ہندوستانی طالب علم وغیرہ جو ہماری کور میں ہیں ایسے مہمل احکام کی پابندی نہیں کر سکتے۔ ہم یہ کام اپنی خودداری قائم رکھنے کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ رہی سہی عزت بھی کھو دیں۔"

میں نے کمانیر کو ان شکایتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس نے لکھا کہ یہ شکایتیں باضابطہ تحریر کے ذریعے سے پیش ہونا چاہئیں۔ آپ شکایت کرنے والوں کو ہدایت کر دیجئے کہ وہ ایک درخواست لکھ کر اپنے نئے سکشن افسروں کو دیدیں وہ معلموں کے توسط سے میرے پاس بھیج دیں گے۔

میں نے جواب دیا کہ مجھے افسری کا دعویٰ نہیں۔ فوجی ضابطے کے لحاظ سے میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ والنٹیر کور کے صدر کی حیثیت سے مجھے غیر سرکاری طور پر اس کی نمایندگی کا حق دیا جائے۔ اسی کے ساتھ میں نے کل شکایتیں تفصیل سے لکھ دیں۔ میں نے کور کی طرف سے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ نئے سکشن افسر بغیر اس کی رائے کے مقرر کر دئے گئے ہیں اور یہ درخواست کی کہ یہ افسر معزول کر دئے جائیں اور نئے افسر کور کے انتخاب اور کمانیر کی منظوری سے مقرر ہوں۔

کمانیر کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اس نے لکھا کور کو سکشن افسروں کے انتخاب کا حق دینا فوجی ضابطے کے خلاف ہے اور جو افسر مقرر ہو چکے ہیں ان کے معزول کرنے سے بڑی

بدرعبی ہوگی۔

اس پر ہم لوگوں نے ایک کمیٹی کی جس میں یہ طے ہوا کہ ہمیں کیمپ سے واپس آجانا چاہیئے۔ میں نے سب کو جتا دیا کہ اس ستیاگرہ کا نتیجہ بہت خطرناک ہوگا مگر اکثر ممبروں کی یہی رائے ہوئی کہ جب تک موجودہ سکشن افسر معزول نہ کئے جائیں اور کور کو اپنے افسر خود منتخب کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے ہم لوگوں کو نہ قواعد میں شریک ہونا چاہیئے اور نہ کیمپ میں جانا چاہیئے۔

جب یہ فیصلہ ہوا تو میں نے کمانیر کو خط لکھا کہ مجھے آپ کے جواب سے جس میں آپ نے میری تجویز کی مخالفت کی ہے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ مجھے افسری کا شوق نہیں ہے بلکہ میں خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ جنگ بوئر کے زمانے میں میں نے جنوبی افریقہ کی ہندوستانی ایمبولینس کور میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا تھا مگر کور کے کمانیر کرنل گیلوے ہر کام میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے تاکہ کور کا منشا معلوم ہو جائے اس لئے اُن کے اور ہماری کور کے تعلقات میں کبھی کشیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ اس خط کے ساتھ میں نے کمیٹی کے رزولیوشن کی ایک نقل بھی بھیجدی۔

کمانیر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے خیال میں یہ کمیٹی اور یہ تجویز بالکل بے ضابطہ تھی۔

اس پر میں نے وزیر ہند کو ان سب واقعات کی اطلاع دی اور رزولیوشن کی نقل بھیجی۔ انہوں نے جواب دیا کہ جنوبی افریقہ کا معاملہ اور تھا یہاں قواعد کی رو سے سکشن افسروں کا تقرر کمانیر کے اختیار میں ہے مگر آپ اطمینان رکھئے کہ آئندہ جب کبھی ان افسروں کے تقرر کا موقعہ آئے گا تو کمانیر آپ کی تجویز کا لحاظ رکھے گا۔

اس کے بعد مجھ سے اور ان سے عرصے تک خط و کتابت ہوتی رہی مگر میں اس افسوسناک قصے کو طول نہیں دینا چاہتا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھے اس معاملے میں وہی تجربہ ہوا جو ہمیں ہندوستان میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ کمانیر نے کچھ ڈرا دھمکا کر اور کچھ حکمت عملی سے کام لے کر ہماری کور

میں پھوٹ ڈال دی۔ رزولیوشن کی تائید کرنے والوں میں سے کچھ لوگ کمانیر کی باتوں میں آکر اپنے قول سے پھر گئے۔

اسی زمانے میں نیٹلے کے اسپتال میں یکایک بہت سے زخمی آگئے اور ہماری کور ان کی خدمت کے لئے مقرر ہوئی۔ کچھ لوگوں کو کمانیر نے سمجھا بجھا کر وہاں بھیجدیا مگر اکثر نے صاف انکار کر دیا۔ میں نقل و حرکت سے معذور تھا مگر مجھ میں اور کور کے لوگوں میں نامہ و پیام جاری تھا۔ ان دنوں مسٹر رابرٹس نائب وزیر ہند اکثر مجھے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اپنے دوستوں کو راضی کر کے نیٹلے بھیجدو۔ انھوں نے یہ صورت تجویز کی کہ یہ لوگ اپنی علیحدہ کور بنالیں نیٹلے میں یہ لوگ وہیں کے کمانیر کے ماتحت ہونگے۔ اس میں ان کی بھی سبکی نہیں، حکومت بھی خوش ہوگی اور بہت سے زخمیوں کی خدمت بھی ہو جائے گی۔ یہ تجویز مجھے اور میرے رفیقوں کو پسند آئی اور وہ سب نیٹلے چلے گئے۔ صرف میں دل پر پتھر رکھے اپنے بستر پر پڑا رہا۔

اکتالیسواں باب

گوکھلے کی رواداری

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے ورم (ذات الجنب) میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گوکھلے لندن واپس آگئے۔ ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ کیلن باخ کو جرمنی کا جغرافیہ ازبر تھا اور انہوں نے یورپ کے دوسری ملکوں میں بھی بہت سفر کیا تھا اس لئے وہ ہمیں نقشے میں وہ مقامات دکھایا کرتے تھے جو لڑائی کے سلسلے میں اہمیت رکھتے تھے۔

جب میرے مرض نے شدت پکڑی تو یہ بھی روزمرہ کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ میرے غذائیاتی تجربے اس زمانے میں بھی جاری تھے۔ میری غذا مونگ پھلی، کچے اور پکے کیلے، میٹھے لیمو، زیتون کے تیل، ولایتی ٹینگن اور انگور وغیرہ پر مشتمل تھی۔ دودھ، اناج اور دال کو میں نے بالکل ترک کردیا تھا۔

ڈاکٹر جیوجی مہتا میرے معالج تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اناج اور دودھ استعمال کروں مگر میں کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات کہیں گوکھلے نے سن پائی۔ وہ میرے میوہ خوری کے اصول کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ جو کچھ ڈاکٹر تجویز کرے وہ استعمال کرو۔

گوکھلے کی بات ٹالنا میرے لئے سہل نہ تھا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانے تو میں نے ان سے غور کرنے کے لئے چوبیس گھنٹے کی مہلت مانگی۔ جب میں اور کیلن باخ رات کو گھر لوٹے تو ہم دونوں میں اس مسئلے پر بحث ہوئی۔ وہ اس تجربے میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔

وہ خود اسے پسند کرتے تھے مگر مجھے انہوں نے یہی رائے دی کہ اگر یہ تجربہ آپ کی صحت کے لئے مُضر ہے تو اسے ترک کر دینا چاہئے۔ اب مجھے خود اپنے ضمیر سے مشورہ کر کے فیصلہ کرنا تھا۔

میں رات بھر جاگ کر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ تجربے کے ترک کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں غذا کے متعلق اپنے اصول بدل دوں حالانکہ مجھے ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی تھی۔ اصل سوال یہ تھا کہ مجھے گوکھلے کے محبت بھرے اصرار سے کہاں تک متاثر ہونا چاہئے اور اپنی "صحت" کی خاطر اپنے تجربے میں کس حد تک تبدیلی کرنا چاہئے۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے تجربے کا جو پہلو خالص مذہبی ہے اس پر مجھے بہر حال قائم رہنا چاہئے البتہ جہاں دوسری مصلحتیں شامل ہیں وہاں ڈاکٹر کی رائے پر عمل کر سکتا ہوں۔ دودھ میں نے زیادہ تر مذہبی جذبات کی بنا پر ترک کیا تھا۔ یہ عہد کرتے وقت میری آنکھوں میں اُس ظلم کی تصویر پھر رہی تھی جو کلکتے کے گوالے ایک ایک قطرہ دودھ نچوڑنے کے لئے گائے بھینسوں پر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا یہ خیال تھا کہ جس طرح گوشت انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے اسی طرح دودھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے صبح کو میں یہ طے کر کے اُٹھا کہ دودھ ترک کرنے کے عہد پر قائم رہوں گا۔ اس فیصلے سے میری طبیعت کو یکسوئی ہوگئی۔ میں گوکھلے کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا مگر مجھے یہ اُمید بھی تھی کہ وہ میرے فیصلے کی وقعت کریں گے۔

شام کو میں اور کیلن باخ گوکھلے سے ملنے نیشنل لبرل کلب گئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا "کہو تم نے کیا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر کی رائے پر عمل کرو گے؟"

میں نے استقلال کے انداز سے مگر نرم لہجے میں کہا "میں اور سب باتیں ماننے کو تیار ہوں مگر ایک چیز کے متعلق اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ للّٰہ آپ مجھ سے اس بارے میں اصرار نہ کیجئے۔ میں گوشت، دودھ اور کوئی چیز جو دودھ سے بنتی ہے استعمال نہیں کروں گا۔ اگر ان چیزوں کو ترک کرنے سے میری جان بھی جاتی رہے تو مجھے منظور ہے۔"

گوکھلے نے کہا "کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں، میں اس معاملے میں بالکل مجبور ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپکو میرے اس فیصلے سے رنج ہوگا مگر امید ہے کہ آپ درگزر کریں گے۔"

گوکھلے کو کسی قدر ملال ضرور ہوا مگر انھوں نے انتہائی محبت سے کہا "مجھے تمہارا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مذہب کی کیا بات ہے؟ مگر اب میں تم سے اصرار نہیں کروں گا۔" پھر ڈاکٹر جیور آج مہتا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "مہربانی کر کے اب انھیں نہ ستائیے۔ انھوں نے اپنے اوپر جو قیدیں عائد کرلی ہیں ان کا لحاظ رکھکر غذا تجویز کر دیجئے۔"

ڈاکٹر صاحب میرے فیصلے سے بہت جزبز ہوئے مگر بیچارے مجبور تھے کیا کرتے۔ انہوں نے پتلی مونگ کی دال تجویز کی اور کہا کہ اس میں ہینگ ڈال لیا کرو۔ اس پر میں راضی ہو گیا۔ دو تین دن میں نے اسے استعمال کیا مگر میرا درد بڑھ گیا اس لئے میں نے پھر اپنی پرانی غذا شروع کر دی۔

ڈاکٹر صاحب خارجی تدابیر سے کام لیتے رہے جن سے درد میں کچھ تخفیف ہو جاتی تھی مگر میں نے جو قیدیں لگا رکھی تھیں ان کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

اس عرصے میں گوکھلے وطن چلے گئے۔ لندن کے اکتوبر کے کہر سے ان کی طبیعت اکتا گئی تھی۔

بیالیسواں باب

پسلی کے ورم کا علاج

پسلی کا ورم کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا اس لئے مجھے کسی قدر اندیشہ پیدا ہوگیا مگر میں جانتا تھا کہ داخلی تدبیروں سے فائدہ نہیں ہوسکتا بلکہ غذا میں تبدیلی اور اس کے ساتھ خارجی علاج ہونا چاہیئے۔

میں نے نباتاتی مشرب کے مشہور و معروف حامی ڈاکٹر ایلنسن سے رجوع کیا جو محض غذا کی تبدیلی سے علاج کیا کرتے تھے۔ ان کے علاج سے میں بالکل اچھا ہوگیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں دودھ کے ترک کا عہد کرچکا ہوں۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا اور کہا "آپ کو دودھ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دن تک آپ کسی قسم کی چکنائی استعمال نہ کریں۔" انہوں نے میرے لئے جو غذا تجویز کی وہ روکھی روٹی، کچے چقندر، مولی، پیاز وغیرہ مختلف قسم کے ساگ اور تازہ پھل خصوصاً نارنگی پر مشتمل تھی۔ ترکاریوں کو پکانے کی اجازت نہیں تھی لیکن اگر چبانے میں دقت ہو تو پیس کر کھا سکتا تھا۔

میں نے تین دن تک یہ غذا استعمال کی لیکن کچی ترکاریاں مجھے موافق نہیں آئیں۔ میرا جسم اتنا کمزور تھا کہ یہ تجربہ جیسا چاہیئے تھا نہیں کرسکا۔ کچی ترکاریاں کھانے میں ڈرتا تھا۔ ڈاکٹر ایلنسن نے یہ بھی کہا کہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں ہر وقت کھلی رکھو، نیم گرم پانی میں نہایا کرو، جسم کے جس حصے میں ورم ہے وہاں تیل کی مالش کیا کرو اور پندرہ منٹ سے لیکر تیس منٹ تک کھلی ہوا میں ٹہلا کرو۔ مجھے یہ سب تجویزیں پسند آئیں۔

میرے کمرے میں فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں تھیں۔ اگر پانی برستے وقت یہ پوری کھلی

رہیں تو کمرے میں بوچھار آتی تھی ۔ ان کے اوپر جو روشندان تھے وہ کھل نہیں سکتے تھے ۔ اسلئے میں نے روشندانوں کے شیشے تڑوا دئے تاکہ تازہ ہوا آسکے اور کھڑکیاں اتنی کھول دیں کہ بوچھار نہ آئے ۔

ان تدبیروں سے میری طبیعت کسی قدر سنبھل گئی مگر پوری صحت نہیں ہوئی ۔

لیڈی سیسیلیا رابرٹس کبھی کبھی مجھے دیکھنے آیا کرتی تھیں ۔ ہم دونوں میں دوستی ہوگئی ۔ انھوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ دودھ کا استعمال شروع کردو ۔ مگر جب میں کسی طرح نہ مانا تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ دودھ کا کوئی بدل تلاش کریں ۔ کسی نے انھیں "مالٹڈ ملک"[1] بتا دیا اور ناواقفیت کی بنا پر کہہ دیا کہ اس میں دودھ بالکل نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک کیمیاوی مرکب ہے جس میں دودھ کی کل خاصیتیں موجود ہیں ۔ لیڈی سیسیلیا میرے مذہبی جذبات کا بہت خیال رکھتی تھیں اس لئے مجھے ان کی بات پر پورا اعتبار تھا ۔ میں نے اس سفوف کو پانی میں گھول کر پیا تو اس میں بالکل دودھ کا مزا تھا ۔ اب مجھے شیشی کا لیبل پڑھنے کا خیال آیا ۔ معلوم ہوا کہ یہ دودھ ہی کا مرکب ہے ۔ اس لئے میں نے پھر کبھی نہیں پیا ۔

میں نے لیڈی سیسیلیا کو اس کی خبر کی اور کہلا بھیجا کہ جو ہوا سو ہوا آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے ۔ وہ بیچاری معذرت کرنے دوڑی آئیں اور کہنے لگیں کہ میرے دوست نے لیبل نہیں پڑھا تھا ۔ میں نے کہا آپ بالکل تشویش نہ کیجئے ۔ مجھے اس کا مطلق ملال نہیں بلکہ آپ سے ندامت ہے کہ آپ اتنی زحمت اٹھا کر یہ شیشی لائیں اور میں اسے کام میں نہیں لا سکتا ۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ ناواقفیت کی بنا پر دودھ استعمال کرلینے میں میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ۔

لیڈی سیسیلیا رابرٹس کی ہمدردی اور محبت کے بہت سے واقعات ہیں ، جن کی یاد میرے دل کو عزیز ہے مگر میں مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں ۔ مجھے اور بہت سے دوست یاد

---

[1] Malted Milk ۔ دودھ اور آٹے کا مرکب ۔

آرہے ہیں جنہوں نے مصیبت اور مایوسی میں میری دستگیری کی۔ جو دل نورِ ایمان سے منوّر ہے اُسے ان کے پردے میں رحمتِ ایزدی کا جلوہ نظر آتا ہے جن کی بدولت رنج والم کی تلخی میں حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر اٹکنسن مجھے دوسری بار دیکھنے آئے تو انہوں نے پرہیز کی سختیاں کم کر دیں انہوں نے کہا کہ تم مونگ پھلی اور زیتون کا تیل استعمال کر سکتے ہو اور کچی یا جی چاہے تو پکی ہوئی ساگ ترکاری چاول کے ساتھ کھا سکتے ہو۔ یہ تبدیلیاں خوشگوار تھیں مگر ان سے بھی مرض کا ازالہ نہیں ہوا۔ ابھی تیمارداری میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی اور زیادہ تر وقت بستر پر لیٹے لیٹے گذارنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر مہتا کبھی کبھی میری عیادت کو آتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ آپ اب بھی میری بات مان لیجئے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو اچھا کر دوں گا۔

اس اثنا میں ایک دن مسٹر رابرٹس مجھے دیکھنے آئے اور انہوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ آپ وطن چلے جائیے۔ "اس حالت میں آپ کا نیٹلے جانا ناممکن ہے ادھر سردی چمکنے کے دن آرہے ہیں۔ میری تو یہی صلاح ہے کہ آپ ہندوستان چلے جائیے۔ پوری صحت آپ کو وہیں جا کر ہو سکتی ہے۔ اگر اس وقت تک لڑائی جاری رہی تو وہاں بھی آپ کو سلطنت کی مدد کے بہت سے موقعے ملیں گے۔ اور اب بھی آپ نے جو کچھ کیا ہے اُسے میں کم نہیں سمجھتا۔

میں نے اُن کا مشورہ قبول کر لیا اور ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

تینتالیسواں باب

وطن کو واپسی

مسٹر کیلن باخ میرے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئے تھے۔ لندن میں وہ میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور ہم دونوں ایک ہی جہاز میں روانہ ہونے والے تھے۔ مگر جرمن نسل کے لوگوں کی نگرانی اس قدر سختی سے کی جا رہی تھی کہ انھیں پاس پورٹ (پروانہ راہداری) ملنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ میں نے اس معاملے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ مسٹر رابرٹس انھیں پاس پورٹ دیئے جانے کے حامی تھے اور انھوں نے اس کے متعلق وائسرائے کو تار دیا۔ مگر لارڈ ہارڈنگ نے صاف جواب دے دیا "مجھے افسوس ہے، حکومت ہند ایسے خطرے میں پڑنے کے لئے تیار نہیں۔" ہم سب لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب کوشش کرنا بیکار ہے۔

مجھ پر کیلن باخ کی جدائی بہت شاق گزری اور انھیں مجھ سے بھی زیادہ صدمہ ہوا۔ اگر وہ ہندوستان آتے تو آج میرے ساتھ کسان اور جولاہے کی سیدھی سادی زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوتے۔ وہ آج کل جنوبی افریقہ میں پہلے کی طرح ماہر تعمیرات کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا کام خوب چل رہا ہے۔

ہم تیسرے درجے کا ٹکٹ لینا چاہتے تھے مگر پی اینڈ او کے جہازوں میں تیسرا درجہ تھا ہی نہیں اس لئے مجبوراً دوسرے درجے میں سفر کرنا پڑا۔

ہم جنوبی افریقہ سے جو خشک میوہ لائے تھے وہ ہم نے ساتھ رکھ لیا کیونکہ جہاز پر تازے پھل تو ملتے تھے مگر خشک میوہ نہیں ملتا تھا۔

ڈاکٹر جیوراج مہتا نے میری پسلیوں پر "میڈس پلاسٹر" کی پٹی باندھ دی تھی اور یہ

تاکید کر دی تھی کہ بحر قلزم پہنچنے سے پہلے اسے نہ کھولنا۔ دو دن تک تو میں نے یہ تکلیف سہی مگر اسکے بعد برداشت نہ ہو سکی۔ بڑی مشکل سے میں نے پٹی چھڑائی اور اچھی طرح نہانا دھونا شروع کیا۔

زیادہ تر میں تازے پھل اور خشک میوہ خصوصاً اخروٹ، مونگ پھلی وغیرہ کھاتا تھا۔ میری طبیعت روز بروز سنبھلتی جاتی تھی اور نہر سویز پہنچتے پہنچتے تقریباً پوری صحت ہوگئی۔ اب کمزوری کے سوا اور کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس لئے میں رفتہ رفتہ ورزش بڑھاتا گیا۔ میرے خیال میں اس افاقے کا سبب زیادہ تر منطقۂ معتدلہ کی صحت بخش ہوا تھی۔

خدا جانے پُرانے تجربے کی بنا پر جو خیال جم گیا تھا اس کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی کہ مجھے جہاز کے انگریز اور ہندوستانی مسافروں میں اس سے بھی زیادہ فصل نظر آیا جو میں نے جنوبی افریقہ سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھ سے چند انگریزوں سے بات چیت ہوئی مگر محض سرسری اور رسمی۔ جس بے تکلفی سے جنوبی افریقہ کے جہازوں پر گفتگو ہوتی تھی اس کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ تھا کہ انگریز کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ میں حاکم قوم کا فرد ہوں اور ہندوستانی کے دل میں یہ کھٹک رہتی ہے کہ میں محکوم قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔

میری طبیعت اس فضا میں الجھتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح جلدی گھر پہنچوں۔ عدن میں آکر تھوڑا بہت وطن کا لطف آنے لگا۔ عدن والوں سے ہم سے اچھی راہ و رسم تھی کیونکہ ڈربن میں مسٹر کیقباد کاوس جی ڈنشا اور ان کی بیوی سے ہمارا میل جول رہ چکا تھا۔

چند روز میں ہم بمبئی پہنچ گئے۔ دس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔

گوکھلے باوجود اپنی صحت کی خرابی کے مجھ سے ملنے بمبئی آئے تھے۔ اُن کی تحریک سے یہاں میرا استقبال کیا گیا۔ میں دل میں یہ اُمید لئے ہوئے آیا تھا کہ ان کا دامن تھام لوں گا تو میرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔

چوالیسواں باب

وکالت کے زمانے کی چند قابل ذکر باتیں

ہندوستان آنے کے بعد مجھ پر جو کچھ گذری اُس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی افریقہ کے چند تجربے جنھیں میں نے خاص کر کے چھوڑ دیا تھا بیان کر دوں۔

میرے بعض وکیل دوستوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ اپنی وکالت کے زمانے کی قابل ذکر باتیں لکھوں۔ ان کی تعداد اتنی ہے کہ اگر میں لکھنے پر آؤں تو ایک مستقل کتاب بن جائے اور میں کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں۔ اس لئے میں چند ایسے واقعات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں جو تلاش حق سے متعلق ہیں۔

غالباً میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں نے اپنے پیشے میں کبھی جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا اور میری وکالت زیادہ تر قومی معاملات کے لئے وقف تھی جس کا معاوضہ میں صرف اتنا لیتا تھا کہ جو کچھ مجھے اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا ہے وہ نکل آئے، اور کبھی کبھی اسے بھی چھوڑ دیتا تھا۔ میرے خیال میں تو میری وکالت کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ کچھ اور لکھو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں ان موقعوں کا کچھ تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں جہاں میں نے حق کی راہ میں استقلال دکھایا ہے تو وکیلوں کے لئے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

بچپن میں میں نے سنا تھا کہ وکالت میں بے جھوٹ بولے کام نہیں چل سکتا۔ مگر میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے کچھ جھوٹ بول کر دولت یا عزت کمانا تو تھا ہی نہیں۔

جنوبی افریقہ میں میرے لئے امتحان کے بہت سے موقعے آئے۔ اکثر مجھے یہ علم ہوتا تھا

کہ فریق مخالف کے وکیلوں نے گواہوں کو سکھایا پڑھایا ہے اور اگر میں بھی اپنے موکل یا اس کے گواہوں کو جھوٹ بولنے دوں تو مقدمہ جیت جاؤں گا۔ مگر میں نے اسے کبھی جائز نہیں رکھا۔ صرف ایک بار ایک مقدمہ جیتنے کے بعد مجھے یہ شبہہ ہوا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں اپنے دل میں ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ اگر میرا موکل حق پر نہ ہو تو میں مقدمہ ہار جاؤں فیس مقرر کرتے وقت میں نے کبھی یہ شرط نہیں کی کہ اگر مقدمے میں کامیابی ہوئی تو زیادہ لوں گا۔ میرے موکل چاہے ہاریں یا جیتیں میں اپنی مقررہ فیس سے کم یا زیادہ نہیں لیتا تھا۔

میں ہر نئے موکل کو پہلے ہی جتا دیتا کہ مجھ سے جھوٹے مقدمے میں پیروی کرنے کی یا گواہوں کو سکھانے کی توقع نہ رکھو۔ جب اس بات کی شہرت ہوگئی تو میرے پاس جھوٹے مقدمے آنا ہی بند ہو گئے۔ بعض موکل یہ کرتے تھے کہ سچے مقدمے میرے پاس لاتے تھے اور جھوٹے مقدمے دوسروں کے پاس لے جاتے تھے۔

ایک موقع میرے لئے بڑی سخت آزمایش کا تھا۔ ایک موکل جس سے مجھے بہت سا کام ملا کرتا تھا میرے پاس ایک مقدمہ لایا جو بہت دن سے چل رہا تھا۔ یہ بہی کھاتے کا معاملہ تھا اور اس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ عدالت نے چند قابل محاسبوں کو پنچ مقرر کیا۔ انھوں نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ کیا لیکن ان کے حساب میں ایک غلطی رہ گئی یعنی ایک رقم جو خرچ کے خانے میں لکھی جانا چاہیے تھی آمدنی کے خانے میں لکھ دی گئی۔ رقم تو چھوٹی سی تھی مگر یہ غلطی بڑی فاش تھی۔ فریق مخالف نے محاسبوں کے فیصلے کا اپیل دوسری وجوہ کی بنا پر کیا تھا اس غلطی کا اُسے علم نہ تھا۔ اس مقدمے کی اصل پیروی ایک دوسرے وکیل کر رہے تھے میں ان کا مددگار تھا۔ جب انھیں اس غلطی کا علم ہوا تو انھوں نے کہا ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس کو ظاہر کرتے پھریں۔ وہ اس خیال کے آدمی تھے کہ وکیل کو کسی ایسی بات کا اعتراف نہ کرنا چاہیے جو اُس کے موکل کے خلاف پڑتی ہو۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہ غلطی ظاہر کر دینا چاہیے۔

وکیل صاحب کہنے لگے "اس صورت میں بڑا اندیشہ ہے کہیں عدالت پنچوں کے فیصلے کو منسوخ نہ کر دے۔ کوئی وکیل جس کا دماغ صحیح ہے، اپنے موکّل کے مقدمے کو ایسے خطرے میں نہ ڈالے گا۔ مجھ سے تو یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر پھر نئے سرے سے کارروائی شروع ہوئی تو نہ جانے ہمارے موکّل کو کتنی زیر باری ہو اور مقدّمے کا کیا نتیجہ ہو۔

یہ باتیں موکّل کی موجودگی میں ہو رہی تھیں۔

میں نے کہا "میرے خیال میں تو ہمیں اور ہمارے موکّل کو یہ خطرہ برداشت کرنا چاہیئے۔ یہ کونسی یقینی بات ہے کہ اگر ہم اس غلطی کو ظاہر نہ کریں تو عدالت پنچوں کے فیصلے کو بحال رکھے گی؟ اور فرض کیجیئے کہ ہمارے موکّل کو نقصان بھی پہنچے تو کیا ہرج ہے؟"

وکیل صاحب بولے "مگر آخر اس کی ضرورت کیا ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس غلطی کو ظاہر کر کے مقدمہ کمزور کر دیں؟"

میں نے عرض کیا "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عدالت کی نظر اس غلطی پر نہ پڑے گی یا فریق مخالف کو اس کا پتہ نہ چلے گا؟"

انھوں نے اس قیل وقال کو ختم کرنے کے لئے کہا "تو پھر آپ ہی جا کر مقدمے میں بحث کیجیئے۔ میں آپ کی شرط ہرگز منظور نہیں کر سکتا۔"

میں نے عاجزی سے کہا "اگر موکّل کی خواہش ہو تو میں بحث کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن اسی شرط پر کہ غلطی کا اظہار کر دیا جائے ورنہ مجھ سے اس مقدمے سے کوئی سروکار نہیں!"

یہ کہہ کر میں نے موکّل کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر شش وپنج میں رہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مقدمہ میرا سمجھا ہوا ہے۔ اسے مجھ پر پورا اعتبار تھا اور میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ آخر اُس نے کہا "اچھی بات ہے آپ بحث کیجیئے اور غلطی کا اظہار کر دیجیئے۔ اگر تقدیر میں ہارنا لکھا ہے تو یہ ہی سہی۔ سچے کا ساتھی خُدا ہے۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وکیل صاحب نے مجھے پھر سمجھایا اور میری ضد پر بہت افسوس کیا۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے مجھے مبارکباد بھی دی۔

عدالت میں جو کچھ گذری اس کا حال آئندہ باب میں معلوم ہوگا۔

پینتالیسواں باب

چالبازی؟

مجھے پورا یقین تھا کہ میری رائے صحیح ہے البتہ اس کا بڑا کھٹکا تھا کہ مقدمے کی پیروی، جیسی چاہیے مجھ سے نہ ہو سکے گی۔ عدالت عالیہ کے سامنے ایسے پیچیدہ مقدمے میں بحث کرتے دل ڈرتا تھا۔ جب میں ججوں کے سامنے گیا تو خوف سے کانپ رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے حساب کی غلطی کا ذکر کیا ایک جج بول اٹھے "کیوں مسٹر گاندھی کیا یہ چالبازی نہیں ہے؟"

یہ سن کر مجھے آگ لگ گئی۔ ایسے بے بنیاد الزام کو برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب جج پہلے ہی سے بدظن ہے تو ایسے پیچیدہ مقدمے میں کامیابی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ مگر میں نے ضبط سے کام لے کر کہا "مجھے تعجب ہے کہ حضور والا نے پوری بات سنے بغیر مجھ پر چالبازی کا الزام لگا دیا۔"

جج نے کہا "الزام کیسا میں نے تو ایک سوال پوچھا ہے۔"

"میرے نزدیک تو یہ سوال الزام سے کم نہیں۔ میں حضور والا سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی تقریر پوری کر لینے دیجیے۔ اس کے بعد اگر میرا قصور ثابت ہو تو مجھے ملامت کیجیے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قطع کلام کیا۔ آپ جو کہہ رہے تھے کہیے۔"

میرے پاس صفائی کا پورا ثبوت تھا۔ اچھا ہوا کہ جج نے یہ بحث چھیڑ دی۔ اس کی وجہ سے عدالت شروع ہی سے میری تقریر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر معاملے کو بہت تفصیل سے سمجھایا۔ سب ججوں نے میری بات کو غور سے سنا اور انھیں یقین آ گیا

کہ پنچوں سے نادانستہ غلطی ہو گئی۔ اس لئے انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ فیصلے کو سرے سے منسوخ کر کے پنچوں کی ساری محنت پر پانی پھیر دیں۔

فریقِ مخالف کے وکیل یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ غلطی کے ظاہر ہو جانے کے بعد زیادہ بحث کی ضرورت نہ رہے گی۔ مگر ججوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ غلطی محض اتفاقی ہے اور آسانی سے صحیح کی جا سکتی ہے اس لئے انہوں نے ان کی تقریر پر توجہ نہ کی۔ وکیل نے بہت زور لگایا کہ فیصلے کو غلط ٹھہرائیں مگر جس جج نے ابتدا میں شبہے کا اظہار کیا تھا وہ اب کھلم کھلا میری طرفداری کرنے لگا۔

اُس نے پوچھا "اگر مسٹر گاندھی خود غلطی کا اعتراف نہ کر لیتے تو آپ کیا کرتے؟ آپ کی نظر اس غلطی پر کیوں نہیں پڑی؟"

وکیل نے جواب دیا "ہم نے اپنی طرف سے جو محاسب مقرر کیا تھا اُس سے بڑھ کر ایماندار اور قابل آدمی ہمیں نہیں مل سکتا تھا۔ جب وہ اس غلطی کو نہ پکڑ سکا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟"

جج نے کہا "عدالت کے نزدیک آپ اپنے مقدمے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر آپ سوائے اس غلطی کے جو بڑے سے بڑے محاسب سے بھی ممکن ہے اور کوئی پہلو اپنے موافق نہیں نکال سکتے تو کیا عدالت کے لئے یہ مناسب ہے کہ ایک ذراسی غلطی کے لئے فریقین کو مزید مقدمہ بازی کی زیرباری برداشت کرنے دے؟ جب اس غلطی کی تصحیح آسانی سے ہو سکتی ہے تو دوبارہ تحقیقات کا حکم کیوں دیا جائے؟"

غرض عدالت نے وکیل کا اعتراض تسلیم نہیں کیا اور یا تو خود غلطی کی تصحیح کر کے پنچوں کا فیصلہ برقرار رکھا یا انہیں ہدایت کی کہ اسے درست کر دیں مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ کیا صورت ہوئی۔

مجھے اس سے بیحد مسرت ہوئی۔ میرا موکل اور اس کے دوسرے وکیل بھی بہت خوش ہوئے۔ میرا یہ عقیدہ اور پختہ ہو گیا کہ دیانتداری کے ساتھ وکالت کرنا ناممکن نہیں ہے۔

مگر یہ یاد رہے کہ وکالت کے پیشے میں سچائی برتنے سے بھی اس کی بنیادی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں۔

چھیالیسواں باب

موکل رفیق بن گئے

نٹال اور ٹرانسوال کی وکالت میں یہ فرق تھا کہ نٹال میں وکیل اور بیرسٹر مقدمے کو ترتیب بھی دے سکتے تھے اور پیروی بھی کر سکتے تھے۔ مگر ٹرانسوال میں، بمبئی کی طرح، یہ دونوں پیشے الگ کر دیے گئے تھے۔ مقدمہ کی ترتیب کا کام اٹرنی[1] کرتے تھے اور پیروی ایڈووکیٹ[2]۔ بیرسٹر کو اختیار تھا کہ چاہے اٹرنی کا پیشہ اختیار کرے چاہے ایڈووکیٹ کا۔ میں نٹال کی مجلس وکلا میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے داخل ہوا تھا مگر ٹرانسوال آکر میں نے اٹرنی کا کام شروع کیا کیونکہ ایڈووکیٹ کی حیثیت سے مجھے ہندوستانیوں سے براہ راست ملنے کا موقع نہ ملتا اور جنوبی افریقہ کے یورپی اٹرنی مجھے مقدمے بھی نہ دیتے۔

مگر ٹرانسوال میں بھی اٹرنی مجسٹریٹوں کی عدالت میں پیروی کرنے کے مجاز تھے۔ ایک بار جوہانسبرگ میں ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کرتے ہوئے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکا دیا۔ جرح میں وہ بالکل اکھڑ گیا۔ اس لئے میں نے بغیر کسی بحث کے مجسٹریٹ سے درخواست کی کہ میرے موکل کے خلاف فیصلہ کر دیا جائے۔ فریق مخالف کا وکیل حیرت میں رہ گیا اور مجسٹریٹ بہت خوش ہوا۔ میں نے اپنے موکل کو بہت ملامت کی کہ تم جھوٹا مقدمہ میرے پاس کیوں لائے؟ اس نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور میرے خیال میں وہ مجھ سے اس بات پر ناراض نہیں ہوا کہ میں نے اس کے خلاف فیصلہ کرا دیا۔ بہرحال میرے اس طرز عمل

---

[1] Attorney۔ [2] Advocate۔

سے میری وکالت کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ میرے کام میں بڑی آسانی ہوگئی۔ ہم پیشہ لوگوں میں میری ساکھ قائم ہوگئی اور باوجود نسل کے تعصب کے ان میں سے بعض میرے دوست بن گئے۔

میرا یہ بھی معمول تھا کہ اپنی جہالت کو اپنے موکلوں یا اپنے ہم چشموں سے کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ جب کبھی کوئی مقدمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا تو میں موکل کو یہ مشورہ دیتا تھا کہ کسی دوسرے وکیل کے پاس جائے۔ اگر وہ مجھی کو وکیل کرنے پر مُصر ہوتا تھا تو میں اُس کی اجازت سے کسی بڑے وکیل کو شریک کرلیتا تھا۔ اس طرز عمل کی بدولت میرے موکلوں کو مجھ سے بڑی محبت ہوگئی اور وہ مجھ پر بے حد اعتبار کرنے لگے۔ جب کسی بڑے وکیل سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ خوشی سے اس کی فیس ادا کرتے تھے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جنوبی افریقہ میں وکالت کرنے میں میرا اصل مقصد قومی خدمت کرنا تھا۔ اس کے لئے بھی لوگوں کی نظر میں اپنا اعتبار قائم کرنا بہت ضروری تھا۔ ہندوستانیوں کی کریم النفسی کی انتہا ہے کہ میں جو کام فیس لے کر کرتا تھا اُسے بھی وہ قومی خدمت سمجھتے تھے اور جب میں نے انھیں یہ رائے دی کہ اپنے حقوق کی خاطر جیل جاؤ تو وہ زیادہ تر میری محبت میں اور میرے اعتبار پر خوشی سے راضی ہوگئے۔

ان سطروں کو لکھتے وقت میرا دل ایسے بہت سے واقعات کی یاد کے مزے لے رہا ہے۔ میرے سیکڑوں موکل قومی خدمت میں میرے دست و بازو بن گئے اور ان کی بدولت وہ کانٹے جو میری راہ میں تھے پھول ہوگئے۔

سینتالیسواں باب

میں نے ایک موکل کو کیونکر بچایا

اس کتاب کے پڑھنے والے پارسی رستم جی کے نام سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو میرے موکّل بھی تھے اور رفیق بھی بلکہ رفیق پہلے تھے اور موکل بعد میں بنے۔ انھیں مجھ پر اتنا اعتبار ہو گیا کہ خانگی معاملات میں بھی میرے مشورے پر عمل کرنے لگے۔ یہانتک کہ دوا علاج میں بھی مجھ سے مدد لینے لگے۔ گو ہم دونوں کے طرز زندگی میں بہت فرق تھا مگر وہ بے تامل میری عطائی تدبیروں پر عمل کرتے تھے۔

ایک بار بیچارے بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ عموماً وہ اپنے معاملات کا ذکر مجھ سے کر دیتے تھے مگر ایک بات انھوں نے چھپا رکھی تھی۔ وہ بمبئی اور کلکتہ سے بہت سامان منگواتے تھے اور اکثر چنگی سے بچا کر نکال لاتے تھے۔ چنگی کے بہت سے افسران کے دوست تھے اسلئے کسی کو اُن پر شبہہ نہیں ہوتا تھا۔

مگر بقول گجراتی شاعر آکھو کے "کاچو پارو کھاوو اَن تیوُوں چھے چوری نُو دھن" یعنی پارہ کی طرح چوری بھی نہیں دبتی۔ ایک دن رستم جی پھنس گئے۔ وہ دوڑے ہوئے میرے پاس آئے اور رو کر کہنے لگے "بھائی، میں نے تمہیں بڑا دھوکا دیا۔ آج میری چوری پکڑی گئی۔ میں مال چنگی سے بچا کر لایا کرتا تھا۔ اب بھید کھل گیا۔ مجھے جیل جانا پڑے گا۔ ہائے میں تباہ ہو گیا میرے بھائی مجھے بچائیے۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ مگر ان بیوپار کے ہتھکنڈوں کا کیا ذکر کرتا۔ کاش میں نے آپ سے کہہ دیا ہوتا!"

میں نے انھیں دلاسا دیا اور کہا "آپ کا بچنا یا نہ بچنا خدا کے ہاتھ ہے۔ رہا میں سو

میرا اصول آپ جانتے ہیں۔ میں آپ کو بچانے کی کوشش اُسی صورت میں کر سکتا ہوں کہ آپ حکام کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر لیں۔"

یہ سن کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا "مگر میں نے آپ کے سامنے تو اقرار کر لیا، کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

میں نے نرمی سے جواب دیا "آپ نے سرکار کی چوری کی ہے، میری نہیں کی۔ پھر میرے سامنے اقرار کرنے سے کیا فائدہ؟"

رستم جی بولے "آپ جو کچھ کہیں گے وہی کروں گا۔ مگر میرے پرانے وکیل مسٹر.......

سے تو پوچھ لیجیے۔ وہ بھی تو اپنے دوست ہیں۔"

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ عرصے سے جاری تھا مگر جو مال پکڑا گیا وہ تھوڑا ہی سا ہے۔ ہم دونوں وکیل کے پاس گئے۔ انہوں نے کاغذات کو دیکھ کر کہا "مقدمہ جوری کے سامنے پیش ہوگا اور نتال کی جوری سے یہ توقع نہیں کہ کسی ہندوستانی کو بری کر دے۔ مگر پھر بھی اپنی سی کرنی چاہیئے۔"

میں ان وکیل صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ پارسی رستم جی نے ان کی بات کاٹ کر کہا: "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر میں اس مقدمے کو مسٹر گاندھی کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے معاملات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جب ضرورت ہوگی یہ آپ سے مشورہ لے لیں گے۔"

وہاں سے اُٹھ کر ہم دونوں رستم جی کی دوکان پر پہنچے۔ اب میں نے انھیں اپنی رائے بتائی: "میرے خیال میں مقدمے کو عدالت تک نہیں جانے دینا چاہیئے۔ مقدمہ چلانا یا نہ چلانا چنگی کے افسر کے اختیار میں ہے اور وہ اٹارنی جنرل سے رائے لے گا۔ میں ان دونوں کے پاس چلتا ہوں۔ میری رائے میں وہ جو کچھ جرمانہ تجویز کریں آپ دے دیجئے۔ غالباً وہ اس پر راضی ہو جائیں گے۔ اگر نہ ہوئے تو آپ جیل جانے کو تیار رہیئے۔ میرا تو

یہ عقیدہ ہے کہ جیل جانے میں اس قدر شرم اور ذلت نہیں جتنی جرم کے ارتکاب میں ہے۔ شرم کی جو بات تھی وہ تو ہو چکی۔ اب جیل جانے کو آپ ایک طرح کا کفارہ سمجھئے مگر اصلی کفارہ یہ ہے کہ آپ آیندہ کے لئے اس حرکت سے توبہ کیجئے۔"

پارسی رستم جی کو یہ باتیں ناگوار ہوئی ہونگی۔ وہ بڑے بہادر آدمی تھے مگر اس وقت اُن کی ہمت نے جواب دیدیا تھا۔ ان کی عزت آبرو خطرے میں تھی۔ وہ دل میں کہتے ہوں گے "یہ عمارت جو میں نے بڑی محنت سے کھڑی کی ہے مسمار کر بیٹھ گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔"

انھوں نے کہا "میں نے تو سب کچھ آپ ہی پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں کیجئے۔"

میں نے اپنی ساری شیوا بیانی اس معاملے میں صرف کر دی۔ چنگی کے افسر کے پاس جا کر میں نے اُس سے سارا واقعہ صاف صاف بیان کر دیا۔ میں نے کہا کہ آپ سارے بہی کھاتے دیکھ لیجئے اور جو جرمانہ مناسب سمجھیں لے لیجئے۔ رستم جی کی حالت رحم کے قابل ہے۔ بیچارے اپنے قصور پر بے حد نادم ہیں۔"

اس نے کہا "مجھے یہ بوڑھا پارسی بہت پسند ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نے ایسی حماقت کی۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میرا فرض اس معاملے میں کیا ہے۔ میں اٹرنی جنرل سے رائے لینے پر مجبور ہوں۔ آپ ان کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔"

میں نے کہا "اگر آپ معاملے کو عدالت تک نہ جانے دیں تو بڑا احسان ہوگا۔"

ان سے یہ وعدہ لے کر میں اٹرنی جنرل سے ملا۔ انھیں میری صاف گوئی پسند آئی اور یہ یقین ہو گیا کہ میں نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

مجھے یاد نہیں کہ یہی معاملہ تھا یا کوئی اور تھا جس میں انہوں نے میری صاف گوئی اور اصرار سے مجبور ہو کر کہا تھا "معلوم ہوتا ہے آپ کبھی اپنی بات منوائے بغیر نہیں رہتے۔"

رستم جی والے مقدمے میں سمجھوتا ہو گیا۔ انہوں نے جتنے محصول کی چوری کا اقرار کیا تھا اس کا دو چند جرمانہ اُنھیں ادا کرنا پڑا۔

رستم جی نے سارا واقعہ لکھ کر ایک چوکھٹے میں لگایا اور اپنے دفتر میں ٹنکا دیا کہ ان کے وارثوں اور دوسرے تاجروں کو عبرت ہو۔

رستم جی کے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان کی اس عارضی ندامت سے دھوکا نہ کھائیے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے "آپ کو دھوکا دے کر میں جاؤں گا کہاں؟"

تلاشِ حق

حصہ پنجم

پہلا باب

پہلا تجربہ

ہم وطن پہنچے تو فنیکس والے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میرا قصد ان سے پہلے پہنچنے کا تھا مگر جب میں انگلستان میں لڑائی کے بکھیڑے میں پڑ گیا اور میری واپسی کا کچھ ٹھیک نہ رہا تو مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں ان لوگوں کے قیام کا کیا انتظام ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے یہ سب ساتھ رہیں اور وہی پرانی زندگی بسر کریں۔ میری نظر میں کوئی ایسا آشرم نہیں تھا جہاں یہ رہ سکیں اس لئے میں نے انہیں تار دے دیا کہ مسٹر اینڈریوز سے مل کر ان کی رائے پر عمل کریں۔

چنانچہ پہلے یہ لوگ کانگڑی کے گرو کل میں گئے جہاں سوامی شردھانند نے انہیں اپنے بچوں کی طرح رکھا اس کے بعد شانتی نکیتن کے آشرم میں ٹگور اور ان کے رفیقوں کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ دونوں جگہ رہ کر انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا وہ میرے لئے اور ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔

میں اینڈریوز سے کہا کرتا تھا کہ آپ کی تثلیث مہا کوی ٹگور، پرنسپل سوشیل رُدرا اور شردھانند جی پر مشتمل ہے۔ جنوبی افریقہ میں وہ ہمیشہ ان تینوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی باتیں اب تک میرے دل پر نقش ہیں اور ان کی یاد بہت خوشگوار ہے۔

شانتی نکیتن میں اینڈریوز نے فنیکس والوں کو سوشیل رُدرا کے سپرد کر دیا۔ پرنسپل رُدرا کا کوئی آشرم نہیں تھا، ایک گھر تھا جو انہوں نے فنیکس کے خاندان کو دے دیا۔

شانتی نکیتن والے ان سے اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے دل سے فنیکس کی یاد جاتی رہی۔

مجھے بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ منکس والے شانتی نکیتن میں ہیں۔ مجھے یہ بے تابی تھی کہ گوکھلے کی زیارت کرنے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے ان سے جا ملوں۔ بمبئی میں میرے استقبال میں اسقدر اہتمام ہوا کہ مجھے چھوٹی سی ستیاگرہ کرنا پڑی۔

مسٹر جہانگیر پٹیٹ کے گھر پر جو پارٹی مجھے دی گئی اس میں میری ہمت نہ پڑی کہ گجراتی میں تقریر کروں۔ اُس عالیشان محل میں میرا جیسا شخص، جس کی زندگی کا اکثر حصہ پابند مزدوروں کی صحبت میں گذرا تھا، بالکل گنوار معلوم ہوتا تھا۔ میں ان دنوں کاٹھیاواڑی انگرکھا پہنتا تھا اور پگڑی اور دھوتی باندھتا تھا۔ اس وضع میں میں آجکل کے مقابلے میں زیادہ مہذب نظر آتا تھا لیکن مسٹر پٹیٹ کے محل کی شان و شوکت میں کیسے کھپ سکتا تھا؟ بہر حال میں نے سر فیروز شاہ مہتا کا سہارا لے کر کسی طرح کام چلایا۔

اس کے بعد گجراتیوں کے جلسے میں جانا پڑا۔ یہ جلسہ اُتام لال ترویدی آنجہانی کے اہتمام میں کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا پروگرام پہلے سے معلوم کر لیا تھا۔ مسٹر جناح، جو گجراتی ہیں، وہاں موجود تھے مگر یہ یاد نہیں کہ وہ جلسے کے صدر تھے یا اُس کے ترجمان۔ انہوں نے انگریزی میں ایک اعلیٰ درجے کی چھوٹی سی تقریر کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اکثر تقریریں انگریزی میں ہوئیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے گجراتی میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا کہ میں گجراتی اور ہندوستانی کو انگریزی پر ترجیح دیتا ہوں اور عاجزی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتا ہوں کہ گجراتیوں کے مجمعے میں تقریریں انگریزی میں کی گئیں۔ یہ بات میں نے ڈرتے ڈرتے کہی تھی کہ کہیں ایک نئے آدمی کا، جو مدت تک جلاوطن رہنے کے بعد گھر لوٹا ہے، عام رواج پر اعتراض کرنا خلاف تہذیب نہ سمجھا جائے۔ مگر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ لوگوں نے میرے اعتراض کو چپ چاپ سن لیا۔

اس سے میری ہمت بندھ گئی اور میرے دل میں یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ مجھے اپنے انوکھے خیالات اپنے ہموطنوں کے سامنے پیش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

چند دن بمبئی ٹھہر کر میں ان پہلے تجربوں کے نشے میں سرشار، گوکھلے سے ملنے پونا روانہ ہوگیا۔

دوسرا باب

گوکھلے کے ساتھ پونا میں

جیسے ہی میں بمبئی میں داخل ہوا گوکھلے کا پیام پہنچا کہ گورنر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ پونا آنے سے پہلے ان سے مل لو۔ چنانچہ میں ہز ایکسیلینسی کی خدمت میں حاضر ہوا پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا:

"میں آپ سے ایک بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ جب کبھی کوئی ایسی تجویز سوچیں جس کا تعلق گورمنٹ سے ہو تو مجھ سے ضرور مل لیا کریں۔"

میں نے جواب دیا "مجھے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ میں ستیاگرہی ہوں۔ میرا تو یہ اصول ہی ہے کہ اپنے مخالفوں کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان میں جو باتیں مجھے معقول نظر آئیں، مان لوں۔ جنوبی افریقہ میں میں نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور یہاں بھی کروں گا۔"

لارڈ ولنگڈن نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا "آپ کا جب جی چاہے میرے پاس چلے آیا کیجئے۔ آپ دیکھ لیں گے کہ میری گورمنٹ جان بوجھ کر برائی نہیں کرنا چاہتی۔"

میں نے اس کے جواب میں عرض کیا "اسی عقیدے کی بدولت میری ہمت بندھی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد میں پونا گیا۔ ان مبارک دنوں کے بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں مگر ان سب کو یہاں بیان نہیں کرسکتا۔ گوکھلے اور انجمن خدام ہند[1] کے ممبروں نے مجھے

---

[1] Servants of India Society

محبت کی دولت سے مالامال کر دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گوکھلے نے کل ممبروں کو مجھ سے ملانے کے لئے بلایا تھا۔ میں نے ان سے ہر قسم کے موضوع پر آزادی سے گفتگو کی۔

گوکھلے دل سے چاہتے تھے کہ میں انجمن کا ممبر بن جاؤں اور میری بھی یہی آرزو تھی۔ مگر ممبروں کا یہ خیال تھا کہ میرے اور ان کے نصب العین اور طریق کار میں بہت فرق ہے اس لئے میرا انجمن میں شامل ہونا مناسب نہیں۔

گوکھلے کو میرے متعلق یقین تھا کہ گو میں اپنے اصول کا سختی سے پابند ہوں مگر ان لوگوں سے، جن کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہو، رواداری برت سکتا ہوں۔

انہوں نے مجھ سے کہا "مشکل یہ ہے کہ انجمن کے ممبروں کو ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا کہ تمہاری طبیعت میں سازگاری کی کتنی صلاحیت ہے۔ یہ لوگ اپنے اصول کے پکے ہیں اور اپنی رائے میں آزاد ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ تمہیں ممبر بنانے پر راضی ہو جائیں گے لیکن اگر نہ بھی ہوں تو تم یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ ان کے دل میں تمہاری وقعت اور محبت نہیں۔ انھیں زیادہ تامل اسی لئے ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے کی وجہ سے تمہارا احترام ان کی نظر میں کم ہو جائے۔ مگر چاہے تم باضابطہ ممبر بنائے جاؤ یا نہ بنائے جاؤ میں تو تمہیں ممبر سمجھوں گا۔"

میں نے ان سے کہا میرا ارادہ ہے کہ خواہ میں انجمن میں داخل کیا جاؤں یا نہ کیا جاؤں دونوں صورتوں میں اپنا ایک الگ آشرم گجرات کے کسی حصے میں قائم کروں کیونکہ میں گجراتی ہوں اور مجھے اسی میں آسانی ہے کہ گجرات کی خدمت کے ذریعے سے ہندوستان کی خدمت کروں۔

گوکھلے کو یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے کہا: "تم آشرم ضرور قائم کرو۔ انجمن کے ممبروں سے تم سے کوئی سمجھوتا ہو یا نہ ہو میں تمہارے آشرم کو اپنا آشرم سمجھوں گا اور اس کا کل خرچ دوں گا۔"

میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میرے لئے اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا تھا کہ چندہ

جمع کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہوں اور مجھے یہ اطمینان رہے کہ سب کچھ مجھی کو نہیں کرنا ہے بلکہ ایک رہنما موجود ہے جو مشکلوں میں میری مدد کرے گا۔ گوکھلے کے اس وعدے سے میرے دل سے بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

انھوں نے ڈاکٹر دیو آنجہانی کو بلا کر حکم دیا کہ انجمن کے کھاتے میں ان کا حساب کھول دیا جائے اور انھیں آشرم کے اور قومی کاموں کے لئے جتنے روپئے کی ضرورت ہو، دے دیا جائے۔

اب میں نے شانتی نکیتن جانے کی تیاری کی۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے گوکھلے نے اپنے خاص دوستوں کی چائے کی دعوت کی۔ میرے خیال سے انھوں نے میری پسند کی چیز یعنی خشک اور تر میوہ منگوایا۔ یہ پارٹی ان کے کمرے سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوئی مگر ان میں وہاں تک جانے کی طاقت نہیں تھی۔ پھر بھی میری محبت انھیں وہاں تک کھینچ لائی۔ آنے کو تو وہ آ گئے مگر اتنی تکان ہوئی کہ انھیں غش آ گیا اور لوگ انھیں اُٹھا کر لے گئے۔ یہ غشی کے دورے انھیں اکثر ہوا کرتے تھے۔ اس لئے جب انھیں ہوش آیا تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ پارٹی میں دیر نہ کی جائے۔

یہ پارٹی چند دوستوں کا مجمع تھا جو انجمن کے مہمان خانے کے سامنے زیر آسمان بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے اور بیچ بیچ میں مونگ پھلی، کھجوریں اور موسمی پھل کھائے جاتے تھے۔

مگر یہ غشی کا دورہ میری زندگی میں ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔

تیسرا باب

کیا یہ دھمکی تھی؟

پونا سے میں راجکوٹ اور پوربندر گیا جہاں مجھے اپنی بھاوج اور دوسرے عزیزوں سے ملنا تھا۔ جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کے زمانے میں میں نے اپنی وضع "پابند مزدوروں" کی سی بنائی تھی اور انگلستان میں بھی گھر کے اندر یہی کپڑے پہنتا تھا۔ بمبئی میں جہاز سے اُترنے سے پہلے میں نے کاٹھیاواڑی لباس پہن لیا تھا یعنی کُرتا، انگرکھا، دھوتی، پگڑی اور گلے میں آڑا دوپٹہ۔ یہ سب چیزیں سودیشی تھیں۔ مگر چونکہ مجھے بمبئی سے تیسرے درجے میں سفر کرنا تھا اس لئے میں نے انگرکھے اور دوپٹے کو خیرباد کہی اور پگڑی کی جگہ ایک آٹھ دس آنے کی کشمیری ٹوپی سر پر رکھ لی۔ اس وضع میں جو شخص مجھے دیکھتا وہ غریب آدمی سمجھتا۔

اُس زمانے میں طاعون پھیلا ہوا تھا اور ویرام گام یا ودھوان میں تیسرے درجے کے مسافروں کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا تھا۔ مجھے خفیف سی حرارت تھی۔ انسپکٹر نے یہ دیکھ کر میرا نام لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ تم راجکوٹ کے میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو جانا۔

شاید کسی شخص نے یہ اطلاع دیدی تھی کہ میں ودھوان اسٹیشن سے گذروں گا کیوں کہ موتی لال درزی جو وہاں کے مشہور قومی کارکن تھے مجھ سے ملنے اسٹیشن پہنچے۔ انہوں نے ویرام گام کے حالات سنائے کہ وہاں ریل کے مسافروں کو کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ میری طبیعت بخار کے سبب سے باتیں کرنے کو نہیں چاہتی تھی اس لئے میں نے گفتگو کو مختصر کرنے کے خیال سے پوچھا "تم لوگ جیل جانے کو تیار ہو؟" میں سمجھتا تھا کہ موتی لال ان جلد باز نوجوانوں میں سے ہیں جو بے سمجھے بوجھے جو جی میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں۔ مگر یہ بات نہیں تھی

انھوں نے استقلال کے لہجے میں جواب دیا:

"بیشک ہم تیار ہیں بشرطیکہ آپ ہماری رہنمائی کریں۔ ہم کاٹھیاواریوں کا آپ پر جتنا حق ہے کسی کا نہیں۔ اس وقت ہم آپ کو روکنا نہیں چاہتے مگر آپ یہ وعدہ کرلیجئے کہ واپسی میں یہاں ضرور ٹھہریں گے۔ آپ ہمارے یہاں کے نوجوانوں کا جوش اور ان کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور آپ جو حکم دینگے اُس کی فوراً تعمیل ہوگی۔"

موتی لال نے میرے دل میں جگہ کرلی۔ اُن کے ساتھی نے ان کی تعریف میں کہا:

"میرے دوست ہیں تو درزی مگر اپنے فن میں اس قدر ماہر ہیں کہ ایک گھنٹہ روز کام کرکے پندرہ روپیہ مہینہ کما لیتے ہیں، جو ان کے خرچ کے لئے کافی ہے اور باقی وقت قومی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ ہم پڑھے لکھے لوگ انھیں اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ ان کا خلوص اور ایثار دیکھ کر ہمیں اپنے اوپر شرم آتی ہے۔"

آگے چل کر میرا موتی لال سے بہت سابقہ رہا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس تعریف میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا۔ انھوں نے یہ معمول کرلیا کہ ہمارے نئے آشرم میں ہر مہینے چند روز کے لئے آتے تھے، ہم لوگوں کے کپڑے سیتے تھے اور ہمیں درزی کا کام سکھاتے تھے۔

وہ ہمیشہ ویرم گام کے حالات سنایا کرتے تھے اور مسافروں کی تکلیفوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ صدمہ ان سے کسی طرح برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دن کے بعد وہ دفعتہً بیمار پڑے اور عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وڈھوان کی قومی زندگی کو ان کی وفات سے بڑا نقصان پہنچا۔

غرض میں راجکوٹ پہنچ گیا اور دوسرے دن صبح کو میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہوا۔ وہاں لوگ مجھ سے ناواقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور انھیں انسپکٹر پر بڑا غصہ آیا۔ ان کی یہ خفگی بیجا تھی کیونکہ انسپکٹر نے تو اپنا فرض ادا کیا تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتا تھا اور اگر جانتا بھی ہوتا تو اُسے یہی کرنا چاہئے تھا۔ میڈیکل افسر نے بڑے اصرار سے مجھے

دوبارہ اس کے پاس جانے سے روکا اور ایک دوسرے انسپکٹر کو میرے گھر پر بھیج دیا۔

ایسے موقعوں پر تیسرے درجے کے مسافروں کا طبی معائنہ حفظان صحت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اگر بڑے آدمی تیسرے درجے میں سفر کریں تو انھیں خود بخود ان تمام ضابطوں کی پابندی کرنا چاہئے جو غریبوں کے لئے مقرر ہیں اور سرکاری ملازموں کو غریب اور امیر میں فرق نہیں کرنا چاہئے۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ سرکاری ملازم تیسرے درجے کے مسافروں کو اپنا ہم جنس نہیں بلکہ بھیڑ بکری سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ حقارت سے گفتگو کرتے ہیں اور انھیں یہ برداشت نہیں کہ کوئی ان کی بات کا جواب دے یا ان سے بحث کرے۔ بیچارے مسافر نوکروں کی طرح ان کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ بے تکلف انھیں مار بیٹھتے ہیں، ان سے ڈرا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں اور انھیں ٹکٹ تک رُلا رُلا کے دیتے ہیں، چاہے ان کی گاڑی کیوں نہ چھوٹ جائے۔ یہ سب باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں۔ اس کی اصلاح کی صرف یہی صورت ہے کہ چند تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگ غریبوں کی وضع اختیار کرکے تیسرے درجے میں سفر کیا کریں، اگر ان کے ساتھ غریبوں کے مقابلے میں کوئی رعایت کی جائے تو قبول نہ کریں اور جس تکلیف، بدسلوکی، بے انصافی کا دور کرنا ممکن ہو اسے چپ چاپ سہنے کے بجائے اس کے خلاف احتجاج کریں۔

میں کاٹھیاواڑ میں جہاں کہیں گیا میں نے یہی شکایت سُنی کہ ویرام گام میں چنگی والے مسافروں کو بہت دق کرتے ہیں۔ اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ لارڈ ولنگڈن کی فرمائش سے فائدہ اُٹھاؤں۔ اس مسئلے کے متعلق جتنا مواد مل سکا میں نے جمع کیا اور اس کو غور سے پڑھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں بجا ہیں تو میں نے حکومت بمبئی سے خط و کتابت شروع کی۔ میں لارڈ ولنگڈن کے پرائیویٹ سیکرٹری سے ملا اور خود ہز اکسیلینسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ موصوف نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اس معاملے میں اپنی مجبوری ظاہر کرکے دہلی کے حکام کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا "اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم کب کے

اس چوکی کو اٹھا لیے ہوتے۔ آپ حکومت ہند سے درخواست کیجیے"۔

میں نے حکومت ہند کو لکھا لیکن سوائے خط کی رسید کے کوئی جواب نہیں ملا۔ بہت دنوں بعد جب مجھے لارڈ چیمسفورڈ سے ملنے کا اتفاق ہوا تب جا کر شنوائی ہوئی۔ میں نے اُن سے سارے واقعات بیان کیے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھیں اس معاملے کی خبر تک نہیں کی گئی تھی۔ انھوں نے میری گفتگو بہت غور سے سُنی، فوراً ٹیلیفون کر کے ویرام گام کے کاغذات منگوائے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر چنگی کا محکمہ کوئی معقول وجوہ نہ پیش کر سکا تو اس چنگی کو منسوخ کر دینگے۔

چند روز کے بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ویرام گام کی چنگی کی چوکی اُٹھا دی گئی۔

اس واقعے کو میں نے ہندوستان میں ستیاگرہ کا آغاز سمجھا۔ کیونکہ جب میں گورنر بمبئی کے سیکریٹری سے ملا تھا تو انھوں نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا کہ میں نے اپنی بگاسرا[1] کی تقریر میں ستیاگرہ کا ذکر کیا۔

انھوں نے پوچھا تھا "کیا یہ دھمکی نہیں ہے؟ کیا آپ کے خیال میں ایک بااقتدار حکومت ان دھمکیوں سے دب جائے گی؟"

میں نے اس کے جواب میں کہا تھا "یہ دھمکی نہیں ہے۔ یہ عوام کو سیاسی تعلیم دینے کا ایک طریقہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ ملک کے سامنے وہ تمام جائز تدبیریں پیش کر دوں جن سے رعایا اپنی شکایتوں کو دور کرا سکتی ہے۔ جو قوم اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے اُسے آزادی کے کل طریقے معلوم ہونا چاہیے۔ عموماً ایسی صورتوں میں مجبور ہو کر تشدد سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر ستیاگرہ ایسا حربہ ہے جسے تشدد سے کوئی سروکار نہیں۔ میں لوگوں کو یہ بتانا اپنا دھرم سمجھتا ہوں کہ اس حربے کو کیسے اور کس حد تک استعمال کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ برطانوی حکومت بڑا اقتدار رکھتی ہے مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ستیاگرہ میں بہت بڑی قوت ہے۔"

اس پر مدبر سیکریٹری نے شبہہ کے انداز میں سر ہلا کر کہا تھا "خیر یہ بھی دیکھ لیں گے۔"

---

[1] کاٹھیاواڑ کا ایک مقام۔

چوتھا باب

شانتی نکیتن

راجکوٹ سے میں شانتی نکیتن گیا۔ وہاں کے استاد اور طالب علم مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ میرے استقبال میں جو سامان کیا گیا وہ آرائش، سادگی اور خلوص کا خوشنما مجموعہ تھا۔ یہاں مجھے اپنی عمر میں پہلی بار کاکا صاحب کلیلکر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

میں اُس وقت تک یہ نہیں جانتا تھا کہ کلیلکر کا لقب کاکا صاحب کیوں ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ میرے دوست کیشور اوجی دیشپانڈے نے، جو انگلستان میں میرے ساتھ تھے، بڑودے میں گنگاناتھ ودیالا کے نام سے ایک اسکول قائم کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ سب استاد شاگرد ایک خاندان کے لوگوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اس لئے انہوں نے استادوں کے لقب رشتوں کے نام پر رکھے تھے۔ کلیلکر اس اسکول میں پڑھایا کرتے تھے، اس لئے یہ کاکا صاحب (چچا جان) کہلانے لگے۔ پھڈکے کا لقب "ماما" (ماموں جان) اور ہری ہر شرما کا "انّا" (بھائی جان) تھا۔ اور استاد بھی اسی طرح کے ناموں سے پکارے جاتے تھے مثلاً انند انند جو کاکا صاحب کے دوست تھے "سوامی" اور پٹوردھن جو "ماما" کے دوست تھے "اَپا" کہلاتے تھے۔ یہ سب لوگ آگے چل کر یکے بعد دیگرے میرے رفیق بن گئے۔ خود دیشپانڈے جی "صاحب" کہے جاتے تھے۔ جب یہ اسکول ٹوٹ گیا تو خاندان کے لوگ منتشر ہو گئے مگر انہوں نے اپنے لقب اور آپس کے روحانی رشتے بدستور باقی رکھے۔

کاکا صاحب مختلف تعلیمی اداروں کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے سفر کر رہے تھے۔ جس زمانے میں میں شانتی نکیتن گیا اتفاق سے وہیں موجود تھے اور ان کے ساتھ ان کی برادری

کے اور شخص چنتامن شاستری بھی تھے۔ یہ دونوں وہاں سنسکرت پڑھاتے تھے۔

فنیکس والے شانتی نکیتن میں ایک علیحدہ مکان میں رکھے گئے تھے۔ ان کے سرگروہ مگن لال گاندھی یہاں بھی سختی کے ساتھ فنیکس آشرم کے ضابطوں کی پابندی کراتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی محبت، قابلیت اور مستعدی کا سکہ سارے شانتی نکیتن پر بٹھا دیا ہے۔

وہاں اینڈریوز بھی تھے اور پیرسن بھی۔ بنگالی استادوں میں سے ہمارا زیادہ میل جول جگدانند بابو، نیپال بابو، سنتوش بابو، کھتی موہن بابو، ناگن بابو، شاردا بابو اور کالی بابو سے تھا۔

میں حسب معمول بہت جلد یہاں کے اُستادوں اور طالب علموں میں گھل مل گیا اور میں نے ان سے اپنا کام آپ کرنے کے مسئلے پر بحث چھیڑ دی۔ میں نے استادوں سے کہا کہ اگر آپ اور آپ کے شاگرد اپنا کھانا تنخواہ دار باورچیوں سے نہ پکوائیں بلکہ خود پکائیں تو آپ لڑکوں کی جسمانی اور اخلاقی صحت کے نقطۂ نظر سے باورچی خانے کی نگرانی کرسکیں گے اور لڑکوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی تربیت ملے گی۔ ان میں سے دو ایک نے شبہہ کے انداز میں سر ہلایا۔ بعض نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ لڑکوں نے بڑے جوش وخروش سے اسکی تائید کی کیونکہ ان کو تو نئی باتوں کا شوق ہوتا ہی ہے۔ غرض ہم نے یہ تجربہ شروع کر دیا۔ میں نے مہاکوی ٹیگور سے درخواست کی کہ آپ بھی اس معاملے میں رائے دیجیے تو انہوں نے فرمایا اگر استاد راضی ہوں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ لڑکوں سے انہوں نے کہا "یہی چیز سوراج کی کنجی ہے۔"

پیرسن نے اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی محنت کی۔ انہیں اس میں بیحد جوش اور انہماک تھا۔ استادوں اور شاگردوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بنائے گئے اور ان میں سارا کام تقسیم کر دیا گیا۔ کچھ لوگ ترکاری چھیلتے تھے، کچھ غلہ بینتے اور پھٹکتے تھے۔ ناگن بابو

اور ان کے ساتھیوں نے باورچی خانے وغیرہ کی صفائی کا ذمہ لیا۔ انہیں ہاتھ میں جھاڑو لئے کام کرتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔

لیکن سوا سو لڑکوں اور ان کے اُستادوں کو جسمانی محنت کا عادی بنانا سہل نہ تھا۔ روز جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ بعض لوگ تھوڑے ہی دن میں تھک گئے۔ مگر پیرسن ہمت ہارنے والے اسامی نہ تھے۔ جب دیکھئے کشادہ روئی سے کوئی نہ کوئی کام کرتے نظر آتے تھے۔ بڑے برتنوں کا مانجنا انہوں نے اپنے ذمے رکھا تھا۔ جب برتن مانجے جاتے تو چند طالب علم بیٹھ کر ستار بجاتے کہ مانجنے والوں کو یہ کٹھن کام کھلنے نہ پائے۔ غرض سب اپنے اپنے کام میں منہمک رہتے تھے اور شانتی نکیتن شہد کی مکھیوں کا چھتا بن گیا تھا۔

ایسے کاموں کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو اس میں نئی نئی شاخیں نکل آتی ہیں فینکس والے بھی اپنا کھانا خود پکاتے تھے مگر ان کی غذا بالکل سادہ تھی۔ مسالہ نام کو بھی نہیں پڑتا تھا۔ چاول، دال ترکاری، گیہوں کا آٹا سب چیزیں ملا جلا کر بھاپ کے چولھے میں پکائی جاتی تھیں۔ شانتی نکیتن کے بعض لڑکوں نے بھی بنگالی غذا میں اصلاح کرنے کے لئے اس قسم کا کھانا پکانا شروع کیا۔ دو ایک استاد اور چند لڑکے مل کر یہ تجربہ کرتے تھے۔

یہ کارخانہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ مگر میرے خیال میں اس تھوڑے عرصے میں شانتی نکیتن کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی پہنچا۔ اُستادوں کو جو تجربے ہوئے وہ بے کار نہیں کہے جا سکتے۔

میرا ارادہ تھا کہ ابھی کچھ دن شانتی نکیتن میں ٹھہروں مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا مجھے وہاں آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پونا سے تار آیا کہ گوکھلے کا انتقال ہو گیا۔ سارے شانتی نکیتن پر اُداسی چھا گئی۔ سب لوگ میرے پاس تعزیت کے لئے آئے۔ آشرم کے مندر میں ماتمی جلسہ کیا گیا۔ بڑا دلدوز منظر تھا۔ میں اُسی دن اپنی بیوی اور مگن لال کو ساتھ لیکر پونا چلا گیا۔ اور لوگ شانتی نکیتن ہی میں رہے۔

اینڈریوز مجھے پہنچانے بردوان تک آئے۔ انھوں نے اثنائے گفتگو میں مجھ سے

پوچھا "کیا آپ کے خیال میں کبھی ہندوستان میں بھی ستیاگرہ کا وقت آئے گا؟ اور اگر آئے گا تو کب آئے گا؟ میں نے کہا "اس کا جواب مشکل ہے۔ ایک سال تک میں کچھ نہیں کر سکتا۔ گوکھلے نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ ایک سال تک ہندوستان میں تجربہ حاصل کرنے کے لئے سفر کروں گا اور اس عرصے میں قومی معاملات پر کوئی رائے ظاہر نہیں کروں گا۔ بلکہ میں ایک سال گذرنے کے بعد بھی اپنی رائے کے اظہار میں جلدی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے خیال میں ابھی پانچ برس ستیاگرہ کا امکان نہیں۔"

اسی سلسلے میں یہ بھی کہدوں کہ گوکھلے میری کتاب "ہند سوراج" کے بعض خیالات پر ہنسا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے: "ایک سال ہندوستان میں رہنے کے بعد تمہارے خیالات خود بخود راہ پر آجائیں گے۔"

پانچواں باب

تیسرے درجے کے مسافروں کی مصیبت

بردوان میں ہمیں اس مصیبت کا سامنا ہوا جو تیسرے درجے کے مسافروں کو ٹکٹ لینے تک میں بھگتنا پڑتی ہے۔ جب میں نے ٹکٹ مانگا تو جواب ملا "تیسرے درجے کے ٹکٹ گاڑی آنے سے اتنے پہلے نہیں بٹتے"! میں اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اول تو اُسے ڈھونڈھنے ہی میں بڑی مشکل ہوئی۔ خدا خدا کر کے ملا تو اُس نے بھی وہی جواب دیا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلتے ہی میں وہاں پہنچا۔ مگر مسافروں کی وہ ریل پیل تھی کہ ٹکٹ لینا سہل نہ تھا۔ "جسکی لاٹھی اسکی بھینس" کا معاملہ تھا۔ ہٹے کٹے لوگ جنھیں دوسروں کا مطلق خیال نہ تھا مجھے ڈھکیل کر ٹکٹ لے لیتے تھے۔ پہلے گروہ میں جتنے لوگ تھے ان سب کے بعد مجھے ٹکٹ ملا۔

اب گاڑی آئی۔ اُس میں گھُس بیٹھ کر بیٹھنا ٹکٹ لینے سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ اندر کے اور باہر کے مسافروں میں خوب گالی گلوج، دھکم دھکا ہو رہی تھی۔ ہم کئی بار دوڑتے ہوئے اس سرے سے اُس سرے تک گئے، مگر سب کہیں یہی جواب ملا "یہاں بالکل جگہ نہیں ہے"۔ میں نے گارڈ سے کہا۔ اُس نے جواب دیا "جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ ورنہ دوسری گاڑی سے چلے جانا"۔

میں نے ادب سے کہا "مجھے بڑا ضروری کام ہے"۔ مگر اُسے میری بات سننے کی فرصت نہ تھی۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے مگن لال سے کہا جہاں ہو سکے بیٹھ جاؤ اور میں اپنی بیوی کو لے کر ڈیوڑھے درجے میں بیٹھ گیا۔ گارڈ نے ہمیں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اسنسول کے اسٹیشن پر وہ زائد کرایہ وصول کرنے پہنچا۔ میں نے اُس سے کہا:

"آپ کا فرض تھا کہ ہمیں جگہ دیتے۔ ہمیں کہیں جگہ نہیں ملی اس لیے اس درجے میں

بیٹھ گئے۔ اگر آپ ہمیں تیسرے درجے میں بٹھا سکیں تو ہم خوشی سے چلنے کو تیار ہیں۔"

اُس نے جواب دیا "بس زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں تیسرے درجے میں جگہ نہیں دے سکتا۔ کرایہ دینا ہے تو دو ورنہ گاڑی سے اُتر جاؤ۔"

مجھے کسی نہ کسی طرح پُونا پہنچنا تھا۔ اس لئے میں گارڈ سے لڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے چپ چاپ پُونا تک کا زائد کرایہ دیدیا۔ مگر یہ بے انصافی مجھے بہت ناگوار ہوئی۔

صبح کو ہم مغلسرائے پہنچے۔ مگن لال گھس بیٹھ کر تیسرے درجے میں بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی اُسی میں چلا گیا۔ میں نے ٹکٹ اگزامنر سے اس بات کا سرٹیفکیٹ مانگا کہ میں مغلسرائے سے تیسرے درجہ میں بیٹھا ہوں۔ اُس نے انکار کر دیا۔ بعد میں میں نے ریل کے اعلیٰ افسر کو درخواست دی۔ وہاں سے جواب ملا "ہم بغیر سرٹیفکیٹ کے زائد کرایہ واپس نہیں دیا کرتے۔ مگر آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ تاہم بَردوان سے مغلسرائے تک کا زائد کرایہ واپس نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد مجھے تیسرے درجے کے سفر کے ایسے ایسے تجربے ہوئے کہ اگر لکھنے پر آؤں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ مگر یہاں میں جا بجا سرسری طور پر ایک آدھ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ جسمانی کمزوری کے سبب سے مجھے تیسرے درجے میں سفر کرنا چھوڑنا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کی تکلیفوں کا بڑا سبب ریل کے ملازموں کی بیجا سختی ہے۔ مگر خود مسافروں کی بدتمیزی، غلاظت، خود غرضی اور جہالت بھی کچھ کم قابل الزام نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اکثر انھیں اپنی برائیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں یہی کرنا چاہئے۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ "تعلیم یافتہ" لوگ ان کی اصلاح کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔

غرض ہم تھکے ماندے کلیان پہنچے۔ میں نے اور مگن لال نے اسٹیشن کے بمبے سے پانی

سے کر اغماض کیا۔ میں اپنی بیوی کے نہانے کا بندوبست کر رہا تھا کہ "انجمن خدام ہند" کے رکن کول جی نے ہمیں دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ ان خاتون کو دوسرے درجے کے غسل خانے میں نہا لینے دیجئے۔ میں جانتا تھا کہ میری بیوی کو اس غسل خانے کے استعمال کا کوئی حق نہیں مگر میں نے اُس وقت اس بے عنوانی سے چشم پوشی کی۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ بات حق کے طالب کے لئے مناسب نہیں ہے۔ میری بیوی کو یہ خواہش نہیں تھی کہ اس غسل خانے میں نہائیں مگر میرے دل میں بیوی کی محبت حق کی محبت پر غالب آ گئی۔ اُپانشد میں لکھا ہے کہ حق کا رُخ زیبا "مایا" کے سنہرے نقاب میں پوشیدہ ہے۔

چھٹا باب

محبت کی کشمکش

پونا پہنچ کر "شرادھ" کی رسم سے فراغت کرنے کے بعد یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انجمن کا مستقبل کیا ہوگا اور مجھے اس میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ میرے لیئے یہ مسئلہ بہت نازک تھا۔ جب تک گوکھلے زندہ تھے مجھے انجمن کا رکن بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میری رہنمائی کے لیئے اُن کی ذات کافی تھی۔ ہندوستانی سیاست کے تلاطم خیز سمندر میں سفر کرنے کیلئے مجھے ایک ناخدا کی ضرورت تھی اور گوکھلے کا دامن تھام لینے سے یہ مشکل حل ہوگئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں بیکس و تنہا رہ گیا اور اب میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انجمن کا رکن بن جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ گوکھلے کی روح اس بات سے خوش ہوگی۔ اس لیئے میں نے بے تامّل داخلے کی کوشش شروع کردی۔

اس موقعے پر انجمن کے اکثر ممبر پونا میں موجود تھے۔ میں نے ان سے مل کر اس مسئلے کو چھیڑا اور ان کے دل میں میری طرف سے جو شبہے تھے انھیں دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان میں اختلاف رائے ہے۔ ایک فریق میرے داخلے کے موافق تھا اور دوسرا بہت سختی سے مخالفت کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دونوں کو مجھ سے مساوی محبت ہے مگر وہ انجمن کے مفاد کو مقدم سمجھتے تھے۔

اس لیئے ہمارے مشوروں میں کبھی تلخ کلامی کی نوبت نہیں آتی تھی بلکہ محض اصولی بحث ہوا کرتی تھی۔ جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے ان کا یہ قول تھا کہ بہت سے اہم معاملات میں میری اور ان کی رائے میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لیئے میرے ممبر ہونے سے انجمن کے بنیادی مقاصد کو نقصان پہنچنے کا خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے کیونکر برداشت

کر سکتے تھے۔

بڑی طول طویل بحث کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ یہ طے پایا کہ اس مسئلہ پر پھر کبھی غور کیا جائے گا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد میں عجب کشمکش میں پڑ گیا۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اگر میرا انتخاب کثرت رائے سے ہو تو مجھے ممبری قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟ کیا یہ گوکھلے سے بیوفائی نہ ہوگی؟ آخر مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جب میرے متعلق ممبروں میں اس قدر شدید اختلاف رائے ہے تو میرے لئے یہی مناسب ہے کہ داخلے کی درخواست واپس لے لوں اور فریق مخالف کو اس ناگوار صورتِ حال سے نجات دوں۔ مجھے انجمن سے اور گوکھلے سے جو محبت تھی اُس کا تقاضا یہی نظر آیا۔ یہ بات دفعتہً میرے ذہن میں آئی اور میں نے فوراً شاستری جی کو لکھا کہ انجمن کا ملتوی شدہ جلسہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے انھوں نے میرے اس فیصلے کی بہت تعریف کی۔ اس کے سبب سے اُن کی مشکل آسان ہوگئی اور ان میں اور مجھ میں دوستی کا رابطہ اور استوار ہوگیا۔ سچ پوچھیے، تو اس درخواست کے واپس لینے سے میں انجمن کا ممبر بن گیا۔

تجربے سے ثابت ہوگیا ہے کہ میرا انجمن کا باضابطہ ممبر نہ بننا بہت اچھا ہوا اور جو لوگ میرے داخلے کے مخالف تھے ان کی رائے بالکل صحیح تھی۔ میرے اور اُن کے خیالات میں جو اصولی اختلاف تھا وہ اب پوری طرح نمایاں ہوگیا ہے۔ مگر اس اختلاف کو تسلیم کر لینے سے ہماری باہمی دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم میں برادرانہ تعلقات بدستور قائم ہیں اور میں اکثر جا کر پونا میں انجمن کے مستقر کی زیارت کرتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میں انجمن کا باضابطہ ممبر نہیں بنا مگر روحانی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا رکن سمجھتا ہوں۔ یہ باطنی رشتہ ظاہری رشتے سے بدرجہا زیادہ قابل قدر ہے۔ ظاہری رشتہ بغیر باطنی اتحاد کے جسدِ بے روح کے مانند ہے۔

ساتواں باب

کُمبھ کا میلا

میں ڈاکٹر مہتا سے ملنے رنگون جا رہا تھا۔ راہ میں کلکتے میں بابو بھوپندر ناتھ باسو کے گھر ٹھہرا۔ یہاں مجھے بنگالیوں کی مہماں نوازی کا پورا اندازہ ہوا۔ ان دنوں میں سوائے میوے کے کچھ نہیں کھاتا تھا اس لئے کلکتے میں جتنے خشک اور تر میوے مل سکتے تھے سب میری خاطر مہیا کیے گئے۔ گھر کی عورتیں رات رات بھر جاگ کر میوہ چھیلتی تھیں۔ بڑے اہتمام سے سارے میوے ہندوستانی طریقے سے چھیل کر اور تراش کر میرے سامنے رکھے جاتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے لئے، جن میں میرا لڑکا رامداس بھی تھا، طرح طرح کے مزیدار کھانے پکتے تھے۔ میرے دل پر اس خاندان کی محبت اور مہماں نوازی کا بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ دو تین مہمانوں کی خاطر مدارات میں سارا گھر مصروف رہے۔ مگر ان تکلفات سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

رنگون جاتے وقت میں نے عرشے پر سفر کیا۔ باسو بابو کے یہاں تو ہم لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ حد سے زیادہ خاطر ہوتی ہے مگر جہاز پر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ بے توجہی کا یہ حال تھا کہ ہم لوگ روزمرہ کی ضروریات سے بھی محروم تھے۔ غسل خانہ اس قدر میلا تھا کہ قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور پاخانوں میں تو غلاظت کے انبار لگے تھے۔ وہاں جاتے ہوئے گویا موت کے دلدل میں سے گذرنا پڑتا تھا۔

اس کا برداشت کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ میں نے چیف افسر سے شکایت کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اس مکروہ منظر میں جو کچھ کمی تھی وہ مسافروں کی بدتمیزی نے پوری کر دی

یہ لوگ جہاں بیٹھتے تھے وہیں تھوک دیتے اور بے تکلف بچا کھچا کھانا اور پان کا اُگال پھینک دیا کرتے۔ شور اس قدر مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ہر شخص کو فکر تھی کہ بہت سی جگہ پر قبضہ کرلے۔ ان کے اسباب نے ان سے بھی زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ دو دن اسی عذاب میں گذرے۔

رنگون پہنچ کر میں نے کمپنی کے ایجنٹ کو خط لکھا۔ اس کا اور ڈاکٹر مہتا کی کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ واپسی میں اتنی ناقابلِ برداشت تکلیف نہیں ہوئی۔

رنگون میں بھی میرے میزبان کو میری غذا کی پابندیوں کے سبب سے بڑی زحمت اُٹھانا پڑی۔ میں ڈاکٹر مہتا کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا اس لیے میں نے انھیں زیادہ تکلف نہیں کرنے دیا۔ پھر بھی چونکہ میں نے اپنے کھانے کے لئے میووں کی قسمیں محدود نہیں کی تھیں خود میرے ذائقے اور میری نظر کو ہوس تھی کہ طرح طرح کی چیزیں ہوں۔ کھانے کے اوقات مقرر نہیں تھے۔ میں چاہتا تھا کہ شام کا کھانا اندھیرا ہونے سے پہلے کھا لیا کروں مگر عموماً رات کے آٹھ نو بج جاتے تھے۔

اس سال یعنی ۱۹۱۵ء میں ہردوار میں کمبھ کا میلا تھا جو بارہ سال کے بعد ہوا کرتا ہے مجھے میلا دیکھنے کا شوق نہیں تھا مگر میں گرو کل میں مہاتما منشی رام جی کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ انجمنِ خدام ہند نے میلے کے انتظام کے لیے رضا کاروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا تھا۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس دستے کے سردار تھے اور ڈاکٹر دیو آنجہانی اس کے طبی افسر تھے۔ مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ ان کی مدد کے لیے فنکس والوں کو بھیجوں اور مگن لال گاندھی انھیں لے کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ رنگون سے لوٹ کر میں بھی ان سے آملا۔

کلکتے سے ہردوار تک ریل کے سفر میں بے حد تکلیف ہوئی۔ بعض جگہ ڈبوں میں روشنی تک نہ تھی۔ سہارنپور سے ہم لوگ مال گاڑیوں میں اور مویشی کے ڈبوں میں بھر دیے گئے۔ ان میں چھت نہیں تھی۔ دوپہر کو ایک تو سورج کی گرمی دوسرے لوہے کے فرش کی تپش نے

ہمیں بھون ڈالا لوگوں کا یہ حال تھا کہ اس مصیبت کے سفر میں پیاس سے تڑپتے تھے لیکن اگر کسی اسٹیشن پر "مسلمان" پانی ملتا تھا تو نہیں پیتے تھے اور "ہندو" پانی کے انتظار میں رہتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ یہی ہندو جب بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کی تجویز سے بے تکلف اور بے پوچھے گچھے شراب یا گائے کے گوشت کی یخنی چڑھا جاتے ہیں اور مسلمان یا عیسائی کمپونڈر کے ہاتھ کا پانی پی لیتے ہیں۔

شانتی نکیتن کے قیام سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں ہندوستان میں زیادہ تر خاکروب کا کام کرنا پڑے گا۔ ہردوار میں رضاکاروں کے قیام کے لیئے ایک دھرم شالے میں خیمے نصب کر دیئے گئے تھے اور ڈاکٹر دیو نے رفع حاجت کے لیئے کچھ گڑھے کھدوا دیئے تھے۔ ان کی صفائی تنخواہ دار بھنگی کرتے تھے۔ یہ کام ہم فینکس والوں کے کرنے کا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم غلاظت پر راکھ ڈال دیا کریں گے اور خود صفائی کی نگرانی کریں گے۔ ڈاکٹر دیو نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ یہ بات کہی تو میں نے تھی مگر اسے پورا مگن لال گاندھی نے کیا۔ میرا کام تو زیادہ تر یہی تھا کہ خیمے میں بیٹھا "درشن" دیا کروں اور ان جاتریوں سے جو سیکڑوں کی تعداد میں میرے پاس آتے تھے مذہبی بحثیں کیا کروں۔ یہ "درشن" کے بھوکے "گھاٹے" تک پر میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی پہنچ جاتے تھے غرض ہردوار میں مجھے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں جو ناچیز خدمات میں نے انجام دی ہیں اُن کا اثر سارے ہندوستان میں کس قدر گہرا ہے۔

مگر میری یہ حالت ایسی نہ تھی کہ کسی کو اس پر رشک آئے۔ میری جان پر دوطرفہ عذاب تھا۔ جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہیں تھا مثلاً ریل کے سفر میں وہاں مجھے اپنے کروڑوں بھائیوں کی طرح سختیاں جھیلنا پڑتی تھیں اور جہاں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو میری شہرت سُن چکے تھے وہاں "درشن" کی مصیبت تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے کون سی حالت زیادہ قابل افسوس تھی۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ درشن والوں کی اندھی محبت پر مجھے بارہا

غصہ آگیا ہے اور اکثر اس سے دلی صدمہ پہنچا ہے مگر سفر میں باوجود سخت تکلیفوں کے کبھی طیش نہیں آیا بلکہ روح کو اور تقویت ہوئی۔

ان دنوں میرے جسم میں طاقت تھی اور میں دور دور تک چکر لگایا کرتا تھا۔ یہ بہت اچھا تھا کہ لوگ مجھے عام طور پر پہچانتے نہیں تھے اس لئے سڑکوں پر اتنی ہلچل نہیں ہوتی تھی کہ گزرنا مشکل ہو جائے۔ اس طرح چل پھر کر میں نے جاتریوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ مجھے ان میں بے حسی، ریاکاری اور بدتمیزی زیادہ نظر آئی اور دینداری بہت کم۔ "سادھو" ٹڈی دَل کی طرح چھائے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عیش و عشرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

یہاں میں نے ایک گائے دیکھی جس کے پانچ پیر تھے! مجھے بڑی حیرت ہوئی مگر واقف کار لوگوں نے مجھے اس کا بھید بتا دیا۔ یہ بیچاری سنگدل انسانوں کی حرص و طمع کا شکار تھی۔ یہ پانچواں پیر اصل میں ایک زندہ بچھڑے کے جسم سے کاٹ کر اس غریب کے کندھے پر کھال چیر کر لگا دیا گیا تھا۔ اس دُہرے ظلم سے جاہلوں کو ٹھگنے کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا تھا۔ یہ پاپی جانتے تھے کہ ہندو پانچ پیر کی گائے دیکھنے کے شوق میں دوڑا آئے گا اور اس زندہ معجزے پر حسب حیثیت چڑھاوا چڑھائے گا۔

اب میلے کا دن قریب آگیا۔ میں ہردوار جاترا کی نیت سے نہیں گیا تھا۔ میرا یہ اصول نہیں کہ خدا کو زیارتگاہوں میں ڈھونڈھتا پھروں۔ لیکن یہ سترہ لاکھ آدمی جو وہاں جمع تھے سب کے سب ریاکار یا محض تماشے کے شائق نہیں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو ثواب حاصل کرنے اور گناہوں سے پاک ہونے کی خاطر آئے ہیں۔ اس کا اندازہ بہت مشکل ہے کہ اس طرح کی عقیدت سے کس حد تک روحانی فیض حاصل ہوتا ہے۔

میں رات بھر اسی اُدھیڑبن میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں سوچتا تھا کہ اس ریاکاری کی فضا میں بعض سچے دیندار بھی ہیں۔ یہ تو خدا کی عدالت میں بے گناہ ٹھہریں گے۔ اگر ہردوار

کی جاترا بجائے خود گناہ ہے تو مجھے چاہئے کہ کھلم کھلا اس کی مخالفت کروں اور کمبھ کے دن ہردوار سے چلا جاؤں۔ اگر ایسا نہیں ہے تب بھی مجھے اس پاپ کے کفارے میں جو یہاں پھیلا ہوا ہے کسی قسم کی ریاضت کرکے تزکیۂ نفس کر ڈالنا چاہئے۔ میرے دل میں یہ خیال آنا قدرتی بات تھی۔ میری زندگی کی بنیاد ہی ضبط نفس اور ریاضت پر ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ میں نے کلکتے اور رنگون میں اپنے میزبانوں کو بے حد زحمت دی تھی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو پھل وغیرہ میں کھاتا ہوں ان کی قسمیں محدود کردوں اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے کھا لیا کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو آئندہ بھی میرے میزبانوں کو اسی طرح زحمت ہوا کرے گی اور میں بجائے ان کی خدمت کرنے کے ان سے خدمت لیا کروں گا۔ اس لئے میں نے عہد کر لیا کہ جب تک ہندوستان میں ہوں کبھی چوبیس گھنٹے کے اندر پانچ چیزوں سے زیادہ نہیں کھاؤں گا اور اندھیرا ہو جانے کے بعد کچھ نہ کھایا کروں گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس میں بڑی مشکلیں پیش آئیں گی مگر میں چاہتا تھا کہ عہد ایسا ہو جس میں نفس لئیم کو بہانے ڈھونڈھنے کی گنجائش نہ رہے۔ میں نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر بیماری کے زمانے میں دوا پانچ چیزوں میں سے ایک شمار کی جائے، اور ڈاکٹر جو خاص غذا تجویز کرے اسے بھی گن لیا جائے تو کیسے کام چلے گا بگر آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو کھانے پینے کی چیزوں کی کل تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

ان دونوں باتوں کا عہد کئے آج تیرہ سال ہوگئے۔ میرے لئے یہ بڑا سخت امتحان تھا مگر اس کی بدولت میری زندگی میں چند سال بڑھ گئے اور میں بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہا۔

آٹھواں باب

لکشمن جھولا

گروکل جاکر مہاتما منشی رام جی جیسے سپلتن کو دیکھنے سے طبیعت کو بڑا سکون ہوا کہاں ہردوار کا شور وغل اور کہاں گروکل کی خاموشی! مجھے فوراً یہ خوشگوار فرق محسوس ہوا۔

مہاتما مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ برہمچاریوں نے دل کھول کر خاطر مدارات کی۔ یہاں مجھے پہلی بار اچاریا رامدیوجی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوگیا کہ ان کی شخصیت میں بڑی قوت ہے۔ ہم دونوں میں بہت سے معاملات میں اختلاف رائے تھا مگر بہت جلد آپس میں دوستی ہوگئی۔

مجھ سے اچاریا رامدیوجی اور گروکل کے دوسرے پروفیسروں سے بڑی بحث ہوا کرتی تھی کہ گروکل میں دستکاری کی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں۔ جب جانے کا وقت آیا تو مجھے یہاں سے رخصت ہونے کا بہت قلق ہوا۔

میں نے "لکشمن جھولے"[1] کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہ ہرشی کیش کے قریب ہے۔ بہت سے دوستوں نے اصرار کیا کہ ہردوار سے رخصت ہونے سے پہلے اس پل کو ضرور دیکھ لو۔ میں اس جاترا پر پیدل جانا چاہتا تھا اس لئے بیچ میں ایک منزل کر کے دوسرے دن وہاں پہنچا۔

ہرشی کیش میں بہت سے سنیاسی مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے ایک مجھ سے ملکر

---

[1] گنگا کے پل کا نام

بہت خوش ہوئے. فنیکس والوں کی جماعت وہاں موجود تھی۔ انھیں دیکھ کر سوامی جی نے بہت سے سوالات کیے۔

مجھ سے اُن سے کئی بار مذہب کے متعلق باتیں ہوئیں۔ انھیں یہ معلوم ہو گیا کہ میرا مذہبی احساس بہت گہرا ہے۔ میں گنگا سے نہا کر ننگے سر صرف ایک دھوتی باندھے واپس آرہا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ میرے سر پر چوٹی اور گلے میں جنیؤ نہیں ہے تو انھیں بہت رنج ہوا اور وہ کہنے لگے:

"مجھے بڑا دکھ ہے کہ تم ایسے پکّے ہندو ہو کر نہ چوٹی رکھتے ہو اور نہ جنیؤ باندھتے ہو۔ یہی دونوں ہندو دھرم کی ظاہری علامتیں ہیں اور کسی ہندو کو ان سے خالی ہونا چاہیے"۔

میں نے ان دونوں چیزوں کو ایک خاص وجہ سے چھوڑا تھا۔ مناسب ہے کہ یہ قصہ بیان کر دوں۔ جب میں دس برس کا چھوکرا تھا تو برہمنوں کے لڑکوں کو گلے میں جنیؤ ڈالے اور اس میں بندھی ہوئی کنجیاں کھنکھناتے دیکھ کر مجھے بڑا رشک آتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔ اس زمانے میں کاٹھیا وار کے ویش خاندانوں میں جنیؤ پہننے کا رواج عام نہ تھا مگر یہ تحریک نئی نئی اُٹھی تھی کہ ہر برہمن، چھتری اور ویش کے لئے اس کا پہننا لازمی کر دیا جائے چنانچہ گاندھی خاندان کے کئی شخص گلے میں جنیؤ ڈالنے لگے تھے۔ کچھ دن بعد جو برہمن ہم دو تین لڑکوں کو رام رکشا سکھایا کرتا تھا اُس نے ہمیں جنیؤ پہنائے اور اگرچہ مجھے کنجیوں کا کوئی کام نہیں پڑتا تھا مگر میں نے خواہ مخواہ ایک گچھا کر اپنے جنیؤ میں باندھ ہی لیا۔ آگے چل کر یہ تاگا ٹوٹ گیا۔ یاد نہیں کہ مجھے اس کا کچھ زیادہ افسوس ہوا یا نہیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ میں نے دوبارہ جنیؤ نہیں پہنا۔

جب میں بڑا ہو گیا تو ہندوستان میں اور جنوبی افریقہ میں بارہا یہ کوشش کی گئی کہ میں اس مقدس رشتے کو گلے میں ڈال لوں مگر میں نے قبول نہ کیا۔ میں دل میں کہتا تھا کہ اگر شودر لوگ اسے نہیں پہن سکتے تو دوسری ذاتوں کو اس کے پہننے کا کیا

حق ہے؟ اور یوں بھی ایک فضول رسم کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ میں اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتا تھا مگر یہ کہتا تھا کہ آخر مجھے اس کے پہننے کی ضرورت کیا ہے؟

وشنو ہونے کی حیثیت سے میں گلے میں کنٹھی پہنتا تھا اور سر پر چوٹی رکھتا تھا کیونکہ میرے بزرگ اسے ضروری سمجھتے تھے۔ انگلستان جاتے وقت میں نے چوٹی کٹوا دی کہ کہیں ایسا نہ ہو لوگ مجھے ننگے سر دیکھ کر میرا مذاق اڑائیں اور انگریز مجھے وحشی سمجھیں۔ اس زمانے میں میں اس سے ڈرتا تھا۔ میری اس بزدلی کی انتہا یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں میں نے چھگن لال کو جو مذہبی فرض سمجھ کر چوٹی رکھتے تھے اس پر مجبور کیا کہ اُسے کٹوا دیں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ یہ اُن کی قومی خدمت کی راہ میں حائل ہوگی اس لئے میں نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ انھیں صدمہ ہوگا۔

غرض میں نے یہ سارا حال سوامی جی سے صاف صاف بیان کر دیا اور کہا: "میں جنیو نہیں پہنوں گا کیونکہ جب کروڑوں آدمی اس کے بغیر ہندو رہ سکتے ہیں تو مجھے اس کی کونسی ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ یہ مقدس رشتہ روحانی تجدید اور اصلاح کی علامت ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ پہننے والا برتر اور پاکیزہ تر زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں آج کل ہندوستان کی اور ہندو دھرم کی جو حالت ہے اس کے لحاظ سے ہندوؤں کو اس معنی خیز علامت کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ یہ حق اُس وقت حاصل ہوگا جب ہندو دھرم چھوت چھات کے عقیدے سے پاک ہو جائے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق نہ رہے اور دوسری برائیاں اور ریاکاریاں جو اس میں داخل ہو گئی ہیں، دور ہو جائیں۔ اس لئے میری طبیعت جنیو پہننے سے کراہت کرتی ہے۔ مگر آپ چوٹی کے متعلق جو فرماتے ہیں اس پر میں غور کروں گا۔ میں نے پہلے چوٹی رکھی تھی مگر جھوٹی شرم کے سبب سے کٹوا دی۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے پھر سے رکھ لینا چاہئے۔ میں اپنے رفیقوں سے اس بارے میں مشورہ کروں گا۔"

سوامی جی کو میری رائے جنیؤ کے بارے میں پسند نہیں آئی۔ میں نے جو دلیلیں اس کے ترک کرنے کی بتائیں سوامی جی کے نزدیک انھیں سے اس کے پہننے کی تائید ہوتی تھی۔ مگر میں آج تک اسی خیال پر قائم ہوں جو میں نے ہرش کیش میں ظاہر کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب تک دنیا میں مختلف مذہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی ظاہری علامت کی ضرورت ہے جو اسے دوسرے مذہبوں سے ممتاز کرے۔ لیکن جب لوگ اس کی پرستش کرنے لگیں اور اس کے ذریعے سے اپنے مذہب کی فوقیت جتائیں تو اس کا ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ میرے نزدیک آج کل جنیؤ سے ہندو دھرم کی روحانی ترقی نہیں ہو سکتی اس لئے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

البتہ چوٹی میں نے بزدلی سے کٹوائی تھی اس لیے دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اسے پھر سے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

مگر میں تو لکشمن جھولے کا ذکر کر رہا تھا۔ ہرش کیش اور لکشمن جھولے کے آس پاس کے قدرتی مناظر نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے بزرگ حسن فطرت کا کیسا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور کتنے عاقبت اندیش تھے کہ انھوں نے فطرت کے خوشنما مظاہر کو مذہبی اہمیت بخشی اور میرا دل ان بزرگوں کی عقیدت سے معمور ہو گیا۔

لیکن لوگوں نے ان حسین مناظر کی جو گت بنا رکھی تھی اُسے دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ ہردوار کی طرح ہرش کیش میں بھی لوگوں نے سڑکوں پر اور گنگا کے خوشنما کناروں پر گندگی پھیلا رکھی تھی۔ لوگوں کو عام شاہراہوں پر اور دریا کے کنارے رفع حاجت کرتے دیکھنا میرے لیے بڑا دلخراش منظر تھا۔

خود لکشمن جھولے کو جا کر دیکھا تو لوہے کا معمولی آویزاں پل تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ پہلے یہاں رسیوں کا خوبصورت پل بندھا ہوا تھا۔ ایک مخیّر مارواڑی کے جی میں یہ سما گئی کہ رسیوں کے پل کو توڑ کر لوہے کا پل بنانا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے بہت کچھ خرچ

کر کے یہ پل بنوایا اور اُس کی کنجیاں حکومت کے حوالے کر دیں! میں نے رسیوں کا پل تو دیکھ نہیں اس لیۓ اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لوہے کا پل یہاں بالکل بے تکا معلوم ہوتا ہے اور اُس نے اس خوشنما منظر کی خوبصورتی کو غارت کر دیا ہے۔ اور جاتریوں کے پُل کی کنجیاں حکومت کو دیدینا مجھے اُس وقت بھی، جب میں سرکار کا وفادار تھا، بہت بُرا معلوم ہوا۔

پل کو عبور کر کے سورگاشرم پہنچا۔ یہ ایک چھوٹی سی بدنما بستی ہے جس میں لوہے کی چادروں کے چند سائبان بنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ سادھکوں (طالبان معرفت) کی کٹیاں ہیں۔ اس وقت تو یہ خالی نظر آتی تھیں۔ بڑی عمارت میں چند لوگ تھے جنھیں دیکھکر میرے دل پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔

مگر ہردوار کے تجربے میرے لئے بڑے قیمتی ثابت ہوئے۔ ان سے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی مدد ملی کہ مجھے کہاں رہنا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔

نواں باب

آشرم کی بنا

یہ میرا ہردوار کا دوسرا سفر تھا۔

ستیاگرہ آشرم ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو قائم ہوا۔ شردھانند جی چاہتے تھے کہ میں ہردوار میں سکونت اختیار کرلوں۔ کلکتے کے بعض احباب نے میرے لئے ویدیا ناتھ دھام تجویز کیا تھا۔ اور دوستوں کا اصرار تھا کہ راجکوٹ میں رہو۔ مگر احمد آباد سے گذرتے وقت وہاں کے لوگ پیچھے پڑ گئے کہ یہیں بس جاؤ اور انھوں نے ہم لوگوں کے رہنے کے لئے ایک مکان اور آشرم کے کل مصارف دینے کا وعدہ کیا۔

میں احمد آباد ہی کو ترجیح دیتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ گجرات میرا وطن ہے یہاں رہ کر گجراتی زبان کے ذریعے سے میں ملک کی بڑی خدمت کرسکتا ہوں۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ احمد آباد پارچہ بافی کا قدیم مرکز ہے یہاں چرخے کا کام اچھا چلے گا اور گجرات کا صدر مقام ہونے کے سبب سے یہاں مالی امداد بھی دوسری جگہوں سے زیادہ ملے گی۔

احمد آباد کے دوستوں سے من جملہ اور باتوں کے اچھوتوں کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا اچھوت ملے گا جو ہر لحاظ سے بھلا آدمی ہو تو میں اُسے فوراً آشرم میں داخل کرلوں گا۔

ایک ویشنو دوست نے خود پسندی کے انداز میں کہا "ایسے اچھوت آپ کو مل چکے!"

آخر میں میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آشرم احمد آباد میں قائم کروں۔ مکان کے معاملے میں احمد آباد کے ایک بیرسٹر جیون لال جی دیسائی سے بڑی مدد ملی۔ انھوں نے ہمیں کوچرب

میں اپنا بنگلہ کرائے پر دیدیا۔

سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آشرم کا نام کیا ہو۔ میں نے اپنے دوستوں سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ کئی نام تجویز کئے گئے، جن میں "سیوا اشرم" (دارالخدمت) اور تپوون (دارالریاضت) بھی تھے۔ مجھے "سیوا اشرم" پسند آیا لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ خدمت کا طریقہ کیا ہوگا۔ تپوون کے لفظ میں رعونت اور ادّعا کی جھلک تھی۔ ہمیں ریاضت دل سے پسند تھی مگر مرتاض ہونے کا دعوئی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہم حق کے پرستار ہیں اور ہمارا کام حق کی تلاش اور حق کی پیروی ہے۔ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ ستیاگرہ کی تحریک کو جو جنوبی افریقہ میں آزمائی جا چکی ہے ہندوستان میں چلا کر دیکھیں اس لئے ہمیں اپنے آشرم کا نام ستیاگرہ آشرم رکھنا چاہیئے جس سے ہمارے مقصد اور طرز عمل دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ میرے دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اس لئے یہی نام رکھا گیا۔

اب آشرم کے لئے ایک دستور العمل کی ضرورت تھی۔ اس کا مسودہ تیار ہوا اور دوستوں کے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجا گیا۔ جتنی رائیں آئیں ان میں سے مجھے سر گرو داس بنرجی کی رائے اب تک یاد ہے۔ انہوں نے سب قواعد وضوابط کو پسند کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ آشرم والوں سے علاوہ اور باتوں کے کسر نفس کا عہد لیا جائے کیونکہ آج کل کے نوجوانوں میں اس کی بڑی کمی ہے۔ مجھے بھی اس کمی کا احساس تھا لیکن میرا خیال تھا کہ کسر نفس کا عہد کر لیا جائے تو وہ کسر نفس نہیں رہتا۔ کسر نفس ترک خودی کا نام ہے اور ترک خودی دراصل موکش (نجات) ہے۔ یہ کوئی عمل نہیں ہے بلکہ وہ مقصد ہے جس کے لئے اور اعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر خدمت یا نجات کا طالب کسر نفس سے محروم ہے تو اس کی طلب جھوٹی ہے۔ بغیر کسر نفس کے خدمت خود غرضی بن جاتی ہے۔

ان دنوں ہماری جماعت میں تیرہ تامل تھے۔ پانچ نوجوان تامل جنوبی افریقہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور باقی آٹھ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر شامل ہوگئے

تھے۔ سب ملا کر ہم پچیس نفوس تھے جن میں چند عورتیں بھی تھیں۔
یہ تھی آشرم کی ابتدا۔ ہم سب اکٹھا کھانا کھاتے تھے اور عزیزوں کی طرح مِل جُل کر رہتے تھے۔

دسواں باب

مشکلے نیست کہ آساں نشود

ابھی آشرم کو قائم ہوئے چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ ہمیں بڑا سخت امتحان پیش آیا۔ میرے پاس امرت لال ٹھکر کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا "اچھوتوں کا ایک غریب اور دیانت دار خاندان آپ کے آشرم میں آنا چاہتا ہے۔ کیا آپ اسے داخل کرنے کے لئے تیار ہیں؟"

مجھے ذرا تردد ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اچھوتوں کا خاندان کا خاندان ٹھکر بابا جیسے شخص کی سفارش لے کر آشرم میں داخل ہونے آئے گا۔ میں نے اپنے رفیقوں کو یہ خط پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے اس تجویز کو دل سے پسند کیا۔

میں نے امرت لال جی کو لکھا کہ ہم ان لوگوں کو داخل کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ انھیں آشرم کے ضابطوں کی پابندی میں کوئی عذر نہ ہو۔

یہ خاندان تین نفوس پر مشتمل تھا: دودا بھائی، ان کی بیوی دانی بین اور ان کی بچی لکشمی جو ان دنوں گھٹنیوں چلتی تھی۔ دودا بھائی بمبئی میں معلم تھے۔ ان تینوں نے ضابطوں کی پابندی منظور کر لی اور یہ آشرم میں داخل کر لئے گئے۔

ان کے داخلے سے آشرم کے سرپرستوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ پہلی مشکل یہ پیش آئی کہ بنگلے کا کنواں مالک کی نگرانی میں تھا ان کے نوکر نے ہمیں پانی بھرنے سے روکا۔ ہمارے ڈول کی چھینٹوں سے اسے اپنے چرس کے ناپاک ہو جانے کا اندیشہ تھا! اس لئے وہ ہمیں گالیاں دیتا تھا اور دودا بھائی کو دق کرتا تھا۔ میں نے سب لوگوں سے کہا کہ گالیاں سنو اسب کچھ سہو مگر پانی ضرور بھرو۔ اس شخص نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ چپ چاپ

گالیاں سن لیتے ہیں تو اُسے شرم آئی اور اس نے ہمیں ستانا چھوڑ دیا۔

مگر ہمیں جو مالی امداد ملتی تھی وہ بند ہو گئی۔ جس دوست نے کہا تھا کہ اچھوتوں میں کوئی شخص آشرم میں داخل ہونے کے قابل نہیں مل سکتا اُسے کیا معلوم تھا کہ ایسے لوگ نکل آئیں گے۔

ادھر امداد بند ہوئی اور ادھر یہ افواہیں سننے میں آئیں کہ ہم لوگ ذات باہر کر دئے جائیں گے۔ میں نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم احمد آباد چھوڑ کر نہیں جائیںگے بلکہ اچھوتوں کے محلّے میں اُٹھ جائیں گے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے۔

یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن مگن لال گاندھی نے مجھے اطلاع دی "ہمارا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اگلے مہینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان سے جواب دیا "تو ہم اچھوتوں کے محلّے میں اُٹھ چلیں گے۔"

اس معاملے میں یہ میرا پہلا امتحان نہیں تھا۔ جب کبھی ایسا موقع آیا خدا نے عین وقت پر میری مدد کی۔ میری اور مگن لال کی گفتگو کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ایک روز صبح کو ایک بچے نے آکر کہا کہ ایک سیٹھ موٹر میں بیٹھ کر آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو لینے کے لئے گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "میں آشرم کی کچھ مدد کروں تو آپ قبول کریں گے؟"

میں نے کہا "بڑی خوشی سے۔ سچ پوچھئے تو میں آجکل بالکل خالی ہاتھ ہوں۔"

سیٹھ بولے "میں کل اسی وقت آؤں گا۔ کیا آپ یہاں ہوں گے؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔" سیٹھ چلے گئے۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت موٹر ہمارے گھر کے سامنے رُکا۔ بچوں نے مجھے آکر خبر دی۔ سیٹھ اندر نہیں آئے بلکہ انہوں نے مجھے باہر بلا لیا۔ انہوں نے تیرہ ہزار روپیے کے نوٹ میرے ہاتھ میں رکھے اور رخصت ہو گئے۔

یہ مدد بالکل خلاف توقع تھی اور اس کے ملنے کا طریقہ بھی نیا تھا۔ یہ سیٹھ اس سے پہلے کبھی آشرم میں نہیں آئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں اُن سے صرف ایک بار ملا تھا۔ انہوں نے نہ کچھ دیکھا بھالا نہ پوچھا گچھا بس روپیہ دیا اور چل دیے۔ ایسا تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس مدد کے مل جانے سے ہم نے اچھوتوں کے محلے میں اُٹھ جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب ہمیں ایک سال کے لیے اطمینان ہو گیا۔

مگر اچھوتوں کے آنے سے خود آشرم کے اندر خلفشار برپا تھا۔ گو جنوبی افریقہ میں اچھوت میرے گھر آ کر رہا کرتے تھے اور میرے ساتھ کھاتے پیتے تھے مگر میری بیوی کو اور دوسری عورتوں کو اچھوتوں کا آشرم میں رکھا جانا کچھ پسند نہیں آیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ لوگ دانی بین کے ساتھ مخالفت یا کم سے کم بے رُخی کا برتاؤ کرتی ہیں۔ مالی مشکلات سے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی مگر گھر کے اندر یہ حالت دیکھنا مجھ پر بہت شاق تھا۔ دانی بین ایک معمولی عورت تھی۔ دُودا بھائی کی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی مگر سمجھ اچھی تھی۔ مجھے ان کا صبر بہت پسند آیا۔ کبھی کبھی انھیں غصہ آ جاتا تھا مگر عموماً تحمل سے کام لیتے تھے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں حقارت اور دل آزاری کا برتاؤ ہو تو چپ چاپ سہ لینا چاہیے۔ انھوں نے اِسے مان لیا اور اپنی بیوی کو بھی اس پر آمادہ کر دیا۔

اس خاندان کا داخلہ آشرم والوں کے لیے بڑا مفید سبق تھا۔ ہم نے شروع ہی سے اس بات کا اعلان کر دیا کہ آشرم میں چھوت چھات کا جھگڑا نہیں رہے گا۔ اس لیے ہمارے سرپرستوں کو کوئی غلط فہمی نہیں رہی اور ہمیں اس معاملے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی آشرم کی مدد زیادہ تر راسخ الاعتقاد ہندوؤں نے کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھوت کے عقیدے کی بنیادیں تک ہل گئی ہیں۔ اس کے اور بھی بہت سے ثبوت ہیں مگر یہی کیا کم کہ پکے ہندوؤں کو ایک ایسے آشرم کی مدد کرنے میں جہاں ہم لوگ اچھوتوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں ذرا بھی باک نہیں۔

اس سلسلے میں اور بہت سی باتیں ہیں جو تلاشِ حق کی داستان سے تعلق رکھتی ہیں مگر افسوس ہے کہ میں انھیں نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔ آئندہ بابوں میں بھی یہی کوتاہ قلمی نظر آئے گی۔ مجھے بہت سی اہم تفصیلات ترک کرنا پڑیں گی کیونکہ اس ڈراما کے اکثر اشخاص ابھی زندہ ہیں اور ایسے معاملوں میں، جو ان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں، بغیر اجازت کے انکا نام لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا' اور انسے اجازت لینا یا وہ حصے جنھیں انکا ذکر ہے ان کے پاس نظرِ ثانی کے لئے بھیجنا بڑا بکھیڑا ہے پھر یہ طریقہ اس آپ بیتی کے لئے مناسب بھی نہیں اسلئے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ بقیہ داستان میں، جو میرے خیال میں طالبانِ حق کے لئے بے حد اہمیت رکھتی ہے، بہت کچھ کتر بیونت کرنا پڑے گی۔ پھر بھی انشاء اللہ میں ترکِ موالات کے زمانے تک کے خاص خاص واقعات بیان کر دوں گا۔

گیارھواں باب

"پابند مزدوری" کی موقوفی

ہم تھوڑی دیر کے لئے آشرم سے، جسے ابتداہی میں اندرونی اور بیرونی طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا، رخصت ہوتے ہیں اور ایک معاملے کا ذکر کرتے ہیں جس کی طرف مجھے توجہ کرنا پڑی۔

"پابند مزدور" وہ کہلاتے تھے جو ہندوستان سے ترک وطن کر کے پانچ سال کی مزدوری کے معاہدے پر جنوبی افریقہ جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے اسمٹس۔ گاندھی معاہدے کی رو سے نٹال میں داخل ہونے والے "پابند مزدوروں" کو تین پونڈ کا ٹیکس معاف کر دیا گیا تھا لیکن ہندوستان سے مزدوروں کے جانے کے مسئلے پر ابھی غور کرنا باقی تھا۔

مارچ سنہ ۱۹۱۶ء میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے مرکزی مجلس وضع قوانین میں پابند مزدوری کو منسوخ کرنے کی تحریک پیش کی۔ اس تحریک کو قبول کرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ گورمنٹ برطانیہ نے وعدہ کیا ہے کہ یہ طریقہ کچھ عرصے کے بعد موقوف کر دیا جائے گا۔ مگر میرا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو ایسے غیر معین وعدے سے مطمئن نہ ہونا چاہیے بلکہ فوری منسوخی کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ یہ محض ہمارے ملک کی غفلت تھی کہ وہ اس جبر کو برداشت کرتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب بھی اگر ساری ملک میں اس کے خلاف احتجاج کا شور بلند ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ میں نے چند لیڈروں سے ملاقات کی، اخبارات میں مضمون لکھے اور یہ اندازہ کر لیا کہ عام رائے سختی کے ساتھ اس کی فوری منسوخی کی حمایت میں ہے۔ اب یہ سوال تھا کہ کیا یہ ایسی چیز ہے جس کے

لئے ستیاگرہ کی جائے؟ مجھے ستیاگرہ کے ضروری ہونے میں کوئی شبہہ نہیں تھا مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا طریقہ کیا ہو۔

اس اثنا میں وائسرائے نے صاف صاف کہہ دیا کہ "کچھ عرصے کے بعد منسوخی" کے معنی ہیں "اتنے دن کے بعد کہ آجروں کو کوئی دوسرا انتظام کرنے کی کافی مہلت مل جائے۔"

فروری ۱۹۱۷ء میں پنڈت مالوی جی نے پابند مزدوری کی فوری منسوخی کے لئے ایک مسودہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ لارڈ چیمسفورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ میں سارے ہندوستان میں احتجاج کا شور برپا کرانے کے لئے دورہ کروں۔

مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے وائسرائے سے مل لوں۔ میں نے اُن سے ملاقات کی درخواست کی جو فوراً منظور ہو گئی۔ مسٹر میفی (جو اب سر جان میفی کہلاتے ہیں) ان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ مجھے اُن سے اکثر ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لارڈ چیمسفورڈ سے جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان تھی۔ انہوں نے کوئی صریح بات تو نہیں کہی مگر یہ کہا کہ میں مدد کروں گا۔

میں نے اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ مسٹر جہانگیر پیٹیٹ نے امپیریل سٹیزنشپ ایسوسی ایشن (انجمن شہریان سلطنت برطانیہ) کی طرف سے جلسہ کرانے کا وعدہ کیا۔ پہلے انجمن کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس ہوا کہ جلسۂ عام میں پیش کرنے کے لئے رزولیوشن ترتیب دے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اسٹینلے ریڈ، للو بھائی ساملداس (جو اب سر ہو گئے ہیں) نٹرنجن جی اور مسٹر پیٹیٹ موجود تھے۔ بحث اس بات پر تھی کہ حکومت کو منسوخی کے لئے کتنا وقت دیا جائے۔ تین تجویزیں پیش تھیں۔ ایک میں "جلد سے جلد" دوسری میں "۳۱ جولائی تک" اور تیسری میں "فوری" منسوخی کا مطالبہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی تاریخ مقرر کر دی جائے تاکہ اگر حکومت اس وقت تک ہماری درخواست پوری نہ کرے تو ہم اپنے آئندہ طرز عمل

کے متعلق فیصلہ کرسکیں۔ للّو بھائی "فوری منسوخی" کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک ۳۱ جولائی تک کی مہلت زیادہ تھی۔ میں نے کہا کہ لوگ "فوری" کا مفہوم نہیں سمجھیں گے اگر ہم ان سے کچھ عملی کام کرانا چاہتے ہیں تو تاریخ کی صراحت کر دینا چاہئے۔ "فوری" کی تاویل ہر فریق اپنے طور پر کرسکتا ہے مگر "۳۱ جولائی" میں کسی طرح کے شبہے کی گنجائش نہیں۔ اگر اس وقت تک کوئی کارروائی نہ ہوئی تو ہم اور تدبیریں اختیار کرسکیں گے۔ ڈاکٹر ریڈ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آخر میں للّو بھائی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ ہم نے یہی طے کیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ۳۱ جولائی تک منسوخی کا اعلان کردے۔ جلسۂ عام میں اس مضمون کا رزولیوشن پاس ہوگیا اور سارے ہندوستان میں اس کی تائید میں جلسے کئے گئے۔

مسز جے جی پٹیٹ نے انتہائی سرگرمی اور مستعدی سے کام لے کر خواتین کا ایک وفد ترتیب دیا اور اُسے وائسرائے کی خدمت میں لے گئیں۔ بمبئی سے جو خواتین گئی تھیں اُن میں سے مجھے لیڈی ٹاٹا اور دلشاد بیگم صاحبہ کے نام یاد ہیں۔ یہ وفد بہت کامیاب رہا۔ وائسرائے نے ہمت افزا جواب دیا۔

میں نے کراچی، کلکتے اور بہت سے اور شہروں کا دورہ کیا۔ ہر مقام پر شاندار جلسے ہوئے اور بے انتہا جوش کا اظہار کیا گیا۔ مجھے اس تحریک کو شروع کرتے وقت اتنی کامیابی کی توقع نہ تھی۔

ان دنوں میں تنہا سفر کرتا تھا۔ اس لئے مجھے بڑے دلچسپ تجربے ہوا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس والے ہمیشہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے۔ مگر میری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی اسلئے نہ وہ مجھے ستاتے تھے اور میں ان سے تعرض کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تک میرے نام کے ساتھ "مہاتما" کا دم چھلا نہیں لگا تھا اگرچہ بعض مقامات پر، جہاں لوگ مجھ سے واقف تھے، اس لقب کے نعرے لگائے جاتے تھے۔

ایک بار خفیہ پولیس والوں نے مجھے کئی اسٹیشنوں پر آکر پریشان کیا۔ بار بار میرا نام پوچھتے

اور ٹکٹ کا نمبر لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں بڑی خوشی سے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ میرے ہمسفر مجھے یہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی سادھو یا فقیر ہے۔ انھیں یہ دیکھ کر کہ خفیہ پولیس والے مجھے ہر اسٹیشن پر دق کرتے ہیں، غصہ آگیا اور انھوں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ انھوں نے کہا "اس غریب سادھو کو ناحق کیوں ستاتے ہو" اور مجھ سے کہنے لگے "تم ہرگز ان بدمعاشوں کو ٹکٹ نہ دکھاؤ"۔

میں نے نرمی سے کہا "ٹکٹ دکھانے میں میرا کیا ہرج ہے؟ یہ بیچارے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں"۔ مسافروں کو اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے مجھ سے اور زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ کیسا اندھیر ہے کہ لوگ بے گناہوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔

مجھے خفیہ پولیس والوں کے سبب سے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ البتہ تیسرے درجے کے سفر میں بڑی مصیبتیں اُٹھانا پڑتی تھیں۔ سب سے زیادہ تلخ تجربہ مجھے لاہور سے دہلی تک کے سفر میں ہوا۔ میں کراچی سے کلکتے جا رہا تھا اور لاہور میں گاڑی بدلنا تھی۔ دہلی کی گاڑی میں مجھے کسی طرح جگہ نہیں ملتی تھی۔ گاڑی کھچاکھچ بھری ہوئی تھی اور جو لوگ اندر گھسنا چاہتے تھے انھیں دھینگا مشتی کرنا پڑتی تھی۔ جن ڈبوں کے دروازے بند تھے اُن میں لوگ کھڑکیوں سے چڑھ جاتے تھے۔ مجھے جلسے کی تاریخ پر کلکتے پہنچنا تھا اور اگر اس گاڑی سے نہ جاؤں تو وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں جگہ ملنے سے قریب قریب مایوس ہو گیا تھا۔ لوگ مجھے کہیں دھنسنے نہیں دیتے تھے۔ ایک قلی نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھ سے کہا "مجھے بارہ آنے دو تو میں جگہ دلوا دوں"۔ میں نے کہا "اچھا، اگر مجھے بٹھا دو تو میں بارہ آنے دیدوں گا"۔ نوجوان قلی گاڑی گاڑی پھر کر مسافروں کی خوشامد کرنے لگا مگر وہاں کون سنتا تھا۔ گاڑی چھوٹنے والی تھی کہ ایک ڈبے کے مسافروں نے کہا "جگہ تو یہاں بالکل نہیں مگر تم سے ہو سکے تو اسے اندر ڈھکیل دو۔ کھڑے کھڑے چلا جائے گا"۔ قلی نے مجھ

سے پوچھا۔ میں فوراً راضی ہوگیا اور اس نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے ڈھکیل دیا۔ اس طرح قلی نے مجھے جگہ دلوائی اور اپنے بارہ آنے کھرے کر لئے۔

یہ رات میرے لئے بڑی مصیبت کی رات تھی۔ دوسرے مسافروں نے گھس پیٹھ کر بیٹھنے کی جگہ نکال لی۔ میں دو گھنٹے تک اوپر کی بینچ کی زنجیر تھامے کھڑا رہا۔ اس پر بھی چند مسافر مجھے چین نہیں لینے دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے "بیٹھ کیوں نہیں جاتا؟" میں نے عذر کیا کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے مگر انھیں اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ اوپر کی بینچ پر مزے میں پیر پھیلائے لیٹے تھے مگر میرا کھڑا رہنا بھی انھیں ناگوار تھا۔ وہ مجھے برابر ڈانٹتے رہے اور میں نرمی سے جواب دیتا رہا۔ آخر وہ بھی نرم پڑ گئے۔ چند لوگوں نے میرا نام پوچھا۔ جب میں نے نام بتایا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے معذرت کی اور سمٹ سمٹا کر میرے لئے بیٹھنے کی جگہ نکالی۔ اس طرح مجھے صبر کا پھل ملا۔ میں تھک کر چور ہوگیا تھا اور مجھے چکر آرہے تھے۔ خدا نے عین وقت پر میری مدد کی۔

غرض کسی نہ کسی طرح میں دلّی اور وہاں سے کلکتے پہنچا۔ وہاں میں مہاراجہ قاسم بازار کا مہمان تھا جو جلسے کی صدارت کرنے والے تھے۔ کراچی کی طرح یہاں بھی بیحد جوش کا اظہار کیا گیا۔ جلسے میں کئی انگریز بھی شریک تھے۔

۳۱ جولائی سے پہلے حکومت نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان سے پابند مزدوروں کا بھیجنا بند کیا جاتا ہے۔

۱۸۹۴ء میں میں نے پابند مزدوری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے پہلی درخواست لکھی تھی اور مجھے اسی زمانے میں پوری اُمید تھی کہ یہ طلسم جسے سر و۔ و۔ ہنٹر "نیم غلامی" کہتے تھے کسی نہ کسی دن ٹوٹ کر رہے گا۔

اس تحریک میں جو ۱۸۹۴ء میں شروع ہوئی تھی بہت سے لوگوں نے مدد دی لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ ستیاگرہ کا امکان نہ ہوتا تو اس طلسم کا خاتمہ اتنی جلدی ہرگز نہیں

ہوسکتا تھا۔

جو لوگ اس تحریک کی مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں وہ میری کتاب "جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تاریخ" کا مطالعہ کریں۔

بارھواں باب

نیل کا دھبّا

چمپارن راجہ جنک کا ملک ہے۔ جس طرح وہاں آم کے باغوں کی کثرت ہے اسی طرح ۱۹۱۷ء تک نیل کی کاشت پھیلی ہوئی تھی۔ چمپارن کے کاشتکار اس کے پابند تھے کہ اپنی زمین کے بیس حصوں میں سے تین میں زمیندار کے لئے نیل کی کاشت کریں۔ یہ نظام "تن کتھیا" کہلاتا تھا۔ "کتھ" ایک ایکڑ کے بیسویں حصّے کو کہتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو مجھے اس وقت تک یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چمپارن کہاں ہے بلکہ میں نے اُس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ نیل کے کھیت کیسے ہوتے ہیں۔ میں نے نیل کے بورے ضرور دیکھے تھے مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ چمپارن میں ہزاروں کاشتکاروں پر ظلم کر کے تیار کئے گئے ہیں۔

راجکمار شکل ایک کاشتکار تھے جنھوں نے خود اس شکنجے کی اذیت سہی تھی اور ان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اپنے ہزاروں بھائیوں کے دامن سے، جو ان کی طرح تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں، یہ نیل کا دھبّا چھڑائیں۔

میں ۱۹۱۶ء کی کانگریس میں لکھنؤ گیا تھا۔ وہاں راجکمار شکل نے مجھے آن پکڑا اور مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ چمپارن چلو۔ انھوں نے کہا "وکیل بابو آپ کو ہمارے دکھ درد کا سارا حال بتائیں گے"۔ یہ "وکیل بابو" برجکشور پرشاد جی تھے جو بہار میں قومی کاموں کے روح رواں ہیں اور جن کی رفاقت کا فخر مجھے چمپارن میں ہوا۔ راجکمار شکل انھیں میرے خیمے میں لے آئے۔ وہ سیاہ الپکے کی اچکن اور پتلون پہنے تھے۔ پہلی ملاقات میں مجھ پر

بابو صاحب کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی وکیل ہیں جو بھولے بھالے کاشتکاروں کو پھانس کر اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے چمپارن کے حالات سنائے اور میں نے حسب معمول یہ جواب دیا "میں جب تک سارے حالات خود نہ دیکھ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کانگریس میں رزولیوشن ضرور پیش کیجیے، مگر مجھے تو مہربانی کر کے ابھی چھوڑ ہی دیجیے۔" ظاہر ہے کہ راجکمار شکل کانگریس سے بھی مدد چاہتے تھے۔ بابو برجکشور پرشاد نے اہل چمپارن سے ہمدردی کا رزولیوشن پیش کیا اور وہ اتفاق رائے سے پاس کیا گیا۔
راجکمار شکل کو اس سے خوشی ہوئی مگر ان کا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں خود چمپارن جاؤں اور کسانوں کی مصیبت دیکھوں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اپنے دورے کے سلسلے میں دو ایک دن چمپارن میں بھی آکر ٹھہروں گا۔ انہوں نے کہا:
"ایک ہی دن کافی ہے آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے کہ کیا حال ہے۔"
لکھنؤ سے میں کانپور گیا۔ راجکمار شکل میرے ساتھ وہاں بھی پہنچے۔ انھوں نے بڑے اصرار سے کہا "چمپارن یہاں سے نزدیک ہے۔ مہربانی کرکے ایک دن کے لیے چلے چلیے۔"
میں نے کہا "اس وقت تو معاف کیجیے مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور آؤں گا۔"
وہاں سے میں آشرم آیا۔ دھن کے پکے راجکمار وہاں بھی پہنچے۔ انہوں نے کہا "مہربانی کرکے اب کوئی تاریخ مقرر کر دیجیے۔" میں نے جواب دیا "مجھے فلاں تاریخ کو کلکتے جانا ہے۔ آپ وہاں مجھ سے ملیے گا اور مجھے ساتھ لے چلیے گا۔" مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کہاں جانا ہے، کیا دیکھنا ہے اور کیا کرنا ہے۔
میں کلکتے میں بھپن بابو کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ راجکمار پہلے سے براجے رہے ہیں۔ غرض اس بے پڑھے لکھے، بھولے بھالے، مگر دھن کے پکے کسان نے مجھے گرفتار کر ہی لیا۔
۱۹۱۷ء کے شروع میں ہم کلکتے سے چمپارن روانہ ہوئے۔ ہم دونوں کی وضع

ایک سی تھی، دونوں دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کونسی گاڑی میں جانا ہے۔ انہوں نے مجھے لے جاکر ایک گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھالیا اور صبح کو ہم دونوں پٹنے پہنچ گئے۔

مجھے پٹنے جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میرا کوئی دوست یا ملاقاتی وہاں نہیں تھا جس کے یہاں جاکر ٹھہر سکتا۔ میں سمجھتا تھا کہ راجکمار شکل معمولی کسان ہیں تو کیا ہوا پٹنے میں کچھ لوگوں سے ان کی جان پہچان ضرور ہوگی۔ راہ میں مجھے ان کی طبیعت کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہوا اور پٹنے پہنچ کر جو کچھ غلط فہمی تھی وہ دور ہوگئی۔ بیچارے بالکل سادہ لوح تھے۔ جن وکیلوں کو وہ اپنا دوست سمجھتے تھے وہ ان غریب سے نوکروں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ کہاں وکیل صاحب اور کہاں کسان موکل، کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔

راجکمار مجھے راجندر بابو کے گھر لے گئے۔ وہ پوری یا کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے۔ بنگلے میں دو تین نوکر تھے جنھوں نے ہماری بات تک نہیں پوچھی۔ میرے پاس تھوڑا بہت کھانے کا سامان موجود تھا۔ مجھے کھجوروں کی ضرورت تھی جو میرے دوست نے بازار سے لادیں۔

بہار میں چھوت چھات کا بڑا زور تھا۔ راجندر بابو کے نوکر اس کے روادار نہیں تھے کہ جس وقت وہ کنوئیں کے پاس موجود ہوں میں پانی بھروں۔ انھیں میری ذات معلوم نہیں تھی اس لیئے احتیاط کرتے تھے کہ کہیں میرے ڈول کے چھینٹے ان کے جسم کو ناپاک نہ کردیں۔ مجھے قضائے حاجت کی ضرورت ہوئی۔ راجکمار نے مجھے اندر کا پاخانہ بتایا مگر ایک نوکر نے فوراً باہر کے پاخانے کی طرف اشارہ کیا۔ میں ان باتوں کا عادی تھا اس لیئے مجھے نہ تعجب ہوا اور نہ برا معلوم ہوا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں اپنا فرض ادا کررہے تھے اور راجندر بابو کی منشا کے مطابق عمل کررہے تھے۔

ان دلچسپ تجربوں سے جہاں مجھے راجکمار شکل کی سادہ لوحی کا اندازہ ہوا وہاں میری دل میں انکی عزت بڑھ گئی مگر یہ میں نے سمجھ لیا کہ انکی رہنمائی سے کام نہیں چلیگا۔ اب مجھے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔

تیرھواں باب

بہاریوں کی شرافت اور نیکدلی

مجھ سے اور مولانا مظہر الحق سے اس زمانے کی ملاقات تھی جب وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں، جس سال وہ مسلم لیگ کے صدر تھے، بمبئی کی کانگریس میں انھوں نے اس ملاقات کی تجدید کی اور مجھے دعوت دی کہ جب پٹنے آؤ تو میرے گھر ٹھہرنا۔ اُس وقت مجھے وہ دعوت یاد آئی اور میں نے انھیں ایک رقعہ بھیجا جس میں یہ بھی لکھ دیا کہ میں چمپارن جانے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ وہ فوراً اپنی موٹر کار میں پہنچے اور بڑا اصرار کرنے لگے کہ میرے یہاں چل کر ٹھہرو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ مجھے سب سے پہلی گاڑی میں، جو چمپارن جاتی ہو، بٹھا دیں کیونکہ میرے جیسے اجنبی کو ریل کے ٹائم ٹیبل سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ انھوں نے راجکمار شکل سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز کی کہ پہلے مظفر پور جاؤ۔ شام کو انھوں نے مجھے مظفر پور کی گاڑی سے روانہ کر دیا۔

پرنسپل کرپلانی اس زمانے میں مظفر پور میں تھے۔ میں جب حیدر آباد (سندھ) گیا تھا اس وقت سے ان سے ملاقات تھی۔ ڈاکٹر چھوئت رام نے مجھ سے ان کے ایثار اور اُن کی سادگی کی تعریف کی تھی اور اپنے آشرم کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے مصارف کا انتظام پروفیسر کرپلانی ہی نے کیا ہے۔ وہ پہلے مظفر پور کے گورمنٹ کالج میں پروفیسر تھے مگر میرے پہنچنے سے کچھ دن پہلے اس عہدے سے استعفا دے چکے تھے۔ میں نے انھیں تار کے ذریعے سے اپنے آنے کی اطلاع دیدی تھی اور باوجودیکہ گاڑی آدھی رات کو پہنچی

طالب علموں کی فوج کی فوج ساتھ لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کا خود کوئی مکان نہیں تھا بلکہ وہ پروفیسر ملکانی کے یہاں رہتے تھے اس لیے مجھے بھی اصل میں انھیں کا مہمان ہونا پڑا۔ اس زمانے میں ایک گورمنٹ کالج کے پروفیسر کا میرے جیسے شخص کو اپنے یہاں ٹھہرانا غیر معمولی بات تھی۔

پروفیسر کرپلانی نے مجھے بہار کی، خصوصاً ترہٹ کی کمشنری کی حالتِ زار بتائی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کام کس قدر مشکل ہے۔ ان سے بہار کے لوگوں سے بہت میل جول تھا۔ انھوں نے ان لوگوں پر میرے آنے کی غرض ظاہر کی۔ صبح کو چند وکیل مجھ سے ملنے آئے۔ ان میں سے رام نومی پرشاد جی کا نام مجھے اب تک یاد ہے کیونکہ ان کے جوش اور خلوص کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ انھوں نے کہا: "آپ جو کام کرنے کے لیے آئے ہیں وہ یہاں (یعنی پروفیسر ملکانی کے گھر) رہ کر نہیں کر سکتے۔ آپ ہم لوگوں میں کسی کے یہاں اُٹھ چلیے۔ گیا بابو یہاں کے مشہور وکیل ہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ انکے یہاں قیام کیجیے۔ سچ پوچھیے تو ہم گورمنٹ سے ڈرتے ہیں مگر ہم سے جو کچھ مدد ہو سکے گی کریں گے۔ راجکمار شکل نے آپ سے جو باتیں بیان کی ہیں اُن میں سے اکثر صحیح ہیں افسوس ہے کہ ہمارے لیڈر بابو برج کشور اور بابو راجندر پرشاد یہاں موجود نہیں۔ میں نے ان دونوں کو تار دیدیے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ جلد یہاں پہنچ جائیں گے اور ان سے آپ کو یقیناً ہر طرح کی معلومات بہم پہنچے گی اور بہت کچھ مدد ملے گی۔ اچھا تو اب گیا بابو کے یہاں تشریف لے چلیے۔"

یہ ایسی درخواست تھی جسے میں رد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے تھوڑا سا تامل تھا کہ کہیں گیا بابو کو میری وجہ سے نقصان نہ پہنچ جائے۔ مگر انھوں نے مجھے اطمینان دلایا اور میں ان کے یہاں اٹھ گیا۔ وہ اور ان کے خاندان والے میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔

اس عرصے میں برجکشور بابو دربھنگا سے اور راجیندر بابو پوری سے آگئے۔ اب کی برجکشور بابو مجھے اور ہی رنگ میں نظر آئے۔ یہ وہ بابو برجکشور پرشاد نہیں تھے جو مجھے لکھنؤ میں ملے تھے۔ ان کی منکسر مزاجی، سادگی، نیکی اور حسن عقیدت نے جو بہاریوں کے حصے کی چیزیں ہیں، میرے دل کو روحانی مسرت سے مالامال کر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ بہار کے وکیل ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

تھوڑے ہی دن میں میرے اور اس حلقۂ احباب کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ استوار ہوگیا۔ بابو برجکشور نے مجھے سارے واقعات سمجھائے۔ ان کے پاس غریب کسانوں کے مقدمے رہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی دو مقدموں کی کارروائی جاری تھی۔ جب وہ ان مقدموں میں کامیاب ہوتے تو اپنے دل میں یہ سمجھتے کہ میں غریبوں کی مدد کر رہا ہوں حالانکہ وہ ان بیچاروں سے فیس برابر وصول کرتے تھے۔ وکیلوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر ہم فیس نہ لیں تو ہمارا خرچ نہیں چلے گا اور ہم غریبوں کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ بنگال اور بہار کے وکیلوں کی فیس کی شرح سُن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا "ہم نے فلاں شخص سے اپنے مقدمے میں رائے لی تھی، اُسے دس ہزار روپے دیئے۔" ہزاروں سے کم کی بات چیت نہ تھی۔

میں نے ان لوگوں کو دوستانہ ملامت کی۔ یہ جھڑکیاں انھیں ناگوار نہیں ہوئیں۔

میں نے کہا "ان سب واقعات کو سننے کے بعد میری یہ رائے ہے کہ ہمیں مقدمے بازی نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب کسانوں پر یہ ظلم ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں خوف بیٹھا ہوا ہے تو عدالتیں بیکار ہیں۔ ان کی مدد کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کے دل سے خوف دور کر دیا جائے۔ جب تک بہار میں "تنکتھیا" کا خاتمہ نہ ہو جائے ہمیں چین نہ لینا چاہیے۔ میرا قصد یہاں دو دن ٹھہرنے کا تھا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں اس کام میں دو سال لگ جائیں۔ میں تیار ہوں کہ جب تک ضرورت ہو یہاں ٹھہروں۔

میں نے سمجھ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔"

میں نے دیکھا کہ برجکشور بابو بڑی سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ انہوں نے سنجیدگی سے کہا "ہم سے جہاں تک بنے گا مدد کریں گے مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی۔"

یہ باتیں آدھی رات تک ہوتی رہیں۔

میں نے کہا "مجھے آپ کی قانونی معلومات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے صرف محرر اور ترجمان چاہئیں۔ ممکن ہے کہ جیل خانے جانے کی نوبت آئے۔ خوشی تو مجھے جب ہوگی کہ آپ اس میں بھی میرا ساتھ دیں مگر میں آپ کو مجبور نہیں کرونگا۔ آپ کا یہی ایثار کیا کم ہے کہ آپ محرّری کا کام کریں اور ایک غیر معین مدت کے لئے اپنے پیشے کو ترک کر دیں۔ مجھے یہاں کی ہندی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اور کیتھی یا اردو کے کاغذات تو پڑھ ہی نہیں سکتا۔ آپ کو ان کا ترجمہ میرے لئے کرنا ہوگا۔ ہم میں اتنی استطاعت نہیں کہ اس کا معاوضہ دیں۔ یہ سارا کام خدمت اور ایثار کی نیت سے مفت ہونا چاہیے۔"

برج کشور بابو میرا مطلب سمجھ گئے۔ انہوں نے باری باری سے مجھ سے اور اپنے رفیقوں سے جرح شروع کی۔ مجھ سے انہوں نے اس قسم کے سوالات کئے۔ "آپ کو کتنے دن تک ہماری خدمات کی ضرورت ہے اور کتنے آدمی چاہئیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگ باری باری سے کام کریں؟" وکیلوں سے انہوں نے پوچھا "آپ لوگوں میں سے کون کون کام کرنے کے لئے تیار ہیں اور کتنے دن کر سکتے ہیں؟"

اس ساری بحث کے بعد ان لوگوں نے مجھ سے کہا "ہم میں سے فلاں فلاں شخص آپ کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب تک ضرورت ہو حاضر رہیں گے۔ جیل جانے پر آمادہ ہونا ہمارے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہم میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے۔"

چودھواں باب

"اہمسا" کا نظارہ

میرا مقصد یہ تھا کہ چمپارن کے کسانوں کی حالت کا مطالعہ کروں اور یہ معلوم کروں کہ انھیں نیل کی کوٹھی والوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں۔ اس کے لئے ہزاروں کاشتکاروں سے ملنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے میں نے کوٹھی والوں کے خیالات سے واقف ہونا اور اس قسمت کے کمشنر سے ملنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے سیکرٹری اور ترہٹ کمشنر سے ملاقات کی درخواست کی جسے دونوں نے منظور کر لیا۔

انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں کوٹھی والوں اور ان کے کاشتکاروں کے باہمی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ پھر بھی اگر تم کچھ شکایتیں پیش کرنا چاہتے ہو تو تحریر کے ذریعے سے پیش کرو۔ میں نے نرمی سے جواب دیا کہ میں اپنے آپ کو باہر کا آدمی نہیں سمجھتا اور جب کسان خود چاہتے ہیں کہ میں اُن کے حالات کی تحقیقات کروں تو مجھے اس کا پورا حق ہے۔

کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انھوں نے مجھے بہت دھمکایا اور کہا کہ تم فوراً ترہٹ سے چلے جاؤ۔

میں نے اپنے رفیقوں سے یہ سب واقعات بیان کئے۔ میں نے کہا کہ غالباً گورمنٹ مجھے آگے جانے سے روک دے گی اور ممکن ہے کہ مجھے خلاف توقع ابھی سے جیل جانا پڑے۔ جب مجھے گرفتار ہی ہونا ہے تو مناسب یہ ہے کہ میری گرفتاری موتیہاری میں بلکہ اگر ممکن ہو تو

بیتیا میں ہو۔ اس لیے مجھے جلد سے جلد ان میں سے کسی مقام پر پہنچ جانا چاہیے۔

چمپارن تربہٹ کی قسمت کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام موتیہاری ہے۔ راجکمار شکل کا گھر بیتیا کے قریب تھا اور اس نواح میں نیل کے کاشتکاروں کی حالت اور مقامات سے بھی بدتر تھی۔ راجکمار شکل چاہتے تھے کہ میں ان لوگوں سے ملوں اور مجھے بھی اس کی بہت خواہش تھی۔

چنانچہ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ موتیہاری روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم بابو گورکھ پرشاد کے مہمان ہوئے اور ان کا گھر سرائے بن گیا۔ اس میں اتنے آدمیوں کی گنجائش بڑی مشکل سے نکلی۔ اُسی دن ہم نے یہ سنا کہ موتیہاری سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں کسی کاشتکار سے بدسلوکی کی گئی ہے۔ یہ طے ہوا کہ میں دوسرے دن صبح کو بابو دھرنی دھر پرشاد کے ساتھ جا کر اس کاشتکار سے ملوں، چنانچہ ہم دونوں ہاتھی پر بیٹھ کر چلے۔ چمپارن میں ہاتھیوں کی وہی کثرت ہے جو گجرات میں بیل گاڑیوں کی۔ ابھی ہم آدھی دور بھی نہیں گئے تھے کہ ایک شخص سپرنٹنڈنٹ پولیس کا پیام لایا کہ "صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔" میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ دھرنی دھر بابو کو تو میں نے اس گاؤں کی طرف بھیج دیا اور میں کرائے کی گاڑی میں بیٹھ گیا جو سپرنٹنڈنٹ کا آدمی لایا تھا۔ اُس نے مجھے مجسٹریٹ کا حکم دکھایا کہ چمپارن سے فوراً چلے جاؤ اور مجھے میری قیام گاہ پر پہنچا دیا۔ اس نے مجھ سے اطلاع یابی کی تصدیق چاہی۔ میں نے لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا اور جب تک میری تحقیقات ختم نہ ہو جائیگی میں چمپارن سے نہیں جاؤں گا۔ اس پر میرے پاس سمن پہنچا کہ کل تمہیں عدالت میں خلاف ورزی کی جواب دہی کرنا ہو گی۔

میں نے رات بھر جاگ کر خطوط لکھے اور برجکشور بابو کو ضروری ہدایتیں دیں۔ اس حکم اور سمن کے آنے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی اور لوگوں نے مجھ سے کہا کہ موتیہاری میں اس روز ایسے منظر دیکھنے میں آئے جو پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ گورکھ بابو کے مکان پر

اور عدالت میں لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے اپنا کام رات ہی کو ختم کرلیا تھا ورنہ یہ مجمع کچھ نہ کرنے دیتا۔ میرے رفیقوں نے اس موقعے پر بڑا کام کیا۔ انھوں نے اس مجمع کو جو میرے پیچھے پیچھے سب کہیں پہنچتا تھا قابو میں رکھا اور اس کی تنظیم اور ترتیب کرتے رہے۔

یہاں کے حکام یعنی کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ سے مجھ سے ایک طرح کی دوستی ہوگئی۔ میں قانوناً ان کے احکام کی اطلاعیابی سے انکار کرنے کا مجاز تھا مگر میں نے خوشی سے اطلاعیابی کردی اور ان لوگوں کے ساتھ انتہائی تہذیب کا برتاؤ کیا۔ ان پر یہ ثابت ہوگیا کہ مجھے ان سے ذاتی مخالفت نہیں بلکہ میں صرف ان کے احکام کے خلاف سول نافرمانی کررہا ہوں۔ اس سے انھیں بہت اطمینان ہوگیا اور انھوں نے مجھ پر سختی کرنے کے بجائے مجمع کی تنظیم میں میرا اور میرے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا۔ مگر یہ اس بات کا چشم دید ثبوت تھا کہ اس وقت ان کا رعب اٹھ گیا ہے۔ لوگوں نے کچھ دیر کے لیے سزا کا خوف دل سے نکال کر اپنے نئے دوست کی محبت کے آگے سر تسلیم خم کردیا تھا۔

یہ یاد رہے کہ چمپارن میں کوئی شخص مجھے نہیں جانتا تھا۔ کسانوں نے میرا نام تک نہیں سنا تھا۔ چمپارن گنگا کے شمالی کنارے سے دور ہمالیہ کے دامن میں نیپال کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس وقت تک یہاں کے لوگ ہندوستان کے بقیہ حصوں کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ کانگریس کا نام ان کے کانوں تک ضرور پہنچا تھا مگر اس میں شریک ہونا تو درکنار وہ اس کا ذکر کرتے ڈرتے تھے۔ مگر اب کانگریس کا ہاتھ ان کے دیس تک پہنچ گیا تھا اور اس کے ممبر وہاں جا پہنچے تھے۔ اگرچہ اس معاملے میں کانگریس کا نام نہ تھا مگر کام اسی کا تھا۔

میں نے اپنے دوستوں کے مشورے سے یہ طے کیا تھا کہ ہم جو کچھ کریں اپنی طرف سے کریں کانگریس کا نام نہ آئے۔ ہمیں نام سے غرض نہ تھی، بلکہ کام سے تھی۔ جو ہر سے

واسطہ تھا غرض سے نہ تھا۔ بات یہ تھی کانگریس کے نام سے گورمنٹ اور اس کے ولی نعمت نیل کی کوٹھی والے بھڑکتے تھے۔ ان کے ذہن میں کانگریس کا مفہوم تھا وکیلوں کی کج بحثیاں، قانونی داؤ پیچ سے قانون کو پچھاڑنا، بم کے گولے، انارکسٹوں کے جرائم، حکمت عملی اور ریاکاری۔ ہم ان کے دل سے اس خیال کو دور کرنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کانگریس کو بیچ میں نہ لائیں اور کسانوں سے اس کا ذکر تک نہ کریں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ان لوگوں میں کانگریس کی اصلی روح پیدا ہو جائے تو یہی بہت کافی ہے۔

اس لئے ہمارے آنے سے پہلے کانگریس کی طرف سے اخفیہ یا علانیہ طور پر، کوئی سفیر لوگوں کو تیار کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا۔ بیچارے راجکمار شکل ہزاروں کسانوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس نواح میں اب تک کسی طرح کا سیاسی کام نہیں کیا گیا تھا۔ بیچارے کسانوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چمپارن کے باہر بھی دنیا آباد ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گویا میں ان کا برسوں کا دوست تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کسانوں کے ساتھ میں مجھے خدا کا نور، اہمسا اور حق کا جلوہ نظر آگیا۔

جب میں دل میں سوچتا ہوں کہ مجھے کس استحقاق کی بنا پر یہ دولت نصیب ہوئی تو سوائے اُس محبت کے جو مجھے اپنے ہم جنسوں سے ہے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی اور یہ محبت خود "اہمسا" کے عقیدے کا نتیجہ ہے جو میرے دل پر اسطرح نقش ہے کہ مٹ نہیں سکتا۔

وہ دن میری زندگی میں یادگار رہیگا۔ میرے لئے اور چمپارن کے کسانوں کے لئے وہ دن عید سے کم نہیں تھا۔

قانون کے مطابق میرے مقدمے کی تحقیقات درپیش تھی مگر سچ پوچھئے تو حکومت کا امتحان ہو رہا تھا۔ کمشنر نے جو جال میرے لئے پھیلایا تھا اس میں خود حکومت پھنس گئی۔

پندرھواں باب

مقدمہ واپس لے لیا گیا

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل، مجسٹریٹ اور دوسرے عہدیدار بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ سرکاری وکیل مجسٹریٹ پر زور ڈال رہا تھا کہ مقدمے کی پیشی بڑھا دی جائے مگر میں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں میں خود اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے چمپارن سے چلے جانے کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس کے بعد میں نے حسب ذیل بیان پڑھ کر سنایا:۔

"میں عدالت کی اجازت سے بہت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اُس حکم کی، جو دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند کے مطابق جاری کیا گیا تھا، ظاہری خلاف ورزی کیوں کی۔ میری ناقص رائے میں بات صرف اتنی ہے کہ میرے اور مقامی حکام کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ میں اس علاقے میں انسانی اور قومی خدمت کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ یہاں آکر کسانوں کی مدد کروں جن کے ساتھ نیل کی کوٹھی والے ناانصافی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ میں بغیر واقعات کی تحقیقات کئے کوئی مدد نہیں کر سکتا اس لئے یہ چاہتا ہوں کہ، اگر ہو سکے تو حکام اور کوٹھی والوں کی مدد سے، صورت حال کا مطالعہ کروں۔ میری کوئی اور غرض نہیں ہے اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ میرے آنے سے نقض امن یا کشت وخون کا اندیشہ ہے۔ مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں ان معاملات میں بہت کافی تجربہ رکھتا ہوں۔ مگر حکام کا خیال کچھ اور ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ اُن کے فرائض بہت نازک ہیں اور انھیں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو اطلاع ملے اسکی

بنا پر کارروائی کریں۔ ایک پابندِ قانون شہری کی حیثیت سے میری طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے حکم کی تعمیل کروں لیکن اگر ایسا کرتا تو اُن کسانوں سے بیوفائی ہوتی جن کے بلانے سے میں آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی خدمت کے لیے میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔ اس لئے مجھے اپنے فعل سے چمپارن سے جانا گوارا نہیں ہوا۔ فرائض کی اس کشمکش میں میرے لئے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ اپنے اخراج کی ذمہ داری حکام پر ڈالوں۔ میں اس بات کو پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ میری جیسی حیثیت کے آدمی کو بہت سمجھ بوجھ کر کوئی مثال قائم کرنا چاہیئے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اُس پیچیدہ دستوراساسی کے ماتحت جو آجکل ہندوستان میں رائج ہے، ایسی صورت میں جو مجھے درپیش ہے ہر خوددار اور محتاط آدمی کے لئے یہی مناسب ہے کہ میری طرح سول نافرمانی کرے اور چپ چاپ اس کی سزا بھگتے۔

میں یہ بیان اس غرض سے نہیں دے رہا ہوں کہ مجھے جو سزا دی جانے والی ہے اُس میں تخفیف ہو جائے بلکہ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ میں نے مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی سوءِ ادب کی بنا پر نہیں کی بلکہ فطرتِ انسانی کے بلند و برتر قانون یعنی ضمیر کے حکم کی تعمیل میں۔"

اس کے بعد پیشی بڑھانے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن چونکہ مجسٹریٹ اور سرکاری وکیل میری اس تقریر کے لئے تیار نہ تھے اس لئے مقدمہ ملتوی کر دیا گیا۔ اس عرصے میں میں نے وائسرائے، پٹنہ کے احباب، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے لیڈروں کو تار کے ذریعے سارے واقعات کی اطلاع دیدی تھی۔

دوسری پیشی سے پہلے مجسٹریٹ کی تحریر پہنچی کہ لفٹنٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دیدیا ہے اور کلکٹر نے لکھا کہ آپ جو تحقیقات کرنا چاہتے ہیں شوق سے کیجئے اگر آپ کو حکام سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی تو وہ خوشی سے دیں گے۔

میں مسٹر ہیکاک، کلکٹر سے ملا۔ وہ بڑے اچھے اور انصاف پسند آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو جن کاغذات کی ضرورت ہو بے تکلف طلب کیجئے، اور جب جی چاہے مجھ سے ملئے۔

اسطرح سے ہندوستان نے سول نافرمانی کا پہلا عملی سبق سیکھا۔ اس مسئلے پر مقامی حلقوں میں اور اخباروں میں خوب بحثیں ہوئیں اور خلاف توقع میری تحقیقات کی بڑی اشاعت ہوئی۔ میری تحقیقات کے لئے حکومت کا غیر جانبدار رہنا ضروری تھا مگر اخباروں کے نامہ نگاروں کی تائید اور ان کے افتتاحی مقالوں سے مجھے کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو صورت حال اس قدر نازک تھی کہ زیادہ سخت تنقید یا مبالغہ آمیز اطلاعوں سے میرے مقصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں نے بڑے بڑے اخباروں کے اڈیٹروں کو لکھ کر آپ نامہ نگار بھیجنے کی زحمت نہ کیجئے، جس چیز کی اشاعت کی ضرورت ہوگی میں خود آپ کو لکھ بھیجوں گا اور واقعات کی اطلاع برابر دیتا رہوں گا۔

میں جانتا تھا کہ حکومت کا ہمدردانہ رویہ چمپارن کے کوٹھی والوں کو سخت ناگوار ہے اور حکام بھی چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں مگر دل میں خوش نہیں ہیں۔ اس لئے اگر بے سروپا یا غلط فہمی پیدا کرنے والی اطلاعیں شائع ہوں گی تو یہ لوگ اور زیادہ جھلائیں گے اور اپنا غصہ مجھ پر اتارنے کے بجائے غریب، خوف زدہ کسانوں پر اتاریں گے جس کی وجہ سے مجھے صحیح حالات معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔

اس احتیاط کے باوجود کوٹھی والے میرے خلاف زہر اگلنے سے باز نہ رہے۔ اخباروں میں میرے اور میرے رفیقوں کے متعلق طرح طرح کی جھوٹی خبریں شائع ہوتی رہیں۔ مگر میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی بات میں سچائی کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ حریفوں کی تلواریں کند ہوگئیں۔

کوٹھی والوں نے برجکشور بابو کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن وہ میں

معاملے میں جتنا اہتمام کرتے تھے اتنی ہی بابو صاحب کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھتی جاتی تھی۔
ایسی نازک حالت میں مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ دوسرے صوبوں کے لیڈروں کو چمپارن بلاؤں۔ پنڈت مالوی جی نے کہلا بھیجا تھا کہ تمہیں جب میری ضرورت ہو مجھے بلا بھیجو مگر میں نے انھیں زحمت نہیں دی۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ غیر سیاسی معاملات کو، خواہ ان کی غرض سیاسی ہی کیوں نہ ہو، سیاست کا رنگ دینا مضر ہے اور سیاست سے بچائے رکھنا مفید ہے۔ چمپارن کے معرکے سے یہ ثابت ہو گیا کہ لوگوں کی بے غرض خدمت سے، خواہ وہ کسی شعبے میں کی جائے ملک کو ایک نہ ایک دن سیاسی فائدہ بھی ضرور پہنچتا ہے۔

سولھواں باب

کام کے طریقے

اگر میں اس تحقیقات کے تفصیلی حالات بیان کروں تو گویا مجھے چمپارن کے کسانوں کی اتنے دن کی پوری تاریخ لکھنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ چمپارن کی تحقیقات اہنسا اور حق کی تلاش کی ایک دلیرانہ سعی تھی اور میں ان ہفتہ وار مضامین میں صرف انھیں باتوں کا ذکر کروں گا جو اس نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں۔ جن حضرات کو تفصیلی حالات معلوم کرنا ہوں وہ بابو راجندر پرشاد کی "چمپارن کی ستیاگرہ کی تاریخ"[1] پڑھیں۔ یہ کتاب ہندی میں ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ رہا ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد میں اصل واقعے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ مجھے یہ دقت تھی کہ تحقیقات کہاں کی جائے۔ گورکھ بابو کے گھر میں یہ بکھیڑا ہوتا تو ان بیچارے کو گھر خالی کرنا پڑتا۔ دوسرے مکان کی تلاش تھی مگر ابھی تک موتیہاری کے لوگ ہمیں اپنا مکان کرائے پر دیتے ڈرتے تھے۔ تاہم برجکشور بابو نے تالیف قلوب سے کام لے کر ہمیں ایک مکان دلوا دیا جس کے احاطے میں ایک کشادہ میدان بھی تھا۔

اس کام کے لئے کچھ نہ کچھ روپئے کی ضرورت تھی۔ اب تک کبھی اس قسم کے کام کے لئے چندہ نہیں ہوا تھا۔ برجکشور بابو خود اور ان کے دوست زیادہ تر وکیل تھے جو ضرورت کے وقت یا تو خود چندہ دیتے تھے یا اپنے احباب سے دلواتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہم

---

[1] یہ انگریزی ترجمہ اب ایس گنیسن نے تربلیکین، مدراس سے شائع کر دیا ہے۔

خود دے سکتے ہیں تو دوسروں سے کس منہ سے مانگیں۔ یہ میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ چمپارن کے کسانوں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ ایسا کرتا تو لوگوں کو شبہ کرنے کا موقع ملتا۔ ملک میں عام چندہ کرنا بھی مجھے منظور نہیں تھا کیونکہ اس سے اس تحقیقات میں سیاسی رنگ آ جانے کا اندیشہ تھا۔ بمبئی کے چند دوستوں نے پندرہ ہزار روپیہ دینا چاہا مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ برج کشور بابو کی مدد سے بہار کے دوسرے مقامات میں آسودہ حال لوگوں سے چندہ کروں اور اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنے رنگون کے دوست ڈاکٹر جے۔ پی۔ مہتا کو تکلیف دوں۔ انہوں نے میرے لکھنے پر بڑی خوشی سے وعدہ کر لیا کہ مجھے جتنے روپے کی ضرورت ہوگی بھیجیں گے۔ غرض ادھر سے ہمیں پورا اطمینان ہو گیا۔ ہمیں کوئی بہت بڑی رقم درکار نہیں تھی کیونکہ چمپارن والوں کی غربت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم بہت کفایت سے کام لیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے سب ملا کر تین ہزار روپے سے زیادہ خرچ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے جو چندہ جمع ہوا تھا اُس میں سے دو چار سو روپے بچ رہے۔

شروع شروع میں میرے رفیق جس ٹھاٹ سے رہتے تھے اُس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔ ہر وکیل کے ساتھ ایک خدمت گار اور ایک باورچی تھا۔ ہر ایک کا باورچی خانہ الگ تھا اور یہ لوگ بارہ بجے رات کو کھانا کھاتے تھے۔ یہ اپنے مصارف خود برداشت کرتے تھے پھر بھی مجھے ان کے لااُبالی پن سے تکلیف ہوتی تھی۔ میں ان کا مضحکہ اُڑاتا تھا مگر ہمارے آپس میں اس قدر گہرے تعلقات ہو گئے تھے کہ وہ کبھی بُرا نہیں مانتے تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ نوکر رخصت کر دئے جائیں، سب کا کھانا ایک جگہ پکے اور کھانے کے اوقات کی پابندی کی جائے۔ سب لوگ نباتاتی نہیں تھے مگر چونکہ دو جگہ کھانا پکنے میں خرچ زیادہ تھا اس لئے سب نے نباتاتی غذا پر بسر کرنا منظور کر لیا۔ کھانے میں سادگی بھی اختیار کی گئی۔ اس انتظام کی بدولت خرچ بہت کم ہو گیا اور بہت سا وقت جو فضول ضائع ہوتا تھا

بچ گیا۔ ان دونوں چیزوں میں کفایت ہمارے لئے بہت ضروری تھی۔ کسانوں کے گروہ کے گروہ بیان دینے کے لئے آتے تھے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی لاتے تھے۔ سارے احاطے اور باغ میں تل رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ مجھے "درشن" کی مصیبت سے بچائیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مقررہ اوقات پر میری نمائش "درشن" کے لئے ہوتی تھی۔ پانچ سات رضاکار بیانات لکھتے پھر بھی کچھ لوگ رہ جاتے اور انھیں بغیر بیان لکھائے واپس جانا پڑتا۔ ان میں سے سب بیان ضروری نہیں تھے۔ اکثر لوگ انھیں باتوں کو دُہراتے جو دوسرے ان سے پہلے کہہ چکے تھے مگر کسانوں کو بغیر اپنی اپنی بپتا سنائے چین نہیں آتا تھا اور مجھے ان کے اس جذبے سے ہمدردی تھی۔

بیان لکھنے والوں کو مقررہ قواعد کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ ہر کسان سے خوب جرح کی جاتی اور جو لوگ جرح میں ٹوٹ جاتے اُن کی شہادت رد ہو جاتی۔ اس میں بہت وقت صرف ہو جاتا تھا مگر اس سے یہ فائدہ ہوا کہ جتنے بیانات لکھے گئے ان میں سے اکثر پوری طور پر قابلِ اعتماد تھے۔

ان بیانات کے لکھتے وقت ایک خفیہ پولیس کا عہدہ دار موجود رہتا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے نہ رہنے دیتے مگر ہم نے شروع سے یہ طے کر لیا تھا کہ خفیہ پولیس والوں کی مزاحمت نہیں کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آئیں گے اور حتی الامکان انھیں ہر طرح کی معلومات فراہم کرنے میں مدد دیں گے۔ اس سے ہمارا کوئی ہرج نہیں ہوا۔ بلکہ خفیہ پولیس کے عہدہ داروں کے سامنے بیان ہونے سے کسانوں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے دل میں خفیہ پولیس والوں کا رعب کم ہو گیا اور دوسری طرف ان عہدہ داروں کی موجودگی کے سبب سے انھیں اپنے بیان میں مبالغہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ جانتے تھے کہ خفیہ پولیس والے انھیں پھانسنے کی فکر میں رہتے ہیں اس لئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔

مجھے کوٹھی والوں کو اشتعال دلانا منظور نہیں تھا بلکہ میں نرمی اور ملاطفت سے انھیں پر جانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے یہ التزام کرلیا تھا کہ جن لوگوں کی سختی کی زیادہ شکایت کی جاتی ان سے خط وکتابت کرتا اور ان کے گھر جاکر اُن سے ملتا۔ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے کارکنوں سے بھی ملاقات کی۔ انھیں کسانوں کی شکایتیں سنائیں اور ان کے جواب سنے۔ ان میں سے بعض مجھ سے نفرت کرتے تھے، بعض بے توجہی برتتے تھے اور دو چار ایسے بھی تھے جو میرے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے۔

سترھواں باب

میرے ساتھی

برج کشور بابو اور راجندر بابو جیسے دو آدمی مشکل سے ملیں گے۔ ان کے خلوص اور انہماک کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کوئی کام ان کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ ان کے چیلے یا رفیق شمبھو بابو، انوگرہ بابو، دھرنی بابو، رام نومی بابو اور دوسرے وکیل ہر وقت ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ونِدھیا بابو اور جنکدھری بابو بھی کبھی کبھی آ کر ہماری مدد کرتے تھے۔ یہ سب بہاری تھے۔ ان کا کام زیادہ تر کسانوں کے بیانات لکھنا تھا۔

پروفیسر کرپلانی بھلا ہمارا ساتھ دئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ ہونے کو تو وہ سندھی تھے مگر اصل میں بہاریوں سے زیادہ بہاری تھے۔ میں نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو ان کی طرح دل وجان سے اپنے مجازی وطن کے ہو رہیں۔ کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کسی دوسرے صوبے کے ہیں۔ یہ میرے میر حاجب تھے۔ ان دنوں انہوں نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دی تھی کہ مجھے "درشن" کے طالبوں سے بچائیں۔ وہ کبھی اپنی خلقی ظرافت سے اور کبھی پیار کی دھمکیوں سے کام لے کر غنیم کو پسپا کر دیتے تھے۔ رات کو وہ معلم بن جاتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو اپنی تاریخی تحقیقات سے محظوظ کیا کرتے تھے۔ اگر اتفاق سے کوئی گجدلا آ جائے تو ان کی باتیں سنکر بھیڑ سے شیر بن جاتا تھا۔

مولانا مظہر الحق نے اپنا نام اُمیدوار رضا کاروں کی فہرست میں لکھوا دیا تھا کہ جب مجھے ضرورت ہو ان سے مدد لوں اور مہینے میں دو ایک بار ضرور میرے پاس ہو جایا کرتے تھے۔ انکی اس زمانے کی شان وشوکت اور آج کل کی سادگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ہم

سے اس خلوص سے ملتے تھے کہ ہم انہیں اپنا رفیق سمجھتے تھے حالانکہ کوئی اجنبی ان کے ٹھاٹھ دیکھتا تو اُسے یہ یقین نہ آتا۔

بہار سے زیادہ واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جب تک یہاں کے دیہات میں تعلیم نہ ہو کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ کسانوں کی جہالت بہت افسوسناک تھی۔ ان کے بچے یا تو بیکار مارے مارے پھرتے تھے یا نیل کے کھیتوں میں صبح سے شام تک دو تین پیسے روز پر کام کرتے تھے۔ ان دنوں مزدوری کی شرح مردوں کے لئے ڈھائی آنے، عورتوں کے لئے ڈیڑھ آنے اور بچوں کے لئے تین پیسے سے زیادہ نہ تھی۔ جو شخص چار آنے روز کما لے۔ وہ بڑا خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔

اپنے رفیقوں کے مشورے سے میں نے یہ طے کیا کہ چھ گاؤں میں ابتدائی مدارس کھولے جائیں۔ گاؤں والوں کے ساتھ ایک شرط یہ تھی کہ تم مدرّس کے کھانے اور رہنے کا انتظام کر دو باقی مصارف ہمارے سر رہیں گے۔ گاؤں والوں کے پاس نقد روپیہ تو تھا نہیں مگر وہ کھانے کی چیزیں فراہم کر سکتے تھے۔ انہوں نے غلّہ اور دوسری خام اجناس دینے کا وعدہ کر لیا۔ اب یہ سوال تھا کہ مُدرّس کہاں سے آئیں؟ مقامی لوگوں میں ایسے مدرّس ملنا مشکل تھا جو بلا معاوضہ یا کم معاوضے پر کام کریں۔ ایسے ویسے لوگوں کو میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میری نظر میں علمی قابلیت کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی اخلاقی صفات کی تھی۔

اس لئے میں نے رضا کار مدرسوں کے لئے عام اپیل کیا۔ اس کا فوراً اثر ہوا۔ گنگا دھر راؤجی دیشپانڈے نے بابا صاحب سومن اور پنڈارک کو بھیج دیا۔ بمبئی سے مسز اونتکا بائی گوکھلے اور پونا سے انندی بائی آگئیں۔ آشرم سے میں نے چھوٹالال، سریندر ناتھ اور اپنے بیٹے دیو داس کو بلا لیا۔ اسی زمانے میں مہادیو دیسائی اور نرہری پاریکھ اپنی بیویوں کو لے کر ہم سے آملے۔ کستورا بائی کو بھی میں نے اس کام میں شریک کر لیا۔ کام کرنے والوں کی مدد اچھی خاصی ہو گئی۔ اونتکا بائی اور انندی بائی اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھیں مگر مسز دُرگا دیسائی

اور مسز منی بین پارکھ صرف تھوڑی بہت گجراتی جانتی تھیں۔ کستورا بائی اس سے محروم تھیں۔ سوال یہ تھا کہ یہ خواتین بچوں کو ہندی کے ذریعے کیونکر تعلیم دیں؟

میں نے انھیں سمجھایا کہ آپ بچوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانے کی زیادہ فکر نہ کیجئے بلکہ انہیں صفائی اور شائستگی سکھائیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ گجراتی، ہندی اور مرہٹی حروف میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا آپ سمجھتی ہیں اور مکتب میں حروف تہجی اور ہندسے سکھانے میں آپ کو زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ ان خواتین کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جماعتیں سب سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔ اس تجربے کی بدولت انھیں اپنے کام میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی اور ان کی ہمت بڑھ گئی۔ اونتکا بائی کا مدرسہ دوسرے مدرسوں کے لئے نمونہ بن گیا۔ انھیں اپنے کام میں بے حد انہماک تھا۔ انہوں نے اپنی خداداد قابلیت کا پورا استعمال کیا۔ ان خواتین کے ذریعے سے ہم نے گاؤں کی عورتوں کی بھی تھوڑی بہت اصلاح کی۔

مگر میں صرف ابتدائی تعلیم پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں بے حد گندے تھے، گلیاں غلاظت سے پٹی ہوئی تھیں، کنوؤں کے گرد کیچڑ اور سڑی گلی چیزوں کے دلدل تھے، اور مکانوں کے صحن گھورے سے بدتر تھے۔ بالغوں کو صفائی کی تعلیم دینا بہت ضروری تھا۔ یہ سب کے سب جِلدی امراض میں مبتلا تھے۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ صفائی پر انتہائی زور دیا جائے اور ان کی زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جائے۔

اس کام کے لئے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑی۔ ہم نے انجمن خدام ہند سے درخواست کی کہ ڈاکٹر دیو آنجہانی کو ہماری مدد کے لئے بھیجے۔ وہ میرے بڑے دوست تھے اور میری درخواست پر چھ مہینے کے لئے چلے آئے۔ سب پڑھانے والوں اور پڑھانے والیوں کو ان کی ماتحتی میں کام کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔

میں نے ان سب کو تاکید کر دی کہ نیل کے کاشتکاروں کی شکایتوں اور سیاسی معاملات سے مطلق سروکار نہ رکھیں۔ جو شخص شکایت کرے اُسے میرے پاس بھیجدیں۔ کوئی

اپنے دائرۂ عمل سے باہر قدم نہ رکھے۔ میرے دوستوں نے نہایت وفاداری سے ان ہدایتوں کی تعمیل کی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی ذرا سی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو۔

اٹھارھواں باب

دیہات کی اصلاح

جہاں تک ہو سکا ہم نے ہر مدرسے کو ایک معلّم اور ایک معلّمہ کی نگرانی میں رکھا۔ دوسرے رضا کار دواؤں کی تقسیم اور حفظانِ صحت کے انتظام کے لئے تعینات کئے گئے۔ عورتوں کی امداد کے لئے عورتیں مقرر ہوئیں۔

طبی امداد کا طریقہ بالکل سہل اور سادہ تھا۔ رضا کاروں کے پاس صرف کونین، ارنڈی کا تیل اور گندھک کا مرہم رہتا تھا۔ اگر مریض کی زبان میلی نظر آئے یا وہ قبض کی شکایت کرے تو اُسے ارنڈی کا تیل پلایا جاتا تھا، اگر بخار ہو تو ارنڈی کے تیل کے ہلکے مسہل کے بعد کونین دی جاتی تھی اور خارش یا پھنسیاں ہوں تو انھیں اچھی طرح دھو کر گندھک کا مرہم لگا دیا جاتا تھا۔ کسی مریض کو دوا گھر پر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کبھی مرض میں کوئی پیچیدگی نظر آتی تھی تو ڈاکٹر دیو بلا لئے جاتے تھے۔ یوں بھی وہ ہفتے میں چند بار ہر مرکز کے معائنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

بہت سے لوگ اس سیدھے سادے علاج سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ یہ طریقہ بظاہر انوکھا معلوم ہوتا تھا لیکن بات یہ تھی کہ یہی دو چار بیماریاں قبض، بخار، خارشت عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں، اور ان کا علاج آسانی سے بغیر ڈاکٹر کی مدد کے ہو سکتا تھا۔ مریضوں کو بھی اسی میں سہولت تھی۔

حفظانِ صحت کا معاملہ ذرا مشکل تھا۔ گاؤں کے لوگ خود ہاتھ پیر ہلانے پر تیار نہ تھے۔ مزدوروں تک کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنا پاخانہ خود اُٹھائیں اور اپنے گھر میں جھاڑو دیں۔

مگر ڈاکٹر دیو ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے اور رضا کاروں نے اپنی ساری محنت ایک گاؤں کی صفائی پر صرف کردی تاکہ وہ دوسروں کے لیے معیار بن جائے۔ پہلے انھوں نے خود سڑکوں پر اور گھروں میں جھاڑو دی، کنووں کو صاف کیا، قریب کے گڑھوں کو مٹی سے بھرا اس کے بعد نرمی اور محبت سے گاؤں والوں کو رضا کار بننے پر آمادہ کیا۔ بعض گاؤوں میں انھوں نے لوگوں کو غیرت دلا کر اُن سے کام لیا یہاں تک کہ دو ایک جگہ کے لوگوں میں اتنا جوش پیدا ہو گیا کہ انھوں نے میری موٹر کے جانے کے لیے سڑک بھی تیار کردی۔ ان خوشگوار تجربوں کے ساتھ لوگوں کی بے پروائی کے تلخ تجربے بھی ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ بعض گاؤوں میں لوگوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم اس کام کو پسند نہیں کرتے۔

مناسب ہوگا کہ میں یہاں ایک واقعے کا ذکر کردوں جسے میں اپنی تقریروں میں اکثر بیان کر چکا ہوں۔ بھٹی ہاروا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اُس میں ہمارا ایک مدرسہ تھا۔ وہاں جاتے ہوئے میں ایک مزرعہ سے گذرا جہاں چند عورتیں بہت میلے کپڑے پہنے نظر آئیں۔ میں نے مسز گاندھی سے کہا ان سے پوچھے کہ یہ اپنے کپڑے کیوں نہیں دھوتیں۔ انھوں نے ان عورتوں سے گفتگو شروع کی۔ ان میں سے ایک انھیں اپنی جھونپڑی میں لے گئی اور کہنے لگی: "دیکھ لو یہاں نہ کوئی صندوق ہے نہ الماری جس میں اور کپڑے رکھے ہوں۔ جو ساری میں پہنے ہوں اس کے سوا میرے پاس کوئی کپڑا نہیں۔ مہاتما جی سے کہو مجھے ایک ساری اور دے دیں پھر میں روز نہا کر کپڑے بدلا کروں گی۔"

ایسی جھونپڑیاں ہندوستان کے بہت سے گاؤوں میں پائی جاتی ہیں۔ نہ جانے کتنے غریب ایسے ہیں جن کے گھر ایک چٹائی تک نہیں اور جن کے پاس سوائے اُس چیتھڑے کے جس سے وہ ستر پوشی کرتے ہیں، اور کوئی کپڑا نہیں۔

میں ایک اور تجربہ بھی لکھوں گا۔ چمپارن میں پیتا اور بانس بہت کثرت سے

ہی۔ بھتی ہاروا میں مدرسے کے لئے انھیں چیزوں کا ایک جھونپڑا بنا دیا گیا تھا۔ ایک رات کسی شخص نے ـــ ممکن ہے کہ نیل کی کوٹھی والوں کا آدمی ہو ـــ اس میں آگ لگادی۔ اس کے بعد یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ پھر پتا ور اور بانس کا جھونپڑا بنایا جائے۔ اس مدرسے کی نگرانی سومن جی اور مسز گاندھی کے سپرد تھی۔ سومن جی نے یہ طے کیا کہ پکا مکان بنانا چاہیے۔ وہ خود اس مستعدی سے کام کرنے لگے کہ بہت سے لوگ ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ چند ہی روز میں اینٹوں کا مکان تیار ہوگیا۔ اب آگ لگنے کا خوف نہیں رہا۔

غرض رضاکاروں کے اسکولوں، حفظان صحت کے کام اور طبی امداد کی بدولت لوگ انھیں عزت کی نظر سے دیکھنے لگے اور ان پر بھروسا کرنے لگے۔ ان کے اثر سے کسانوں کی زندگی میں بہت کچھ اصلاح ہوگئی۔

مگر مجھے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اس تعمیری کام کو مستقل بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہ رضاکار عارضی طور پر آئے تھے، ان کے جانے کے بعد نہ باہر کے لوگ آئے اور نہ بہار کے مستقل اعزازی کارکن مل سکے۔ مجھے خود چمپارن کا کام ختم کرنے کے بعد دوسری جگہ، جہاں میری ضرورت تھی، چلا جانا پڑا۔ پھر بھی اس چند مہینے کے کام نے چمپارن والوں کی زندگی میں اتنی تبدیلی کر دی تھی کہ اس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں آج تک نظر آتا ہے۔

انیسواں باب

گورنر کی نیکدلی

ایک طرف تو یہ اصلاحی کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف کسانوں کے بیانات لکھے جا رہے تھے۔ ان بیانوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ کوٹھی والوں نے جب یہ رنگ دیکھا تو ان کا غصہ اور بھڑکا اور انہوں نے میری تحقیقات کو روکنے میں کوئی کوشش نہیں اُٹھا رکھی۔

ایک دن میرے پاس بہار کے گورنر کی طرف سے اس مضمون کا خط آیا "آپ کی تحقیقات کو بہت طول ہو گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اسے جلد ختم کر دیں اور بہار سے رخصت ہو جائیں"۔ خط بہت نرم اور مہذب الفاظ میں لکھا گیا تھا لیکن اس کا مطلب بالکل صاف تھا۔

میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ ایسی تحقیقات میں طول ہونا لازمی ہے اور میں نے مصمم قصد کر لیا ہے کہ جب تک اس کے ذریعے سے کسانوں کی شکایتیں دور نہ ہو جائیں میں بہار سے نہیں جاؤں گا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات روک دی جائے تو اس کی تدبیر بہت سہل ہے یا تو وہ کسانوں کی شکایتوں کو تسلیم کرے اور ان کی چارہ جوئی کرے یا کم سے کم ان کے بیانات کو قابل توجہ سمجھ کر فوراً ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔

لفٹنٹ گورنر، سر ایڈورڈ گیٹ نے مجھے بلا کر مجھ سے گفتگو شروع کی اور کہا کہ میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی اس کا ممبر بنادونگا۔ میں نے کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے نام دریافت کئے اور اپنے رفیقوں سے مشورہ

کرنے کے بعد کہا کہ میں تین شرطوں پر کمیٹی کی شرکت قبول کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ مجھے دورانِ تحقیقات میں اپنے رفیقوں سے مشورہ کرنے کی اجازت ہو۔ دوسرے گورنمنٹ یہ تسلیم کرلے کہ کمیٹی کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ میں کسانوں کا پیروکار بھی ہوں۔ تیسرے اگر میں تحقیقات کے نتیجے سے مطمئن نہ ہوں تو مجھے یہ اختیار رہو کہ میں رعایا کو ان کے آیندہ طرزِ عمل کے متعلق مشورہ دوں۔

سر ایڈورڈ گیٹ نے ان شرطوں کو معقول سمجھ کر قبول کرلیا اور تحقیقات کا اعلان کردیا۔ سر فرینک سلائی انجمانی کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی کہ جو رقمیں کوٹھی والوں نے کمیٹی کے نزدیک ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ ان سے واپس دلایا جائے اور "تنکتھیا" کا طریقہ منسوخ کردیا جائے۔

کمیٹی میں اتفاقِ رائے پیدا کرنے میں اُس کی تجویز کے مطابق مسودۂ قانون پاس کرانے میں سر ایڈورڈ گیٹ کی کوشش کو بہت کچھ دخل ہے۔ اگر وہ انتہائی استقلال اور موقع شناسی سے کام نہ لیتے تو نہ کمیٹی کی رپورٹ متفقہ ہوتی اور نہ قانونِ مزارعین پاس ہوتا۔ کوٹھی والوں کا بہار میں بے انتہا اثر تھا۔ باوجود اس کے کہ رپورٹ ان کے خلاف تھی انہوں نے مسودۂ قانون کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ لیکن سر ایڈورڈ گیٹ آخر تک ثابت قدم رہے اور انھوں نے کمیٹی کی تجاویز پر پوری طرح عمل کیا۔

اس طرح "تنکتھیا" کا طریقہ جو سو سال سے جاری تھا، منسوخ ہوگیا اور کوٹھی والوں کے راج کا خاتمہ ہوا۔ رعایا کو جو ہمیشہ سے پامال ہوتی آئی تھی تھوڑے بہت حقوق مل گئے اور لوگوں کے دل سے یہ خیالِ خام دور ہوگیا کہ نیل کا دھبّا کبھی نہیں مٹ سکتا۔

میں چاہتا تھا کہ چند سال تک چمپارن میں تعمیری کام جاری رکھوں اور مدرسے کھولوں اور دیہات کی زیادہ گہری اصلاح کروں۔ اس کے لئے زمین بھی تیار ہو چکی تھی مگر، جیسا پہلے کئی بار ہو چکا تھا، مشیتِ ایزدی سے میرا یہ ارادہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اس نے میرے لئے دوسرا کام تجویز کر رکھا تھا۔

بیسواں باب

مزدوروں سے سابقہ

ابھی میں تحقیقاتی کمیٹی کا کام ختم نہیں کر پایا تھا کہ موہن لال جی پانڈے اور شنکر لال جی پارکھ کا خط پہنچا کہ کھیدا ضلعے میں فصل ماری گئی، لگان کا تقاضا ہے اور کسان اس کے ادا کرنے سے معذور ہیں آپ بتائیے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ مجھ میں نہ اتنی قابلیت اور ہمت تھی اور نہ میرا جی چاہتا تھا کہ بغیر موقعے کا معائنہ کیے ہوئے کسی قسم کا مشورہ دوں۔

اُدھر احمد آباد سے انسویا بائی نے وہاں کے مزدوروں کی حالت لکھی۔ ان لوگوں کو مزدوری بہت کم ملتی تھی۔ بیچارے بہت دن سے ہاتھ پیر مار رہے تھے کہ کچھ اضافہ ہو جائے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ اگر ہو سکے تو ان کی مدد کروں۔ مگر اس چھوٹے سے کام کو بھی میں دور بیٹھ کر چلانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے موقع ملتے ہی میں احمد آباد روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ اُمید تھی کہ ان دونوں قصوں کو میں جلدی سے پٹا کر چمپارن لوٹ آؤں گا اور یہاں کے تعمیری کام کی نگرانی کروں گا۔

مگر احمد آباد اور کھیدا میں مجھے بہت دن لگ گئے اور میں چمپارن نہ جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے سارے مدرسے ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔ میرے اور میرے رفیقوں کے شیخ چلی کے سے منصوبے خاک میں مل گئے۔

ہماری تجویز یہ تھی کہ چمپارن میں تعلیم اور حفظانِ صحت کے علاوہ گئو رکشا کا انتظام بھی کریں۔ میں نے اپنے سفر کے سلسلے میں یہ دیکھا تھا کہ گئو رکشا اور ہندی کا پرچار مارواڑیوں کا حصہ ہو گیا ہے۔ بیتیا میں مجھے ایک مارواڑی دوست کے دھرم شالے میں ٹھہرنے کا اتفاق

ہوا۔ وہاں کے مارواڑیوں نے مجھے اپنا گئو شالا دکھایا۔ میں گئو رکشا کے متعلق ایک خاص رائے رکھتا تھا اور ابتک اس پر قائم ہوں۔ میرے نزدیک اس میں مویشی کی افزائش نسل، اصلاح نسل، بیلوں سے رحمدلی کا برتاؤ، اعلیٰ درجے کے ڈیری فارم قائم کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ مارواڑی بھائیوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا تھا مگر چونکہ میرا مستقل قیام بتیا میں نہ ہو سکا اس لئے یہ تجویز رہ گئی۔

بیتیا کا گئو شالا اب تک قائم ہے مگر اس نے اعلیٰ درجے کے ڈیری فارم کی حیثیت نہیں اختیار کی ہے۔ چمپارن میں ابھی تک بیلوں سے حد سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ نام کے ہندو ابھی تک ان بے زبان جانوروں کو بیدردی سے مارتے ہیں اور اپنے دھرم کو بدنام کرتے ہیں۔

مجھے آج تک افسوس ہے کہ یہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔ جب کبھی میں چمپارن جاتا ہوں اور بہاری اور مارواڑی بھائیوں کی دوستانہ شکایتیں سنتا ہوں تو ان منصوبوں کا خیال کر کے آہ سرد بھرتا ہوں۔ ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

تعلیمی کام کسی نہ کسی صورت میں بہت سے مقامات پر اب بھی جاری ہے مگر گئو رکشا کا کام اچھی طرح جمنے نہیں پایا تھا اس لئے اسے حسب دلخواہ ترقی نہیں ہوئی۔

کھیدا کے کسانوں کا مسئلہ ہنوز زیر بحث تھا کہ میں نے احمد آباد کے مزدوروں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

یہ میرے لئے بڑا نازک موقع تھا۔ مزدوروں کی شکایتیں واجبی تھیں۔ اس جنگ میں کارخانوں کے مالکوں کے سپہ سالار امبالال جی سارا بھائی تھے۔ ان کی سگی بہن انسویا بائی مزدوروں کی طرف سے ان کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ میرے اور مالکوں کے دوستانہ تعلقات تھے اس لئے یہ لڑائی اور بھی دشوار ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کئی بار گفتگو کی اور انھیں سمجھایا کہ اس معاملے کو پنچوں کے سپرد کر دیجئے۔ مگر انھوں نے کہا کہ ہم مزدوروں کے مقابلے میں پنچائت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔

اس لئے مجھے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ مزدوروں کو ہڑتال کا مشورہ دوں۔ مگر اس سے قبل میں نے مزدوروں اور ان کے لیڈروں سے اچھی طرح میل جول پیدا کرلیا تھا اور انھیں سمجھا دیا تھا کہ ہڑتال کے کامیاب ہونے کی چار شرطیں ہیں :-

(۱) کبھی بھول کر تشدد سے کام نہ لو۔

(۲) جو لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ کر کام پر جانا چاہیں انھیں نہ ستاؤ۔

(۳) خیرات کا پیسہ ہرگز نہ لو

(۴) چاہے ہڑتال کتنے ہی دن چلے استقلال کو ہاتھ سے نہ دو اور کسی جائز طریقے سے روٹی کما کر کھاؤ۔

ہڑتال کے لیڈروں نے ان شرطوں کی اہمیت تسلیم کرلی اور انھیں قبول کرلیا۔ مزدوروں نے عام جلسے میں یہ عہد کیا کہ جب تک ان کے مطالبات پورے نہ ہوں گے یا معاملہ پنچوں کے سپرد نہ کیا جائے گا ہرگز کام پر نہ جائیں گے۔

اسی ہڑتال کے سلسلے میں مجھ سے ولبھ بھائی پٹیل اور شنکرلال جی بنیکر سے ملاقات ہوئی۔ انسویا بائی سے میں پہلے سے اچھی طرح واقف تھا۔

ہم لوگ روز سابرمتی کے کنارے ایک درخت کے سائے میں ہڑتالیوں کے جلسے کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے اور میں انھیں ان کا عہد یاد دلا کر امن وامان اور خودداری قائم رکھنے کی تاکید کرتا تھا۔ روزانہ انکا پُرامن جلوس شہر کی سڑکوں پر نکلتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے ہوتے تھے جن پر یہ الفاظ لکھے تھے: "ایک ٹیک" (عہد پر قائم رہو)۔

یہ ہڑتال اکیس دن جاری رہی۔ اس کے دوران میں میں وقتاً فوقتاً مالکوں سے ملتا رہتا تھا اور ان سے انصاف کی درخواست کرتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے "ہم کو بھی تو اپنا عہد پورا کرنا ہے۔ ہمارے اور مزدوروں کے تعلقات ایسے ہیں جیسے باپ

بیٹوں کے ہوتے ہیں۔ ہم اس معاملے میں باہر والوں کی مداخلت کیسے گوارا کریں۔ باپ بیٹوں کے بیچ میں پنچ کا کیا کام؟"

اکیسواں باب

آشرم کی ایک جھلک

قبل اس کے کہ میں ہڑتال کے اور حالات بیان کروں کچھ تھوڑا سا ذکر آشرم کا کر دینا ضروری ہے۔ چمپارن کے قیام کے زمانے میں میں آشرم کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ جب موقع ملتا تھا دو ایک دن کے لئے وہاں ہو آتا تھا۔

ان دنوں آشرم احمد آباد کے قریب کوچرب نام گاؤں میں تھا۔ اس گاؤں میں طاعون پھوٹا اور مجھے چھوٹے بچوں کی طرف سے بہت اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آشرم کے اندر لاکھ صفائی سہی مگر آس پاس کی گندگی کے اثرات سے بچنا ناممکن تھا۔ اس زمانے میں ہم اس قابل نہ تھے کہ کوچرب کے لوگوں سے حفظان صحت کے اصول کی پابندی کرائیں یا ان کی کوئی اور خدمت کر سکیں۔

ہم یہ چاہتے تھے کہ آشرم گاؤں اور شہر کے درمیان ایسی جگہ پر ہو کہ دونوں سے علیحدہ بھی رہے اور آمد و رفت میں زیادہ دشواری بھی نہ ہو۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی دن اپنی ذاتی زمین خرید لیں گے اور اس پر اپنی بستی بسائیں گے۔

طاعون کو میں اپنے قافلے کے لئے بانگ درا سمجھا۔ احمد آباد کے ایک تاجر سیٹھ پنجا بھائی ہیرا چند کو آشرم سے خاص تعلق تھا اور انہوں نے بارہا خلوص اور بے غرضی سے ہماری مدد کی تھی۔ وہ احمد آباد سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں آشرم کے لئے ایسی زمین جو ہر لحاظ سے مناسب ہو، تلاش کر دوں گا۔ میں ان کے ساتھ کوچرب کے شمال اور جنوب میں زمین کی تلاش میں پھرتا رہا۔ آخر میں میری یہ رائے ہوئی کہ تین چار میل شمال کی طرف

ہٹ کر کوئی قطعہ منتخب کیا جائے۔ انھوں نے وہ جگہ تجویز کی جہاں آج آشرم قائم ہے۔ یہ مقام مجھے اس لئے اور پسند آیا کہ سابرمتی کے سنٹرل جیل سے قریب تھا۔ ستیاگرہیوں کے لئے جن کا کام ہی جیل جانا ہے اس سے اچھی جگہ کون سی ہو سکتی تھی۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ جو موقع جیل کے لئے منتخب کیا جاتا ہے وہ عموماً صاف ستھرا ہوتا ہے۔

آٹھ روز کے اندر زمین خرید لی گئی۔ یہاں کسی عمارت یا درخت کا نام تک نہ تھا۔ لیکن دو بڑی خوبیاں تھیں: دریا کا کنارہ اور تنہائی۔

ہم نے یہ طے کیا کہ جب تک مستقل عمارت بنے خیموں میں رہیں گے اور باورچی خانے کے لئے ٹین کا سائبان ڈال لیں گے۔

آشرم والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوا تھا۔ اب ہم لوگ عورت، مرد، بچے ملا کر چالیس سے زیادہ تھے اور سب ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ یہ ساری تجویز میری تھی مگر اسے عمل میں لانا حسب معمول مگن لال کا کام تھا۔

مستقل عمارت بننے سے پہلے ہمیں بڑی دقتیں اٹھانا پڑیں۔ برسات قریب تھی اور کھانے کا سامان چار میل جا کر شہر سے لانا پڑتا تھا۔ زمین بنجر پڑی تھی اس لئے وہاں سانپوں کی بڑی کثرت تھی اور چھوٹے بچوں کے ساتھ یہاں رہنا بڑے خطرے کا کام تھا۔ ہم سانپوں کو مارتے نہیں تھے۔ مگر ان کا ڈر ہم سب کو لگا رہتا تھا اور اب تک وہی حال ہے۔

زہریلے کیڑوں کو نہ مارنا ہمارا اصول تھا اور فنکس، ٹالسٹائے فارم اور سابرمتی میں اس کی پابندی ہوتی رہی ہے۔ تینوں جگہ ہمیں بنجر زمین پر بستی بسانا پڑی۔ مگر آج تک ہمارے یہاں کوئی سانپ کے کاٹنے سے نہیں مرا۔ میری چشم عقیدت کو اس میں اُس رحمٰن و رحیم کی کارسازی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کوئی عقلِ کُل یہ کہے کہ خدا کو کیا پڑی ہے کہ کسی کو بچائے اور اُسے اتنی فرصت کہاں کہ انسانوں کے معاملات میں دخل دیتا پھرے۔ مگر اس موشگافی کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا برسوں کا تجربہ ہے اور اس کا جو اثر میرے دل

پر ہے اُس کے ظاہر کرنے کے لئے میرے پاس اور کوئی الفاظ نہیں۔ انسان کی زبان جب خدا کی کارسازیوں کو بیان کرتی ہے تو اسی ناقص طریقے سے کرتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ چیزیں فہم اور بیان سے باہر ہیں۔ لیکن جب انسان ان کے ذکر کی جرأت کرے تو اُسے انھیں بے معنی آوازوں سے جنھیں نطق کہتے ہیں کام لینا پڑتا ہے۔ اگر یہ میری ضعیف الاعتقادی ہے کہ میں پچیس سال تک سانپوں کو نہ مارنے کے باوجود اُن کے شر سے محفوظ رہنا محض اتفاق نہیں بلکہ تائید غیبی سمجھتا ہوں، تو یہی سہی۔ یہ ضعیف الاعتقادی میری جان کے ساتھ ہے۔

جن دنوں مزدوروں نے ہڑتال کی تھی اسی زمانے میں آشرم میں بُنائی کے کام کے لئے ایک سائبان کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی آشرم والوں کا شغل زیادہ تر کپڑا بننا تھا۔ کتائی کا کام ہنوز جاری نہیں ہو سکا تھا۔

بائیسواں باب

اُپاس

پہلے دو ہفتوں میں مزدوروں نے بڑی بہادری اور ضبطِ نفس سے کام لیا اور روزانہ بڑے عظیم الشان جلسے کرتے رہے۔ میں ان جلسوں میں اُنھیں اُن کا عہد یاد دلاتا تھا اور وہ بلند آواز سے کہا کرتے تھے کہ ہمارا قول جان کے ساتھ ہے۔

مگر آخر میں اُن کے قدم ڈگمگانے لگے۔ جس طرح جسمانی کمزوری کی علامت یہ ہے کہ آدمی بات بات پر جھلّانے لگتا ہے اسی طرح ہڑتال کی کمزوری اس سے ظاہر ہونے لگی کہ ہڑتالیوں کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ جو کام پر جایا کرتے تھے روز بروز زیادہ تہدید آمیز ہوتا گیا اور مجھے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ لوگ فساد نہ کر بیٹھیں۔ جلسوں کی حاضری بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ جو لوگ آتے بھی تھے ان کے چہروں پر مایوسی اور بے دلی برستی تھی۔ آخر ایک دن یہ اطلاع آئی کہ ہڑتالی کندھا ڈالے دیتے ہیں۔ میں بہت گھبرایا اور اس تردد میں پڑ گیا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ میں ایک بہت بڑی ہڑتال کا تجربہ تھا مگر یہاں بالکل نئی صورت تھی۔ مزدوروں نے میرے کہنے سے عہد کیا تھا اور اسے میری موجودگی میں بارہا دُہرایا تھا۔ مجھے اس عہد کے توڑنے کا خیال بھی گوارا نہ تھا۔ اب خدا جانے اس کی تہ میں میرا غرور تھا یا مزدوروں کی محبت یا حق کی لگن۔

ایک دن صبح کو مزدوروں کے جلسے میں مجھے یکایک اس تاریکی میں روشنی کی جھلک نظر آئی۔ خود بخود میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے "جب تک ہڑتالی ہمت سے کام لیکر اس ہڑتال کا کوئی تصفیہ نہ کرا لیں یا کارخانوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق نہ کر لیں اُس وقت

تک میں اُپاس کروں گا"

مزدور سنّاٹے میں آگئے۔ انسویا بہن کے رخساروں پر آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ہڑتالیوں کے مجمعے سے آواز آئی "آپ نہیں، ہم اُپاس کرینگے۔ غضب خدا کا ہم آپ کو اپنی خاطر اُپاس کرنے دیں! ہماری خطا معاف کر دیجئے۔ اب ہم اپنے عہد سے ہرگز نہ ہٹیں گے"

میں نے کہا "تمہیں اُپاس کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ اپنے عہد پر قائم رہو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس روپیہ ختم ہو گیا ہے اور ہمیں خیرات کے پیسے سے ہڑتال چلانا منظور نہیں۔ اس لئے تمہیں چاہئے کہ کسی قسم کی مزدوری کر کے پیٹ پالو۔ پھر ہڑتال چاہے جب تک چلے کوئی پروا نہیں۔ اب رہا میرا اُپاس، یہ تو تبھی ٹوٹے گا جب ہڑتال کا تصفیہ ہو"

اس عرصے میں دلبھ بھائی کوشش کر رہے تھے کہ میونسپلٹی میں ہڑتالیوں کے لئے کام نکالیں مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مگن لال گاندھی نے یہ بات سجھائی کہ ہمیں آشرم میں بُنائی کے مدرسے کی بنیادیں قائم کرنے کے لئے ریت کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ ریت اُٹھانے کے کام میں کھپ سکتے ہیں۔ ہڑتالیوں نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ آگے آگے انسویا بہن سر پر ایک ٹوکری رکھ کر چلیں اور ان کے پیچھے مزدوروں کا تانتا لگ گیا۔ یہ لوگ ندی کنارے سے ریت کے ٹوکرے بھر بھر کے لانے لگے۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ مزدوروں میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور انھیں مزدوری بانٹنے والے تھک تھک گئے۔

میرے اُپاس میں ایک بڑی خرابی تھی میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے اور کارخانے کے مالکوں سے بڑے گہرے تعلقات تھے اور ان کے فیصلے پر میری فاقہ کشی کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ میں جانتا تھا کہ ستیاگرہی کی حیثیت سے میرے لئے ان کی مخالفت میں اُپاس کرنا جائز نہیں بلکہ مجھے چاہیے کہ انھیں صرف مزدوروں کی ہڑتال سے متاثر ہونے دوں۔ اس لئے میں نے یہ اُپاس مالکوں کے کسی قصور کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ مزدوروں کی غلطی کی مکافات

میں، جس میں میں بھی اپنے آپ کو شریک سمجھتا تھا۔ مالکوں کو سمجھانے بجھانے کا تو مجھے حق تھا مگر ان کی مخالفت میں اُپاس کرنا گویا ان پر بے جا دباؤ ڈالنا تھا۔ غرض اس اُپاس کو مالکوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھی میں یہ جانتا تھا کہ اس کا اثر ان پر پڑے گا۔ مگر میں بالکل مجبور تھا۔ میرا صریحی فرض تھا کہ میں اُپاس کروں۔

میں نے مالکوں کو اطمینان دلانے کے لئے ان سے کہا "آپ لوگوں کو میری خاطر اپنا طرزِ عمل بدلنے کی ضرورت نہیں۔" مگر انھوں نے میرے یہ الفاظ سرد مہری سے سنے بلکہ مجھ پر چھپے طعنوں کی بوچھار کر دی۔ سچ پوچھیے تو انھیں اس کا حق بھی تھا۔

مالکوں کی ضد کے ذمہ دار اصل میں سیٹھ امبالال تھے۔ ان کے استقلال اور خلوص کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ ایسے شخص کا مقابلہ کرنے میں مجھے لطف آتا تھا۔ اسی لئے مجھے اس کا اور قلق تھا کہ میرے اُپاس سے مخالفوں کے گروہ پر، جس کے وہ سردار تھے، دباؤ پڑ رہا تھا۔ ان کی بیوی سارلا دیوی مجھ سے بہنوں کی طرح محبت کرتی تھیں۔ میرے اس فعل سے انھیں جو صدمہ تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

پہلے دن انسویا بہن اور چند اور دوستوں نے، جن میں بعض مزدور بھی شامل تھے، میرے ساتھ اُپاس کیا۔ مگر میں نے سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے انھیں اس کے جاری رکھنے سے روکا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو گئی۔ کارخانوں کے مالک پسیجے اور تصفیے کی صورتیں تلاش کرنے لگے۔ انسویا بہن کا گھر ان کے مشوروں کا مرکز بن گیا۔ آنند شنکر جی دھرو نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کی گفتگو شروع کی اور آخر میں وہی سرپنچ مقرر کیے گئے۔ میرے اُپاس کو تین ہی دن گذرے تھے کہ ہڑتال کا خاتمہ ہو گیا۔ مالکوں نے اس کی خوشی میں مزدوروں کو مٹھائی بانٹی اور اکیس دن کی ہڑتال کے بعد اس جھگڑے کا تصفیہ ہو گیا۔

تصفیے کی خوشی منانے کے لئے جو جلسہ ہوا اُس میں کارخانوں کے مالک اور کمشنر صاحب بھی شریک تھے۔ صاحب نے اس موقعے پر مزدوروں کو نصیحت کی کہ "تمہیں ہمیشہ مسٹر گاندھی کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے۔" اس کے بعد ہی مجھ سے اور ان حضرت سے مقابلہ پڑا۔ مگر اس عرصے میں صورت حال تبدیل ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ صاحب بھی بدل گئے تھے۔ اب وہ کھیڈا کے پٹی داروں کو سمجھانے لگے کہ خبردار گاندھی کی باتوں میں نہ آنا!

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کروں گا جو مضحک بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ اس کا تعلق شیرینی کی تقسیم سے ہے۔ مالکوں نے بہت سی مٹھائی منگوائی تھی۔ مگر اسے ہزاروں مزدوروں میں بانٹنا کچھ سہل نہ تھا۔ آخر یہ قرار پایا کہ مٹھائی کھلے میدان میں اُسی درخت کے نیچے بانٹی جائے جس کے تلے مزدوروں نے ہڑتال کا عہد کیا تھا کیونکہ کسی اور جگہ ان سب کو جمع کرنا مشکل تھا۔

مجھے یقین تھا کہ جن لوگوں نے اکیس دن تک انتہائی انضباط سے کام لیا ہے وہ مٹھائی کی تقسیم کے وقت ترتیب سے کھڑے رہیں گے اور آپس میں دھکم دھکا نہیں کرینگے۔ مگر جب امتحان کا وقت آیا تو وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا کہ تقسیم کرنا ناممکن ہوگیا۔ ہر دو منٹ کے بعد ان کی صفوں میں ابتری پڑ جاتی تھی۔ مزدوروں کے لیڈروں نے کوشش کی کہ ترتیب قائم رکھیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس ریل پیل دھکم دھکا میں بہت سی مٹھائی گر کر پیروں سے کچلی گئی۔ آخر تقسیم موقوف کرنا پڑی اور بقیہ مٹھائی بڑی مشکلوں سے مرزا پور میں سیٹھ امبالال کے بنگلے پر پہنچائی گئی۔ دوسرے دن اس بنگلے کے احاطے میں بڑی آسانی سے مٹھائی بٹ گئی۔

اس واقعے کا مضحک پہلو تو ظاہر ہے مگر اس کے افسوسناک پہلو کے متعلق دو ایک لفظ کہنے کی ضرورت ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ کہیں احمد آباد کے فقیروں نے یہ بات سن پائی تھی کہ "ایک ٹیک" درخت کے تلے مٹھائی تقسیم ہوگی اور ان کے گروہ کے

گروہ وہاں آپہنچے تھے۔ یہی لوگ بے صبری سے جھپٹے پڑتے تھے جس کی وجہ سے یہ ابتری پیدا ہوئی۔

ہمارا ملک افلاس کی چکی میں اس طرح پس رہا ہے کہ ہر سال فقیروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ان بے چاروں کو فاقوں کے مارے خودداری اور انسانیت کا احساس تک باقی نہیں رہتا اور ہمارے مخیر حضرات، بجائے اس کے کہ ان کے لئے کام مہیا کریں اور انھیں اپنے قوت بازو سے روٹی کمانے پر مجبور کریں انھیں بھیک دیکر ٹال دیتے ہیں۔

تیئیسواں باب

کھیدا کی ستیاگرہ

تقدیر نے مجھے دم لینے کی بھی مہلت نہیں دی۔ احمد آباد کے مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی مجھے کھیدا کی ستیاگرہ میں شریک ہونا پڑا۔

کھیدا ضلعے میں فصل کے برباد ہو جانے سے قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کے پٹی دار لگان کی وصولی ملتوی کرانے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ قبل اس کے کہ میں کاشتکاروں کو کوئی مشورہ دوں امرت لال جی ٹھکر واقعات کی تحقیق کرنے کے بعد کمشنر سے مل کر گفتگو کر چکے تھے۔ موہن لال جی پانڈیا اور شنکر لال جی پارکھ بھی اس تحریک میں شریک تھے اور انھوں نے وتبھ بھائی پٹیل اور سر گوکلداس کاہنداس پارکھ آنجہانی کے توسط سے بمبئی کی مجلسِ وضع قوانین میں یہ مسئلہ اُٹھایا تھا۔ گورنر کے پاس بھی اس سلسلے میں کئی وفد جا چکے تھے۔

میں اُن دنوں گجرات سبھا کا صدر تھا۔ سبھا کی طرف سے حکومت کو درخواستیں بھیجی جا رہی تھیں اور تار دیئے جا رہے تھے۔ کمشنر کے اہانت آمیز برتاؤ اور ان کی دھمکیوں کو سبھا صبر سے برداشت کر رہی تھی۔ اس موقعے پر حکام کا طرزِ عمل اس قدر مہمل اور اوچھا تھا کہ آج اس کا ذکر کیا جائے تو لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔

کاشتکاروں کا مطالبہ بالکل صاف تھا اور اس قدر معقول کہ اس کے قبول کرنے میں مشکل سے عذر ہو سکتا تھا۔

مالگذاری کے قواعد کی رو سے، جب فصل روپے میں چار آنے یا اس سے کم ہو، تو

کاشتکار سال رواں کا لگان ملتوی کرانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ سرکاری اطلاع یہ تھی کہ فصل چار آنے سے زیادہ ہے اور کاشتکاروں کا دعویٰ تھا کہ چار آنے سے کم ہے۔ مگر حکومت ان کی فریاد کی شنوائی نہیں کرتی تھی اور اس کے خیال میں کاشتکاروں کا یہ مطالبہ کہ اس کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ کیا جائے بغاوت سے کم نہ تھا۔ آخر جب ساری درخواستیں اور التجائیں بیکار گئیں تو میں نے اپنے دوستوں سے صلاح کرنے کے بعد پٹی داروں کو یہ مشورہ دیا کہ ستیاگرہ شروع کر دیں۔

کھیڈا کے رضاکاروں کے علاوہ اس معرکے میں میرے ساتھ ولبھ بھائی پٹیل، شنکر لال جی بینکر، انسویابہن، اندولال جی یاجنک، مہادیو دیسائی اور کچھ اور حضرات بھی شریک تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل کو اس کام کی خاطر اپنی وکالت، جو بڑے زور شور سے چل رہی تھی، ملتوی کرنا پڑی، اور حقیقت یہ ہے کہ انھیں پھر کبھی اس کے دوبارہ شروع کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ہم نے اپنا صدر مقام ندیاد کے اناتھ آشرم کو قرار دیا کیونکہ اور کوئی مکان نہیں مل سکا جس میں اتنے آدمیوں کی گنجائش ہو۔

ستیاگرہیوں نے حسب ذیل حلف نامے پر دستخط کیے:

"اس علم کی بنا پر کہ ہمارے علاقے کی فصلیں روپے میں چار آنے سے کم ہیں ہم نے حکومت سے درخواست کی کہ لگان کی وصولی آیندہ سال تک ملتوی کر دی جائے مگر حکومت نے ہماری التجا نہیں سنی۔ اس لیے ہم لوگ اس حلف کے ذریعے سے عہد کرتے ہیں کہ ہم اس سال حکومت کو پورا لگان یا اس کا جتنا حصہ باقی ہے نہ خود ادا کرینگے اور نہ اپنی رضامندی سے ادا ہونے دیں گے۔ حکومت جو قانونی کارروائی کرے ہم اس میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے اور اپنی عدم ادائگی کے نتائج کو خوشی سے برداشت کریں گے۔ چاہے ہماری زمینیں ضبط ہو جائیں مگر ہم اپنی مرضی سے لگان ادا کر کے اپنے

دعوے کو جھوٹا نہیں ہونے دیں گے اور اپنی عزت میں بٹہ نہیں لگنے دیں گے۔ البتہ اگر حکومت سارے ضلعے میں لگان کی دوسری قسط کی وصولی ملتوی کردے تو ہم میں سے جتنے ادائگی کی استطاعت رکھتے ہیں وہ پورا لگان یا اس کا جتنا حصہ باقی ہے ادا کردیں گے۔ جو لوگ ادائگی کا مقدور رکھتے ہیں ان کے ادا نہ کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ کہیں ان کی دیکھا دیکھی ان کے غریب بھائی اپنے مویشی بیچ کر یا روپیہ قرض لے کر لگان نہ دیدیں اور اپنے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ہمارے نزدیک مقدرت والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے غریب بھائیوں کی خاطر لگان ادا کرنے سے انکار کردیں۔"

یہاں اس لڑائی کا حال بیان کرنے کے لئے دو باب سے زیادہ کی گنجائش نہیں اس لئے بہت سی باتیں جنکی یاد مجھے پیاری ہے چھوڑنا پڑیں گی۔ جو لوگ اس اہم معرکے کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنا چاہیں وہ کھیدا کے ستیاگرہ کی مفصل اور مستند تاریخ پڑھیں جو شنکرلال جی پارکھ ساکن کٹھلال ضلع کھیدا نے لکھی ہے۔

چوبیسواں باب

"پیاز کا چور"

چمپارن ہندوستان کے دور افتادہ حصے میں واقع تھا اور ہم نے وہاں کے معرکے کی مفصل کیفیت اخباروں میں چھپنے نہیں دی تھی اس لئے وہاں باہر کے لوگ نہیں آتے تھے۔ مگر کھیدا کی حالت دوسری تھی۔ یہاں کے واقعات کی روز کی خبریں اخباروں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

گجراتیوں کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا اور انھیں اس سے بے حد دلچسپی تھی۔ لوگ اس کام کے لئے اپنا دھن دولت دینے کو تیار تھے۔ ہم ان سے کہتے تھے کہ ستیا گرہ صرف روپے سے نہیں چل سکتی۔ اس میں روپے کی ضرورت اور چیزوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ باوجود میرے سمجھانے کے بمبئی کے سوداگروں نے ضرورت سے زیادہ روپیہ بھیجدیا چنانچہ جب ستیا گرہ ختم ہوئی تو ہمارے پاس کچھ رقم بچ رہی۔

ستیا گرہی رضا کاروں نے اس معرکے میں سادگی کے نئے سبق سیکھے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے بالکل سادہ زندگی اختیار کرلی مگر اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے بہت سے تکلفات ترک کر دئے۔

پٹی دار کاشتکاروں کے لئے بھی یہ لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس لئے ہمیں گاؤں گاؤں پھر کر انھیں اس کے اصول سمجھانا پڑتے تھے۔

اصل کام یہ تھا کہ کسانوں کے دل سے خوف دور کر دیا جائے اور یہ بات ان

کے ذہن نشین کردی جائے کہ سرکاری ملازم ان کے آقا نہیں بلکہ خادم ہیں کیونکہ ان کو محصول ادا کرنے والوں کے روپے سے تنخواہ ملتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل ان کے دل میں اس فرض کا احساس پیدا کرنا تھا کہ نڈر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ جہاں ان کے دل سے عہدہ داروں کا خوف دور ہوا وہ ان کی بدتمیزیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے پر آمادہ ہوجاتے تھے اور ان کو روکنا ہمارے لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ مگر ہم جانتے تھے کہ اگر انھوں نے ذرا سی بدتمیزی کی تو ستیاگرہ کی ساری خوبی جاتی رہے گی جس طرح سنکھیا کے ایک قطرے سے سارا دودھ زہریلا ہوجاتا ہے۔

ہم نے انھیں یہ اصول سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر آگے چل کر معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ سبق میری توقع سے کم سیکھا۔ مجھے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ حسنِ اخلاق ستیاگرہ کی جان ہے۔ یہاں حسنِ اخلاق سے مراد محض ظاہری شیریں کلامی نہیں بلکہ باطنی شیریں مزاجی اور اپنے مخالفوں کی دلی خیر خواہی ہے۔ سچے ستیاگرہی کے ہر فعل میں ان صفتوں کا رنگ جھلکتا ہے۔

ابتدا میں، باوجود اس کے کہ لوگوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا، حکومت کی طرف سے کوئی سختی نہیں ہوئی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان لوگوں کے قدم کو کسی طرح لغزش نہیں ہوتی، تو تشدد شروع کردیا۔ قرق امینوں نے لوگوں کے مویشی بیچ ڈالے اور جو چیز ہاتھ آئی قرق کرلی۔ جرمانے کے نوٹس جاری کئے گئے اور کہیں کہیں تیار فصلوں کی قرقی بھی ہوئی۔ اس سے کسان گھبرا گئے، بعض نے لگان ادا کردیا، اور بعض نے یہ کوشش کی کہ ان کی منقولہ جائداد بیچ کر مطالبہ وصول کرلیا جائے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو آخر تک لڑنے کے لئے تیار رہے۔

اسی اثنا میں شنکر لال جی پارکھ کے ایک اسامی نے لگان ادا کردیا۔ اس سے بڑی بے چینی پھیل گئی۔ شنکر لال جی نے فوراً اس کی تلافی میں وہ زمین، جس کا لگان ادا کیا گیا

تھا، مصارفِ خیر کے لیئے وقف کر دی۔ اس طرح انہوں نے اپنی عزت رکھ لی اور دوسروں کے لیئے عمدہ مثال قائم کر دی۔

کھیڈا لوں کے دل مضبوط کرنے کے لیئے میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ موہن لال جی پانڈیا کی سرکردگی میں ایک پیاز کے کھیت سے، جس کی فصل بے انصافی سے قرق کر لی گئی تھی، پیاز کاٹ لائیں۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ میرے نزدیک یہ فعل سول نافرمانی میں داخل نہیں اور فرض کیجیئے کہ ہو بھی تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ پیاز کی فصلوں کی قرقی چاہے قانوناً درست ہو مگر اخلاقاً ناجائز ہے اور لوٹ سے کم نہیں اس لیئے لوگوں کا فرض ہے کہ قرقی کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور فصل کاٹ لائیں۔ یہ لوگوں کو اس کی تعلیم دینے کا بڑا اچھا موقع تھا کہ ستیاگرہ میں اپنی خواہش سے قید یا جرمانے کی سزا کیونکر حاصل کی جاتی ہے۔ موہن لال جی پانڈیا کی تو یہ دلی آرزو تھی۔ انھیں یہ پسند نہ تھا کہ یہ معرکہ یونہی ختم ہو جائے اور کوئی شخص ستیاگرہ کی راہ میں قید کی مصیبت نہ جھیل سکے۔ اس لیئے وہ بڑی خوشی سے پیاز کی فصل کاٹنے پر راضی ہو گئے اور سات آٹھ منچلے بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔

حکومت انھیں گرفتار کرنے پر مجبور تھی۔ ان کی گرفتاری سے لوگوں کا جوش اور بڑھ گیا۔ جب جیل جانے کی جھجک جاتی رہے تو حکومت کی سختی لوگوں کی ہمتیں بڑھا دیتی ہے۔ مقدمے کی پیشی کے دن ہزاروں آدمیوں نے کچہری کو گھیر لیا۔ پانڈیا اور ان کے ساتھی مجرم قرار دیئے گئے اور انھیں تھوڑے دن کی قید ہو گئی۔ میرے خیال میں یہ سزا بیجا تھی کیونکہ تعزیراتِ ہند میں چوری کی جو تعریف کی گئی ہے وہ ان کے اس فعل پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ مگر ہم لوگ عدالتوں سے دور رہنا چاہتے تھے اس لیئے ہم نے اپیل دائر نہیں کیا۔

"مجرموں" کے ساتھ ایک بہت بڑا جلوس جیل خانے کے دروازے تک گیا اور اس دن سے موہن لال جی پانڈیا کو لوگ ڈنگلی چور (پیاز کا چور) کے معزز لقب سے پکارنے لگے۔

اس ستیاگرہ کا انجام میں دوسرے باب میں بیان کروں گا۔

پچیسواں باب

کھیدا کی ستیا گرہ کا انجام

یہ ستیا گرہ خلاف توقع بہت جلد ختم ہوگئی۔ لوگوں میں مقابلے کا دم نہیں رہا تھا اور میں اس خیال سے کہ کہیں یہ غریب بالکل تباہ نہ کر دے جائیں لڑائی کو جاری رکھتے ہچکچاتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اسے ختم کرنے کی کوئی ایسی معقول صورت نکل آئے جو ایک ستیا گرہی کے لئے قابل قبول ہو۔ بالکل خلاف توقع ایسی صورت پیدا ہوگئی۔ ندیاد تعلقے[1] کے معاملت دار نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ اگر خوشحال پٹی دار لگان ادا کر دیں تو غریب لوگوں سے وصولی ملتوی کر دی جائیگی۔ میں نے اس مضمون کی تحریر مانگی جو اس نے بھیج دی۔ لیکن چونکہ معاملت دار صرف اپنے تعلقے کا ذمہ دار تھا اس لئے میں نے کلکٹر سے پوچھا کہ کیا آپ سارے ضلعے کے متعلق یہی وعدہ کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اس التوا کے احکام پہلے ہی جاری ہو چکے ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو کسانوں کا عہد پورا ہو گیا۔ یہ احکام بالکل ان کی خواہش کے مطابق تھے۔ اس لئے ہم ان کی تعمیل پر راضی ہو گئے۔

مگر اس تصفیے کے عملدر آمد میں وہ شفقت اور ملاطفت نہ تھی جو ستیا گرہ کے خاتمے پر ہونا چاہئے اس لئے مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ کلکٹر نے ایسا انداز اختیار کیا کہ گویا کوئی تصفیہ ہی نہیں ہوا۔ غریبوں سے التوا کا وعدہ کیا گیا مگر اس پر عمل بہت کم ہوا۔ یہ طے کرنا کہ کون کون لوگ غریب ہیں اصل میں خود کسانوں کا حق تھا مگر وہ اس سے کام نہ لے سکے افسوس

---

[1] گجرات میں تحصیل کو "تعلقہ" اور تحصیلدار کو "معاملت دار" کہتے ہیں۔

یہ ہے کہ ان میں اپنے اس حق سے فائدہ اُٹھانے کی طاقت ہی نہ تھی۔ لوگوں نے ستیاگرہ کی فتح کی خوشیاں منائیں مگر میرے دل میں ذرا بھی جوش نہ تھا کیونکہ یہ فتح محض برائے نام تھی۔

ستیاگرہ کی تحریک کامیاب تبھی کہلا سکتی ہے جب اس کے خاتمے کے وقت ستیاگرہیوں کی ہمت اور قوت پہلے سے بڑھ گئی ہو۔

مگر اس معرکے کے بالواسطہ اثرات بہت گہرے تھے۔ اس وقت جو پودا لگایا گیا تھا وہ آج پھل دے رہا ہے۔ کھیڈا کی ستیاگرہ سے گجرات کے کسانوں کی بیداری اور ان کی سیاسی تعلیم شروع ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر اینی بسینٹ کی ہوم رول کی تحریک کا تھوڑا بہت اثر کسانوں پر ہوا تھا مگر کھیڈا کی مہم کی بدولت تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں کی واقعی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ انھیں اپنا حقیقی دائرۂ عمل معلوم ہو گیا اور ان میں ایثار اور قربانی کی صلاحیت بڑھ گئی۔ اور پھر یہ کیا کم ہے کہ ولبھ بھائی کو اس معرکے میں معلوم ہو گیا کہ اُنھیں خدا نے کس کام کے لئے بنایا ہے۔ اس نعمت کی قدر ہمیں پارسال سیلاب زدوں کی امداد کی مہم میں اور اس سال بردولی کی ستیاگرہ میں ہوئی۔ گجرات کی قومی زندگی میں نیا زور اور نئی اُمنگ پیدا ہو گئی۔ پٹی دار کسانوں کو اپنی قوت کا پورا اندازہ ہو گیا۔ لوگوں کے دل پر یہ بات نقش ہو گئی کہ اُن کی نجات خود اُن کے ہاتھ میں ہے اور اُنکے ایثار اور قربانی پر منحصر ہے۔ کھیڈا کے معرکے سے ستیاگرہ نے گجرات میں جڑ پکڑ لی۔

اسلئے اگرچہ مجھے ستیاگرہ کے خاتمے پر کچھ زیادہ خوشی نہ تھی لیکن کھیڈا کے کسان کامیابی کا جشن منا رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ہماری کوشش کے لحاظ سے بہت ہے اور اب ہمیں ایسی تدبیر ہاتھ آ گئی ہے جسکے ذریعے سے ہم حکومت کو دادرسی پر مجبور کر سکتے ہیں۔

پھر بھی کھیڈا کے کسانوں نے ستیاگرہ کے اصلی بھید کو نہیں سمجھا تھا۔ آئندہ بابوں میں معلوم ہو گا کہ اس کی انھیں کیا سزا ملی۔

چھبیسواں باب

اتحاد کی گرما گرمی

جس زمانے میں کھیدا کا معرکہ شروع ہوا ہے یورپ کی مہلک جنگ جاری تھی۔ اب اس میں ایک بڑا نازک موقع آن پڑا اور وائسرائے نے ہر خیال کے لیڈروں کو دہلی میں "وار کانفرنس" میں شریک ہونے کے لئے بلایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے اور لارڈ چیمسفورڈ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کانفرنس کی شرکت کے لئے اصرار کیا۔

میں نے یہ دعوت قبول کرلی اور دہلی پہنچ گیا۔ مگر کئی وجوہ سے مجھے کانفرنس کی شرکت میں تامل تھا جن میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں علی برادران شامل نہیں کئے گئے تھے۔ یہ دونوں ان دنوں جیل میں تھے۔ مجھ سے اُن سے صرف دو ایک بار کی ملاقات تھی مگر میں نے اُن کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر شخص ان کی خدمات اور ان کی ہمت کی تعریف کرتا تھا حکیم صاحب سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا مگر پرنسپل رُدرا اور دین بندھو اینڈریوز نے مجھ سے ان کی بہت تعریف کی تھی۔ شعیب قریشی صاحب اور خواجہ صاحب سے میں کلکتے کی مسلم لیگ میں مل چکا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمن سے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک نفس اور وطن پرست لوگ ہیں اُن سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں۔ اس لئے میں ہر جگہ ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار رہتا تھا تاکہ ان سے اچھی طرح ربط ضبط ہو جائے۔

مجھے جنوبی افریقہ میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہیں۔ میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد

کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ اپنی خود داری کھو کر یا خوشامد کر کے لوگوں کو خوش کرنا مجھے نہیں آتا تھا مگر جنوبی افریقہ کے تجربوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں میری اہنسا کا بڑا سخت امتحان ہو گا اور مجھے اہنسا کے نئے تجربوں کے لئے بڑا وسیع میدان ملے گا۔

جنوبی افریقہ سے واپسی کے وقت یہ عقیدہ میرے دل میں راسخ ہو چکا تھا اس لئے میں نے علی برادران کی ملاقات کو ایک نعمت سمجھا۔ مگر ابھی ان سے اچھی طرح راہ و رسم نہیں ہونے پائی تھی کہ وہ نظر بند کر دیے گئے۔ مولانا محمد علی مجھے بیتول اور چھنڈواڑے کے جیل سے بہت مفصل خط لکھا کرتے تھے۔ میں نے علی برادران سے ملنے کی اجازت مانگی مگر میری درخواست منظور نہیں ہوئی۔

ان دونوں بھائیوں کی گرفتاری کے بعد کلکتے میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں میرے مسلمان دوستوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔ وہاں مجھ سے تقریر کی فرمائش ہوئی۔ میں نے اس موضوع پر تقریر کی کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جیسے بنے علی برادران کو رہا کرا لیں۔ اس کے کچھ دن بعد یہی دوست مجھے علی گڈھ کالج لے گئے۔ وہاں میں نے نوجوانوں کو دعوت دی کہ فقیری اختیار کر کے مادر وطن کی خدمت کریں۔

اس کے بعد میں نے حکومت سے علی برادران کی رہائی کے متعلق خط و کتابت شروع کی۔ اسی سلسلے میں میں نے اس سے واقفیت حاصل کی کہ خلافت کے مسئلے میں ان دونوں بھائیوں کے خیالات کیا ہیں اور انھوں نے اس کے متعلق کیا کچھ کیا ہے۔ مجھ سے اور مسلمان دوستوں سے ان امور پر بحث ہوا کرتی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچا دوست بننا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلۂ خلافت کے تصفیے کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں۔ مجھے اس سے بحث نہ تھی کہ اس مسئلے کی مذہبی صورت کیا ہے۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے اور اس میں کوئی بات اخلاق کے منافی نہیں۔

مذہب کے معاملے میں لوگوں کے عقائد مختلف ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنے عقیدے کو صحیح سمجھتا ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو اتنے مذہب کیوں ہوتے۔ آگے چل کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ انگلستان کے وزیر اعظم نے تسلیم کرلیا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ خلافت کے بارے میں صحیح ہے۔ اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کو عہد کی پابندی پر مجبور کرنے میں مسلمانوں کا ساتھ دوں۔ یہ عہد اس قدر صاف لفظوں میں تھا کہ مجھے اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے کیا۔

دوستوں نے اور نکتہ چینوں نے خلافت کے بارے میں میرے رویئے پر بہت کچھ اعتراضات کیئے ہیں مگر اس کے باوجود مجھے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا مطلق افسوس نہیں۔ اگر ایسا موقع پھر آئے تو میں پھر وہی طرز عمل اختیار کروں گا۔

غرض جب میں دہلی گیا تو میں نے پوری طرح ارادہ کرلیا تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات وائسرائے کے سامنے پیش کروں گا۔ اس وقت تک خلافت کے مسئلے کی وہ صورت نہیں تھی جو آگے چل کر ہوگئی۔

دہلی پہنچ کر ایک بات اور پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے مجھے "وار کانفرنس" کی شرکت میں تامل ہوا۔ دین بندھو اینڈریوز نے مجھے شبہے میں ڈال دیا کہ کانفرنس میں میری شرکت اخلاقاً جائز ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا انگلستان کے اخباروں میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ برطانیہ نے اطالیہ سے خفیہ معاہدہ کرلیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ کی شرکت کانفرنس میں کہاں تک مناسب ہے؟ مجھے اس خفیہ معاہدے کا علم نہیں تھا مگر میرے لئے اینڈریوز کا قول کافی تھا۔ میں نے لارڈ چیمسفورڈ کو ایک خط لکھا جس میں اپنے شبہات بیان کردئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ مجھ سے مل کر گفتگو کرلیجئے۔ ان سے اور ان کے پرائیویٹ سیکریٹری مسٹر میفے سے طول طویل بحث کے بعد میں کانفرنس میں شریک ہونے پر راضی ہوگیا۔ وائسرائے کی دلیلوں کا خلاصہ یہ تھا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے وائسرائے کو برطانوی مجلس وزرا کے

سب فیصلوں کی خبر ہوتی ہے؟ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا اور میں کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ برطانوی حکومت معصوم ہے۔ لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ برطانوی سلطنت مجموعی حیثیت سے دنیا کے لیے مفید ہے اور ہندوستان کو اس کے ساتھ سے مجموعی حیثیت سے فائدہ پہنچا ہے تو کیا آپ کے خیال میں ہر ہندوستانی کا یہ فرض نہیں ہے کہ ایسی ضرورت کے وقت اس کی مدد کرے؟ میں نے بھی انگلستان کے اخباروں میں خفیہ معاہدے کی بحث دیکھی ہے۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ ان اخباروں کی قیاس آرائیوں کے سوا مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی ہے اور انھیں میں مطلق قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا کیونکہ یہ اکثر بے سروپا خبریں گھڑ دیا کرتے ہیں۔ کیا آپ ان اخباری چمیگوئیوں کی بنا پر ایسے نازک وقت میں سلطنت کی مدد سے منہ موڑینگے؟ لڑائی ختم ہو جانے دیجیے، پھر آپ دل کھول کر اخلاقی بحثیں چھیڑئے گا اور جو اعتراض کرنا ہو کر لیجیے گا۔ آج اس کا موقع نہیں۔"

یہ استدلال نیا نہیں تھا۔ مگر یہ ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں پیش کیا گیا کہ مجھے نیا معلوم ہوا اور میں نے کانفرنس کی شرکت قبول کر لی۔ مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق یہ طے ہوا کہ میں وائسرائے کو ایک خط لکھوں۔

ستائیسواں باب

رنگروٹوں کی بھرتی

غرض میں کانفرنس میں شریک ہوا۔ والسرائے کا بہت اصرار تھا کہ تم رنگروٹوں کی بھرتی کے رزولیوشن کی تائید کرو۔ میں نے ہندی میں تقریر کرنے کی اجازت چاہی۔ والسرائے نے اسے منظور کر لیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ جو کچھ ہندی میں کہو اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کردو۔ مجھے کوئی طویل تقریر نہیں کرنا تھی۔ میں نے صرف ایک جملہ کہا جس کا مضمون یہ تھا "میں اپنی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اس رزولیوشن کی تائید کرتا ہوں"

بہت سے لوگوں نے مجھے ہندوستانی میں تقریر کرنے پر مبارکباد دی۔ انہوں نے کہا یہ پہلا موقع ہے کہ ایسے جلسے میں ہندوستانی زبان سننے میں آئی۔ جب میں نے یہ مبارکباد سنی اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ والسرائے کے مشورے کے جلسوں میں مجھ سے پہلے کسی نے ہندوستانی میں تقریر نہیں کی تو مجھے اپنی قوم کی حالت پر بڑا صدمہ ہوا۔ یہ معلوم ہوا جیسے میرا دل مرجھا کر رہ گیا ہو۔ غضب خدا کا، ہندوستان کے اندر جلسہ ہو، ہندوستان کے معاملات پیش ہوں اور ہندوستانی زبان میں تقریر کرنا ممنوع ہو اور میری طرح کوئی اپنی زبان میں تقریر کر گذرے تو مبارکباد کے قابل سمجھا جائے! اسی قسم کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری پستی کس حد تک پہنچ چکی ہے۔

یہ ایک جملہ جو میں نے کانفرنس میں کہا میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کانفرنس اور اس رزولیوشن کا خیال میرے دل پر چھا گیا۔ دہلی کے قیام کے دوران میں مجھے ایک فرض انجام دینا تھا یعنی والسرائے کو خط لکھنا تھا۔ یہ کوئی سہل کام نہ تھا۔ میں حکومت اور

ملک دونوں کی اغراض کو مدنظر رکھ کر اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس خط میں یہ ظاہر کر دوں کہ میں کانفرنس میں کیوں شریک ہوا اور صاف صاف بتا دوں کہ ملک کو حکومت سے کیا توقعات ہیں۔

میں نے اس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لوکمانیہ تلک اور علی برادران جیسے لیڈر کانفرنس میں شریک نہیں کئے گئے اور بہت تفصیل سے لکھا کہ جنگ نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اُس کے سبب سے ہندوستانی کم سے کم اس قدر سیاسی حقوق چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے مخصوص مطالبات یہ ہیں۔

وائسرائے کانفرنس کے بعد ہی شملے چلے گئے تھے اس لئے میں نے یہ خط وہیں بھیجا۔ میں اس کے مضمون کو بہت اہم سمجھتا تھا اور جواب جلدی چاہتا تھا اس لئے اسے ڈاک سے نہیں بھیج سکتا تھا۔ مگر باوجود عجلت کے کسی ایسے ویسے شخص کے ہاتھ بھیجنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی پاک نفس آدمی خود جا کر وائسرائگل لاج میں خط پہونچا دے۔ پرنسپل رُدرا اور اینڈریوز نے کیمبرج مشن کے نیکدل پادری مسٹر آئرلینڈ کو تجویز کیا۔ انہوں نے کہا اگر آپ مجھے یہ خط دکھا دیں اور میں اس کے مضمون کو اچھا سمجھوں تو میں اس کے لے جانے کے لئے حاضر ہوں۔ مجھے خط دکھانے میں کوئی عذر نہیں تھا کیونکہ اس میں کوئی بچ کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے وہ خط پڑھا اس کا مضمون پسند کیا اور اُسے پہنچانے پر تیار ہو گئے۔ میں نے انھیں دوسرے درجے کا کرایہ دینا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ میں ڈیوڑھے درجے میں سفر کرنے کا عادی ہوں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ رات کا سفر تھا وہ ڈیوڑھے ہی درجے میں گئے۔ ان کی سادگی اور صاف گوئی کی وجہ سے مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ ایسے پاک نفس آدمی کے ہاتھ خط بھیجنے کی برکت سے نتیجہ حسب دلخواہ نکلا۔ اس سے مجھے بڑا اطمینان ہوا اور میرا راستہ صاف ہو گیا۔

میرا دوسرا فرض یہ تھا کہ رنگروٹ بھرتی کروں۔ اس کی یہی صورت تھی کہ میں کھیدا سے ابتدا کروں اور سب سے پہلے اپنے رفیقوں کو بھرتی ہونے کی دعوت دوں چنانچہ

ندیاد پہنچتے ہی میں نے ولبھ بھائی اور دوسرے دوستوں کو مشورے کے لئے جمع کیا۔ ان میں سے بعض نے اس تجویز کو ناپسند کیا جنہوں نے پسند کیا انہیں بھی اس کی کامیابی میں بہت شبہ تھا۔ جن لوگوں کو میں دعوت دینا چاہتا تھا انہیں سرکار سے بالکل محبت نہ تھی۔ سرکاری ملازموں کا جو تلخ تجربہ انہیں ہوا تھا اُس کی یاد ابھی تازہ تھی۔

پھر بھی دوستوں کی رائے یہ ہوئی کہ کام شروع کر دینا چاہئے۔ پہلا قدم اُٹھاتے ہی میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ میری اُمیدوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ستیاگرہ کے زمانے میں تو لوگ گاڑی، بیل بے کرائے کے دے دیا کرتے تھے اور جہاں ایک رضاکار کی ضرورت ہوتی تھی وہاں دو موجود ہو جاتے تھے مگر اب رضاکار تو ایک طرف گاڑی تک کرائے پر نہیں ملتی تھی۔ مگر ہم لوگ ہمت ہارنے والے اسامی نہ تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پیدل سفر کریں تاکہ گاڑی کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ ہمیں روز بیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب لوگ گاڑی تک نہیں دیتے تھے تو ان سے یہ توقع کرنا فضول تھا کہ ہمیں کھانا کھلائیں گے۔ اور ہمارے لئے مناسب بھی نہ تھا کہ ان پر اس کا بار ڈالیں۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ ہر رضاکار اپنے اپنے تھیلے میں اپنا کھانا لے چلے۔ بستر کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ گرمی کے دن تھے۔

ہم ہر جگہ جلسے کرتے جاتے تھے۔ جلسوں میں مجمع تو خاصا ہو جاتا تھا مگر رنگروٹ ایک دو سے زیادہ نہیں بنتے تھے۔ لوگ ہم سے اس قسم کے سوال کیا کرتے تھے: "آپ اہنسا کے قائل ہو کر ہمیں ہتھیار اُٹھانے کی صلاح کیسے دیتے ہیں؟" "گورمنٹ نے ہندوستان کے لئے کیا کیا ہے جو ہم اس کا ساتھ دیں؟"

پھر بھی ہماری مسلسل کوششوں کا اثر ہونے لگا۔ لوگوں نے خاصی تعداد میں نام لکھوائے اور ہمیں یہ اُمید ہوگئی کہ پہلی کھیپ بھیجنے کے بعد بھرتی کا سلسلہ بندھ جائے گا۔ میں نے کمشنر سے اس بارے میں مشورہ شروع کر دیا کہ رنگروٹ کہاں رکھے جائیں۔

ہر قسمت کے کمشنر دہلی کی وار کانفرنس کے نمونے پر مشورے کے جلسے کر رہے تھے۔

چنانچہ گجرات میں بھی جلسہ ہوا اور مجھے اور میرے رفیقوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ ہم لوگ شریک تو ہوئے مگر مجھے یہاں دلّی کے جلسے سے بھی زیادہ یہ بات محسوس ہوئی کہ ایسی جگہہ میرے جیسے شخص کے لیے گنجائش نہیں۔ اس غلامی اور چاپلوسی کی فضا میں میرا دم اُلجھتا تھا۔ میں نے یہاں کسی قدر طویل تقریر کی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا اس میں حکام کو خوش کرنیوالی کوئی بات نہ تھی بلکہ دو چار جملے ایسے تھے جس سے انھیں تکلیف ہوئی ہوگی۔

میں لوگوں کو رنگروٹ بننے کی ترغیب دلانے کے لیے چھوٹے چھوٹے رسالے چھپواکر شائع کیا کرتا تھا۔ ان میں میں نے منجملہ اور دلیلوں کے اس دلیل سے بھی کام لیا تھا "برطانوی حکومت نے ہندوستان میں جو مظالم کئے ہیں اُن میں سے وہ قانون جس کی رو سے قوم کی قوم ہتھیاروں سے محروم کردی گئی تاریخ کی نظر میں سب سے بڑا ظلم سمجھا جائے گا، اگر ہم قانونِ اسلحہ کو منسوخ کرانا چاہتے ہیں اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے اچھا موقع اور کیا ہوگا۔ اگر متوسط طبقہ اس آڑے وقت میں حکومت کا ساتھ دے تو حکومت کے دل سے بے اعتمادی دور ہو جائیگی اور ہتھیاروں کی بندش اُٹھا دی جائیگی۔"

یہ بات کمشنر کو ناگوار ہوئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ باوجود اس کے کہ ہمارے آپ کے خیالات میں اختلاف ہے آپ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ میں نے جہاں تک ہو سکا نرم اور مہذب الفاظ میں اپنے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔

میں نے وائسرائے کے نام جو خط لکھا تھا اُس کا مضمون یہ ہے :-

"آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے ۲۶ اپریل کے خط میں وہ وجوہ عرض کی تھیں جن کی بنا پر مجھے کانفرنس کی شرکت میں تامل تھا۔ مگر آپ سے ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل کرنے کے بعد میں اس میں شریک ہونے پر راضی ہوگیا جس کا بڑا سبب وہ خلوص تھا جو مجھے آپ کی ذات سے ہے۔ مجھے کانفرنس کی شرکت میں سب سے قوی اعتراض یہ تھا کہ لوکمانیہ تلک

مسز بسینٹ اور علی برادران جیسے با اثر لیڈر اس میں نہیں بلائے گئے۔ میرا اب تک یہی خیال ہے کہ یہ بہت بڑی غلطی تھی اور میری ناقص رائے میں اس غلطی کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ حکومت ان لیڈروں کو صوبہ وار کانفرنسوں میں جو اب ہونے والی ہیں مدعو کرے، اور ان کے مشورے سے فائدہ اُٹھائے۔ میری مؤدبانہ گذارش ہے کہ کسی حکومت کو یہ جرأت نہیں کرنا چاہئے کہ ایسے لیڈروں کو جو اتنی بڑی جماعتوں کے نمائندے ہیں ناقابل توجہ سمجھے خواہ اُن کے خیالات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ اسی کے ساتھ میں بڑی خوشی سے اعتراف کرتا ہوں کہ کانفرنس کی کمیٹیوں میں مختلف خیال کے لوگوں کو آزادی سے اظہار رائے کی اجازت دی گئی۔ خود میں نے اپنی رائے کا اظہار، اس کمیٹی میں جس کی ممبری کا مجھے فخر تھا اور کانفرنس میں خاص کر کے نہیں کیا۔ میں سمجھتا تھا میرے لئے کانفرنس کی خدمت کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ جو رزولیوشن پیش ہوں ان کی تائید کردوں چنانچہ میں نے بغیر کسی شرط کے تائید کی۔ میں اپنے قول کو عمل کی صورت دینے کے لئے تیار ہوں اور اس خط کے ساتھ اپنی درخواست بھیج رہا ہوں۔ اُس کے منظور ہوتے ہی میں کام شروع کردوں گا۔"

"میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں اس نازک وقت میں اپنے وعدے کے مطابق سلطنت برطانیہ کی دل کھول کر مدد کرنا چاہئے جس کے زیر سایہ عنقریب نوآبادی کا درجہ حاصل کرنے کی ہمیں آرزو ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم سلطنت کا ساتھ اسی توقع کی بنا پر دے رہے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہم اپنا مقصد زیادہ جلد حاصل کرلیں گے۔ جو اپنا فرض ادا کرتا ہے اس کا حق خود بخود قائم ہو جاتا ہے اس لئے اگر ہندوستان والے یہ سمجھتے ہیں کہ جن اصلاحات کی طرف آپ کی تقریر میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کانگریس لیگ اسکیم کے عام اصولوں پر مبنی ہوں گی تو کچھ بیجا نہیں سمجھتے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی خیال نے کانفرنس کے بہت سے ممبروں نے حکومت کی پوری پوری امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"اگر میرے ہموطن میرے کہنے پر چلتے تو میں کانگریس کے تمام رزولیوشن واپس کرالیتا اور جنگ کے دوران "ہوم رول" یا "ذمہ دارانہ حکومت" کا نام بھی نہ آنے دیتا۔ میں مادر ہند کے سارے صحیح الجسم نوجوانوں کو ایسے نازک وقت میں سلطنت کی خدمت کے لئے حاضر کر دیتا اور مجھے یقین ہے کہ اس قربانی کی بدولت ہندوستان سلطنت کا محبوب ترین رفیق بن جاتا اور نسل و قوم کے امتیازات خود بخود مٹ جاتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اس گرمجوشی سے حکومت کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں اور ملک پر اب اسی طبقے کا اثر ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ سے آنے کے بعد کسانوں سے بہت سابقہ رہا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہوم رول کی تحریک سے متاثر ہو چکے ہیں۔ میں کانگریس کے پچھلے اجلاس میں موجود تھا اور میں نے اس رزولیوشن کی تائید کی تھی کہ ہندوستان کو اس میعاد کے اندر، جو پارلیمنٹ تجویز کرے" کامل ذمہ دارانہ حکومت" دے دی جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اقدام خطرے سے خالی نہیں مگر جب تک ہندوستان کو جلد سے جلد، ہوم رول حاصل ہونے کی اُمید نہ دلائی جائے، ان کا مطمئن ہونا ممکن نہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ ہم سے بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہیں اور یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سلطنت کی جاں نثاری ہمارا فرض ہے جس کے سایۂ عاطفت میں ہیں نوآبادی کا درجہ حاصل کرنے کی آرزو اور اُمید ہے۔ ہمارا مقصد جلد تر حاصل ہونے کی یہی صورت ہے کہ ہم دل و جان سے سلطنت کی خدمت میں مصروف ہو جائیں اور اسے دشمنوں کے نرغے سے بچائیں۔ ہماری قوم اس بدیہی حقیقت کو نہ سمجھے تو خودکشی کی مرتکب ہوگی۔ اگر ہم اس نازک وقت میں سلطنت کے آڑے آئیں تو ہوم رول ہمیں خود بخود مل جائے گا۔"

"غرض اس کا تو مجھے یقین ہے کہ ہمیں جتنے آدمی مل سکیں سلطنت کی حفاظت کے لئے حاضر کر دینا چاہیے مگر مالی امداد کے بارے میں مجھے تامل ہے۔ کسانوں سے ملنے

چلنے اور ان کی حالت دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان پہلے ہی اپنی مقدرت سے زیادہ رقم سلطنت کے خزانے کی نذر کر چکا ہے۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں بلکہ میرے اکثر ہموطنوں کا یہی خیال ہے۔"

"میں اور میرے بہت سے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ اس کانفرنس نے ہمیں سلطنت کے مشترک مفاد کے لئے اپنی جانیں نثار کرنے کی دعوت دے کر، نو آبادیوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا ہے۔ مگر ہماری حالت ان سے مختلف ہے۔ ہم ابھی تک شرکائے سلطنت کے زمرے سے باہر ہیں۔ ہماری جاں نثاری آئندہ ترقی کی اُمید پر مبنی ہے۔ میں نے صاف صاف عرض کر دیا ہے کہ یہ اُمید کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو آپ سے اور اپنے ملک سے بے وفائی ہوتی۔ میں اس معاملے میں سودا نہیں کرنا چاہتا مگر یہ سمجھیے کہ اُمیدیں پوری نہ ہوں تو اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔"

"ایک اور بات عرض کر دینا ضروری ہے۔ آپ نے ہم سے اپیل کیا ہے کہ اندرونی جھگڑے مٹا دو۔ اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم حکام کے ظلم و جور چپ چاپ سہیں تو اس کی تعمیل میرے امکان سے باہر ہے۔ جب تک میرے دم میں دم ہے میں "باضابطہ جبر و تشدد" کا مقابلہ کروں گا۔ آپ کو اپیل کرنا ہے تو حکام سے کیجیے کہ کسی متنفس سے بدسلوکی نہ کریں، ہر معاملے میں رائے عامہ سے مشورہ کریں اور اس کا احترام ہر وقت مدنظر رکھیں۔

چمپارن میں میں نے اس ظلم کا انسداد کر کے، جو پشتہا پشت سے ہوتا چلا آیا تھا، یہ دکھا دیا کہ ایک نہ ایک دن برطانوی انصاف کا بول بالا ہو کر رہتا ہے۔ کھیڑا میں جو لوگ حکومت کو کوستے تھے انھیں آج یہ محسوس ہو گیا ہے کہ جب حق ان کی طرف ہو اور وہ اُس کی خاطر قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو حکومت اُن کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اس طرح میں نے جو کام چمپارن اور کھیڑا میں کیا ہے اُسے میری

نمایاں اور مخصوص خدمات جنگ میں شمار کرنا چاہیے۔ یہی جد وجہد میری جان ہے۔ مجھ سے یہ فرمائش کرنا کہ اسے روک دو گویا مجھے خودکشی کی دعوت دینا ہے۔ اگر میں ہر شخص کو بہیمی قوت کی جگہ، روحانی قوت یعنی محبت کی قوت سے کام لینے پر آمادہ کر سکوں تو آپ کو دکھا دوں کہ ساری دنیا مل کر بھی ہندوستان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ اس لئے میں دن رات اس ریاضت میں مصروف رہتا ہوں کہ اپنی ذات کو قربانی کے ابدی قانون کا نمونہ بنا کر اہل نظر کے سامنے پیش کر دوں۔ جب کبھی میں کوئی اور مشغلہ اختیار کرتا ہوں تو اسی نیت سے کرتا ہوں کہ اس قانون کی فضیلت ظاہر ہو جائے۔"

"میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزراء سے کہیے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل ان کے درد سے بے چین ہے اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے اس درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہے۔ سلطنت کی حفاظت کی یہی صورت ہے کہ اسلامی ممالک کے حقوق کی دل و جان سے حمایت کی جائے، مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام مدنظر رکھا جائے، اور ہندوستان کے مطالبۂ ہوم رول کا جلد سے جلد منصفانہ تصفیہ کر دیا جائے۔ میری یہ گذارش اس لئے ہے کہ مجھے انگریز قوم سے محبت ہے اور میں ہر ہندوستانی کو انگریزوں کا وفادار بنانا چاہتا ہوں۔"

اٹھائیسواں باب

قریب مرگ

زنگر دٹوں کی بھرتی میں میں نے اتنی محنت کی کہ میری صحت نے جواب دے دیا۔ ان دنوں میری غذا مونگ پھلی کا تیل اور لیمو تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ذرا سی غفلت میں تیل کا استعمال اعتدال سے بڑھ جاتا ہے اور صحت کو ضرر پہنچ جاتا ہے پھر بھی مجھ سے یہ بے اعتدالی ہو ہی گئی۔ اس کے اثر سے مجھے خفیف سی پیچش ہو گئی۔ میں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ شام کو، جیسا میں اکثر کیا کرتا تھا، آشرم چلا گیا۔ اس زمانے میں میں حتی الامکان دوا کا استعمال نہیں کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک وقت کھانا نہ کھاؤں تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی اور واقعی دوسرے دن صبح کا ناشتہ ناغہ کر دینے سے مجھے بہت سکون ہو گیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ پوری صحت تبھی ہوگی جب میں کئی وقت کا فاقہ کروں یا اگر بہت خواہش ہو تو پھلوں کے افشردے پر قناعت کروں۔

ایک روز کوئی تہوار تھا۔ میں نے کستورا بائی سے کہہ دیا تھا کہ میں دن کا کھانا نہیں کھاؤں گا مگر انہوں نے ترغیب دلائی، اور میں لالچ میں آ گیا۔ چونکہ میں یہ عہد کر چکا تھا کہ دودھ یا دودھ کی کوئی چیز استعمال نہیں کروں گا اس لیے، انھوں نے خاص میرے لیے گیہوں کا میٹھا دلیہ پکایا تھا اور اس میں گھی کی جگہ تیل ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیالہ بھر مونگ کی دال بھی میرے سامنے رکھ دی۔ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت مرغوب تھیں اس لئے میں نے بڑے شوق سے کھائیں۔ میں سمجھتا تھا کہ بس اتنا کھاؤں گا کہ نقصان کا اندیشہ نہ ہو کستورا بائی کی خوشی ہو جائے اور مجھے ذائقے کی لذت مل جائے۔ مگر شیطان تاک میں بیٹھا تھا۔ بھوڑا ا

سا کھانے کی جگہ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ موت کے فرشتے کے لئے یہ دعوت کافی تھی۔ ایک گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ مجھے بہت سخت پیچش ہوگئی۔

اُسی دن شام کو مجھے ندیاد واپس جانا تھا۔ بڑی مصیبت سے میں سابرمتی کے اسٹیشن تک پہنچا جس کا فاصلہ آشرم سے سوا میل سے زیادہ نہیں ہے۔ احمد آباد سے ولبھ بھائی ساتھ ہو لئے۔ انھیں میرے چہرے سے معلوم ہو گیا کہ میری طبیعت اچھی نہیں مگر میں نے اُن پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے کس قیامت کی تکلیف ہے۔

دس بجے رات کو ہم ندیاد پہنچے۔ ہندو آشرم جہاں ہم لوگ مقیم تھے اسٹیشن سے صرف آدھ میل ہے مگر میرے لئے یہ فاصلہ اُس وقت دس میل سے کم نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں آشرم پہنچ گیا مگر درد کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ پاخانہ کسی قدر دور تھا اس لئے مجھے اپنے رفیقوں سے یہ کہنا پڑا کہ پاس کے کمرے میں ایک کموڈ رکھوا دیا جائے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی شرم آئی مگر مجبوری تھی۔ پھول چندجی نے فوراً کموڈ مہیا کر دیا۔ سب لوگ تردد کی حالت میں میرے گرد جمع ہو گئے۔ وہ بڑی محبت سے میری خدمت کر رہے تھے لیکن میرے درد کو دور کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور میری ضد نے انھیں اور بے دست و پا کر دیا۔ میں نے طبی امداد سے قطعی انکار کیا۔ مجھے اپنی حماقت کی سزا بھگتنا قبول تھا مگر دوا کرنا قبول نہ تھا۔ اس لئے وہ بیچارے حسرت سے دیکھتے تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے چوبیس گھنٹے میں تیس چالیس دست آئے۔ میں نے غذا بالکل ترک کر دی یہاں تک کہ ابتدا میں پھلوں کے افشردے سے بھی پرہیز کیا۔ بھوک نام کو نہ تھی۔ میں سمجھا کرتا تھا کہ میری کاٹھی لوہے کی ہے مگر اب دیکھا تو میرا جسم مٹی کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں مرض سے مقابلے کی قوت بالکل نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر کانوگا نے آ کر مجھے بہت سمجھایا کہ دوا پی لو مگر میں نے کسی طرح منظور نہیں کیا۔ پھر انھیں نے کہا اچھا میں انجکشن[لہ] دیتا ہوں۔ میں اس پر راضی نہیں

لہ بازو میں سوئی چبھو کر پچکاری کے ذریعے جسم میں دوا پہونچانے کو انجکشن کہتے ہیں۔

ہوا۔ اس زمانے میں انجکشن کے متعلق میری معلومات اس قدر غلط تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ ہر انجکشن میں سیرم[1] ہوتا ہے۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ جو انجکشن ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا تھا وہ نباتاتی مادّے کا تھا مگر اس وقت یہ علم بیکار تھا۔ دست برابر جاری رہے اور میں بالکل پست ہوگیا۔ اس تکان سے مجھے بخار ہو آیا اور سرسامی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میرے دوست اور گھبرائے اور انہوں نے اور ڈاکٹروں کو بلایا۔ مگر وہ ایسے مریض کا کیا علاج کرتے جو ان کی بات سنتا ہی نہ تھا؟

سیٹھ امبالال اپنی نیکدل بیوی کے ساتھ ندیاد پہنچے۔ انہوں نے میرے دوستوں سے مشورہ کیا اور مجھے نہایت احتیاط سے اپنے مرزاپور (احمد آباد) والے بنگلے میں لے گئے۔ اس بیماری میں جس محبت اور بے نفسی سے میری خدمت کی گئی شاید ہی کبھی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ مگر ایک خفیف سی حرارت ہر وقت رہتی تھی اور میرے جسم کو روز بروز تحلیل کر رہی تھی۔ مجھے یہ خیال ہو گیا کہ میری بیماری طول پکڑے گی اور میں جاں بر نہ ہوسکونگا۔ اس لئے گو سیٹھ امبالال کے یہاں میری خبر گیری انتہائی محبت اور توجہ سے ہوتی تھی میری طبیعت الجھنے لگی اور میں نے بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ مجھے آشرم پہونچا دو۔ میرے اصرار سے وہ بیچارے مجبور ہوگئے۔

میں آشرم میں بستر علالت پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل یہ خبر لائے کہ جرمنی کو کامل شکست ہوگئی ہے اور کمشنر نے کہلا بھیجا ہے کہ اب رنگروٹوں کی ضرورت نہیں۔ یہ سُن کر مجھے بڑی تسکین ہوئی کہ اب اس معاملے میں دردسری نہیں کرنا ہوگی۔

اب میں پانی کا علاج کر رہا تھا۔ اس سے کسی قدر فائدہ تھا مگر جسم کو از سر نو بنانا

---

[1] سیرم جانوروں کے جسم میں وبائی جراثیم داخل کرکے ان کے خون سے بنتا ہے اور چیچک ہیضے وغیرہ کے ٹیکے میں استعمال ہوتا ہے۔

کوئی سہل کام نہ تھا۔ میرے طبی مشیر بہت تھے اور انھوں نے طرح طرح کے مشورے دئے مگر میں کسی دوا یا غذا کے استعمال پر راضی نہیں ہوا۔ ان میں دو تین نے کہا کہ آپ دودھ کے ترک کا عہد کر چکے ہیں اس لئے مناسب ہوگا کہ یخنی پیا کیجئے اور اس کے جواز میں آیوروید کی سند پیش کی۔ ایک نے انڈے کے استعمال پر اصرار کیا۔ مگر میرے پاس سب کے لئے ایک ہی جواب تھا "مجھے معاف کیجئے"۔

میں غذا کے بارے میں شاستر کی سند کا قائل نہیں تھا۔ یہ مسئلہ میری زندگی کا اہم جزء تھا اور میری زندگی کے اصول بیرونی سند کے پابند نہیں تھے۔ اگر میرا جینا ان اصولوں کے ترک کرنے پر موقوف تھا تو مجھے ایسا جینا منظور نہیں تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اپنے بارے میں اس اصول کو توڑ دوں جس کی پابندی پر میں بارہا اپنے بیوی، بچوں اور دوستوں کو مجبور کر چکا تھا!

میری عمر میں یہ پہلی طویل بیماری تھی۔ اس میں مجھے اپنے اصولوں کے امتحان کا بہت اچھا موقع ملا۔ ایک رات میں بالکل مایوس ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ موت آپہنچی ہے۔ میں نے انسویا بہن کو بلا بھیجا۔ وہ بیچاری فوراً دوڑی آئیں۔ ولبھ بھائی ڈاکٹر کانوگا کو لیکر پہنچے۔ انھوں نے میری نبض دیکھی اور کہا "آپ کی نبض اچھی خاصی چل رہی ہے۔ کسی قسم کا خطرہ مطلق نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ انتہائی کمزوری سے اعصاب نے جواب دے دیا ہے۔" مگر مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ ساری رات جاگتے گذری۔

صبح ہو گئی اور موت نہیں آئی۔ پھر بھی میرے دل سے یہ خیال کسی طرح نہیں نکلتا تھا کہ خاتمہ نزدیک ہے اور میں سوائے سونے کے اوقات کے ہر وقت آشرم والوں سے گیتا پڑھوا کر سنتا تھا۔ میں خود پڑھ نہیں سکتا تھا۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جہاں ذرا بات کی دماغ ہل جاتا تھا۔ زندگی کی خواہش مطلق نہیں رہی تھی کیونکہ محض جینے کی خاطر جینا مجھے کبھی گوارا نہیں ہوا۔ اس بے بسی اور معذوری کی حالت میں نفس شماری کرنا

اور اپنے دوستوں اور رفیقوں سے خدمت لینا' اور اپنے جسم کو تحلیل ہوتے دیکھنا میرے لئے سوہان روح تھا۔

ایک دن میں اسی طرح موت کے انتظار میں پڑا تھا کہ ڈاکٹر تلوالکر ایک عجیب وغریب آدمی کو ساتھ لے کر آئے۔ یہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔ یہ کوئی مشہور آدمی نہ تھے مگر میں ان کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ بھی میری طرح خبطی ہیں۔ وہ مجھ پر اپنا علاج آزمانے کے لئے آئے تھے۔ انھوں نے گرانٹ میڈیکل کالج میں اپنی تعلیم کی قریب قریب تکمیل کر لی تھی مگر سند نہیں لی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ برہمو سماج کے رکن تھے۔ یہ کیلکر جی کہلاتے تھے۔ ان کے مزاج میں بے حد خودرائی اور ضد تھی۔ یہ برف کے علاج کا کلمہ پڑھتے اور مجھے اپنا تختۂ مشق بنانا چاہتے تھے۔ ہم نے ان کا نام "برف کا ڈاکٹر" رکھ دیا۔ انھیں یقین ہے کہ انہوں نے بہت ایسی باتیں معلوم کی ہیں جن کی باقاعدہ ڈاکٹروں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اپنی اور میری بدقسمتی سے وہ مجھے اپنے طریقۂ علاج کا معتقد نہ کر سکے۔ میں ان کے اصولوں کو ایک خاص حد تک تسلیم کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں انھوں نے بعض نتیجے نکالنے میں بہت عجلت سے کام لیا ہے۔

بہرحال ان کے دریافت کئے ہوئے اصول صحیح ہوں یا غلط میں اس پر راضی ہو گیا کہ وہ میرے جسم کو تختۂ مشق بنائیں۔ مجھے خارجی علاج میں کوئی تامل نہ تھا۔ ان کا علاج یہ تھا کہ سارے جسم پر برف رکھ دیا جائے۔ ان کو میرے علاج میں جس کامیابی کا دعویٰ ہے اُس کی تو میں تصدیق نہیں کر سکتا مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے علاج سے میرے دل میں نئے سرے سے اُمید اور قوت پیدا ہو گئی اور اس کا اثر لامحالہ میرے جسم پر بھی ہوا۔ مجھے بھوک لگنے لگی اور میں دس پانچ منٹ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اب انہوں نے میری غذا کی اصلاح پر توجہ کی۔ انھوں نے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ کچے انڈوں کا استعمال کریں تو آپ کی طاقت بہت جلد عود کر آئے گی۔ انڈا دودھ کی طرح بے ضرر چیز ہے۔ اسے

ہرگز گوشت نہیں کہہ سکتے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ سب انڈوں میں بچے نہیں ہوتے ؟ بازار میں خالی انڈے بھی ملتے ہیں۔" مجھے خالی انڈوں کا استعمال بھی گوارا نہ تھا۔ پھر بھی مجھے اتنا افاقہ ہو گیا کہ میں ملکی مسائل کی طرف توجہ کرنے لگا۔

انتیسواں باب

رولٹ بل اور میری کشمکش

میرے دوستوں نے اور ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر تم تبدیل آب وہوا کے لئے ماتھران چلے جاؤ تو تمہاری طاقت بہت جلد عود کر آئے گی چنانچہ میں وہاں گیا۔ لیکن ماتھران کا پانی بہت شور تھا اس لئے وہاں کے قیام میں مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ پیچش کے سبب سے بواسیر کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور قضائے حاجت کے وقت بہت شدید درد ہوتا تھا اس لئے میں غذا کے خیال سے لرزتا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی مجھے ماتھران سے بھاگنا پڑا۔ اب شنکر لال بنکر میری صحت کے محافظ بن گئے، اور انھوں نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر دلال کو دکھاؤ چنانچہ ڈاکٹر دلال بلائے گئے۔ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ ہر معاملے کا فیصلہ فوراً کر دیتے تھے۔

انھوں نے کہا "جب تک آپ دودھ نہ استعمال کریں آپ کے بدن میں طاقت نہیں آسکتی۔ اور اگر اسی کے ساتھ آپ فولاد اور سنکھیا کے انجکشن بھی لیں تو پھر میں ذمّہ لیتا ہوں کہ آپ کو پھر سے مضبوط اور توانا بنا دوں گا۔

میں نے کہا "آپ انجکشن شوق سے دیجئے، مگر دودھ کا معاملہ اور ہے۔ اس کے متعلق میں عہد کر چکا ہوں۔" ڈاکٹر نے پوچھا "آخر معلوم تو ہو کہ آپ کا عہد ہے کیا؟"

میں نے انھیں اپنے عہد کی ساری تاریخ سنائی کہ جب سے یہ معلوم ہوا کہ گائے بھینسوں کے تھن جلائے جاتے ہیں مجھے دودھ سے نفرت ہوگئی۔ علاوہ اس کے میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ دودھ انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کے ترک کا عہد کر لیا۔" کستورا بائی جو میری پٹی کے پاس کھڑی یہ باتیں سن رہی تھیں بول اٹھیں "تو پھر آپ کو

بکری کا دودھ پینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟"

ڈاکٹر بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ انھوں نے کہا "آپ بکری کا دودھ پئیں تب بھی کام چل جائے گا۔" میں لالچ میں آگیا۔ ستیاگرہ شروع کرنے کے شوق نے میرے دل میں زندگی کی دبی ہوئی آرزو کو ابھار دیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے عہد کی لفظی پابندی پر اکتفا کی اور اس کے اصل منشا کے گلے پر چھری پھیر دی۔ یہ سچ ہے کہ عہد کرتے وقت میرے دل میں صرف گائے اور بھینس کے دودھ کا خیال تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم سب جانوروں کے دودھ پر حاوی تھا۔ اس کے علاوہ جب میرا یہ عقیدہ تھا کہ دودھ انسان کی قدرتی غذا نہیں ہے تو پھر میرے لئے کسی قسم کے دودھ کا استعمال جائز نہ تھا۔ ان سب باتوں کے علم کے باوجود میں بکری کا دودھ پینے پر راضی ہو گیا۔ زندگی کی خواہش حق کی محبت پر غالب آگئی اور طالب حق نے ستیاگرہ کی لڑائی چھیڑنے کے شوق میں اپنے پاک نصب العین کا دامن مصلحت کے چھینٹوں سے ناپاک کر دیا۔ یہ بات اب تک میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور گناہ کی خجالت مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ میں ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہوں کہ بکری کا دودھ چھوڑ دوں لیکن ہنوز دنیا داری کی آخری زنجیر یعنی خدمت کا شوق مجھے پابند کئے ہوئے ہے۔

مجھے اپنے غذائیاتی تجربے اس لئے عزیز ہیں کہ میں انھیں اہنسا کی منزل کے مرحلے سمجھتا ہوں۔ لیکن بکری کا دودھ پینے میں مجھے اہنسا کے ترک کے خیال سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی ترک حق یعنی نقض عہد کے خیال سے ہوتی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے حق کی معرفت اہنسا کی معرفت سے زیادہ حاصل ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ اگر تو نے حق کا دامن چھوڑ دیا تو اہنسا کا معمہ کبھی حل نہ ہوگا۔ حق کا یہ تقاضا ہے کہ انسان جو عہد کرے اسے لفظاً اور معنیً دونوں کے اعتبار سے پورا کرے۔ موجودہ صورت میں میں نے اپنے عہد کی لفظی پابندی تو کی مگر اس کے معنی کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ سب جاننے کے باوجود مجھے راہ عمل صاف نظر نہیں آتی۔ یا شاید یہ بات ہے کہ مجھ میں سیدھے راستے پر چلنے کی ہمت نہیں۔ سچ پوچھئے تو ان

دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ شک جبھی ہوتا ہے کہ ایمان نہ ہو یا ایمان میں استواری نہ ہو۔ میں دن رات دعا مانگتا ہوں "اے میرے داتا مجھے ایمان عطا کر"۔

غرض میں نے بکری کے دودھ کا استعمال شروع کر دیا۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ڈاکٹر دلال نے مجھ پر آپریشن کیا اور وہ کامیاب ہوا۔ جوں جوں میرے بدن میں طاقت آتی گئی میرے دل میں زندگی کی خواہش بڑھتی گئی خاصکر اس لئے کہ خدا کو مجھ سے ایک کام لینا تھا۔

ابھی مجھے اچھی طرح صحت نہیں ہو پائی تھی کہ اخبار دیکھتے دیکھتے میری نظر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر پڑ گئی۔ اس کی تجویزیں دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ شنکر لال بینکر اور عمر سوبانی نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کو اس معاملے میں فوری کارروائی کرنا چاہیئے۔ مگر میں ایک مہینے کے بعد اس قابل ہوا کہ احمد آباد جا سکوں۔

ولبھ بھائی قریب قریب روزانہ مجھے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میں نے ان سے اپنے اندیشے کا ذکر کیا اور کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ وہ کہنے لگے "ہم ایسی صورت میں کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے جواب دیا "اگر چند آدمی بھی ایسے مل جائیں جو مقاومت کے حلف نامے پر دستخط کر دیں اور اس پر بھی یہ قانون پاس ہو جائے تو ہم فوراً ستیاگرہ شروع کر سکتے ہیں۔ اگر میری یہ حالت نہ ہوتی تو میں تن تنہا اس کے مقابلے کے لئے کھڑا ہو جاتا اور رفتہ رفتہ اور لوگ بھی میرا ساتھ دیتے۔ مگر اس بے بسی کی حالت میں میں اس مہم کا بیڑا نہیں اُٹھا سکتا"۔

اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ میرے دوستوں کو جمع ہو کر مشورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ میرے خیال میں رولٹ کمیٹی کی تجاویز ان شہادتوں کی بنا پر جو اس کے ساتھ شائع ہوئی تھیں، ہرگز جائز نہیں قرار دی جا سکتی تھیں اور کوئی قوم جس میں ذرا سی خودداری بھی ہو انھیں کسی طرح قبول نہیں کر سکتی تھی۔

خدا خدا کر کے مجوزہ جلسہ آشرم میں منعقد ہوا۔ اس میں بیس آدمی سے زیادہ نہیں بلائے گئے تھے۔ مجھے ان میں سے ولبھ بھائی کے علاوہ مسز سروجنی نائڈو، مسٹر ہارنیمن، سیٹھ

عمر سوبانی، شنکرلال بنیکر اور انسویا بین کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ اس جلسے میں ستیا گرہ کا حلف نامہ مرتب کیا گیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے سب حاضرین نے اس پر دستخط کر دئے۔ میں اس زمانے میں کوئی اخبار نہیں نکالتا تھا مگر کبھی کبھی روزانہ اخباروں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ یہی صورت میں نے اس موقعے پر اختیار کی۔ شنکرلال بنیکر نے بڑے زور و شور سے یہ تحریک اُٹھائی اور مجھے پہلی بار ان کی بے نظیر قوت عمل اور قوت تنظیم کا اندازہ ہوا۔

مجھے ملک کی کسی انجمن سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ ستیا گرہ کے نئے حربے سے کام لینے پر تیار ہو گی اس لئے میری تحریک پر ایک خاص انجمن ستیا گرہ سبھا کے نام سے قائم کی گئی۔ اس کے ممتاز اراکین سب بمبئی کے تھے اس لئے وہی اس کا صدر مقام قرار پایا۔ تھوڑے دن میں کھیدا کی لڑائی کا سارا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ ہزارہا آدمی حلف نامے پر دستخط کر رہے تھے، بلیٹن نکالے جا رہے تھے، جدھر دیکھئے عام جلسے ہو رہے تھے۔

میں ستیا گرہ سبھا کا صدر بنایا گیا۔ مجھے بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ مجھ میں اور سبھا کے تعلیم یافتہ ممبروں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکتا۔ میرا اس پر زور دینا کہ سبھا کی کارروائی گجراتی میں ہو، اور اسی قسم کی اور انوکھی باتیں، ان کے لئے بڑی زحمت کا باعث تھیں۔ مگر اس کا مجھے اعتراف ہے کہ ان میں سے اکثر نے میرے مزاق کو برداشت کرنے میں بڑی فراخدلی دکھائی۔

پھر بھی ابتدا سے کچھ ایسا نظر آتا تھا کہ یہ سبھا زیادہ دن چلنے والی نہیں۔ مجھ پر یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ اس کے بعض ممبروں کو میرا حق اور اہنسا پر زور دینا ناگوار ہے۔ پھر بھی شروع میں ہماری تحریک زور شور سے چلی اور روز بروز قوت پکڑتی گئی۔

تیسواں باب

وہ شاندار منظر!

ادھر تو رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف شورش بڑھ رہی تھی اور اُدھر حکومت کو کد تھی کہ کمیٹی کی تجاویز پر عمل کر کے رہے گی۔ چنانچہ اُس نے رولٹ بل مرتب کر کے شائع کر دیا۔ میں عمر بھر میں ایک بار ہندوستان کی مجلس وضع قوانین میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں اور یہ وہی موقع تھا جب رولٹ بل پر بحث ہو رہی تھی۔ شاستری جی نے ایک پرجوش تقریر میں حکومت کو آگاہ کر دیا کہ سمجھ بوجھ کر قدم اُٹھائے۔ ان کی خطابت کا دریا موجیں مار رہا تھا اور وائسرائے اُن کے چہرے پر نظر جمائے، محویت کے عالم میں، اُن کی تقریر سُن رہے تھے۔ ان کے الفاظ میں اس قدر سچائی اور اس قدر جوش تھا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ گمان ہو گیا کہ وائسرائے کے دل پر بھی ان کا اثر پڑا ہوگا۔

لیکن جاگے تو وہ جو سوتا ہو۔ جو جان بوجھ کر سوتا بن جائے اُسے کون جگا سکتا ہے؟ حکومت کی بعینہٖ یہی حالت تھی۔ اسے تو بس یہ فکر تھی کہ قانونی ضابطے کی رسم پوری ہو جائے۔ اسے جو فیصلہ کرنا تھا پہلے ہی کر چکی تھی۔ شاستری جی کے متنبہ کرنے کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ایسی صورت میں میری فریاد گویا نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ میں نے وائسرائے کو منت سماجت سے سمجھایا، اُن کے نام نجی کے خط لکھے، ضابطے کی درخواستیں بھیجیں مگر یہ ساری کوششیں بے کار گئیں۔

یہ مسودہ ابھی تک قانون کی حیثیت سے گزٹ میں شائع نہیں ہوا تھا کہ میرے پاس مدراس والوں کی طرف سے دعوت آئی۔ میں بہت کمزور تھا اور سفر بہت دور و دراز کا

تھا مگر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ چاہے جو کچھ ہو، جانا ضرور چاہیے۔ ان دنوں میں اتنی بلند آواز میں گفتگو نہیں کر سکتا تھا کہ سارا جلسہ سن سکے۔ یہ معذوری ایک حد تک اب بھی باقی ہے۔ اگر میں کھڑے ہو کر تقریر کروں تو تھوڑی دیر میں سارے بدن سے کانپنے لگتا ہوں اور شدت سے اختلاج شروع ہو جاتا ہے۔

جنوبی ہند والوں کی صحبت میں میں بہت جلد گھل مل جاتا ہوں۔ تامل اور تیلگو بھائیوں پر میں خاص طور سے اپنا حق سمجھتا ہوں کیونکہ جنوبی افریقہ میں میں نے برسوں ان کے ساتھ مل کر کام کیا ہے اور ان نیک لوگوں نے بھی ہمیشہ اس حق کو نباہا ہے۔ میرے پاس جو دعوت نامہ آیا تھا اس پر کستوری رنگ آئنگر آنجہانی کے دستخط تھے۔ مگر راہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس دعوت کے محرک در پردہ راجا گوپال چاری ہیں۔ اصل میں یہ میری ان کی پہلی ملاقات تھی۔

راجا گوپال چاری ان دنوں نئے نئے سیلم سے مدراس آئے تھے۔ ان کے دوستوں نے، جن میں کستوری رنگ آئنگر آنجہانی بھی تھے، انھیں مجبور کیا تھا کہ مدراس میں بیکر وکالت کریں۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ یہاں انھیں قومی کام کا موقع زیادہ ملے گا۔ ہم لوگ مدراس میں انھیں کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بات مجھے دو دن کے بعد معلوم ہوئی کہ ہم ان کے مہمان ہیں۔ وہ مکان کستوری رنگ آئنگر جی کا تھا اس لئے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہی ہمارے میزبان ہیں۔ مگر مہادیو دیسائی نے میری یہ غلط فہمی دور کر دی۔ انھوں نے راجا گوپال چاری سے، جو اپنے خلقی حجاب کے سبب دور دور رہتے تھے، بہت جلد دوستی پیدا کر لی اور مجھ سے بھی کہا کہ دیکھیے ان سے ضرور تعلقات بڑھائیے۔

میں نے یہی کیا۔ ہم روزانہ لڑائی کے منصوبوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت تک مجھے سوائے جلسے کرنے کے اور کوئی پروگرام نہیں سوجھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر رولٹ بل تمام مدارج سے گذر کر قانون بن جائے تو مجھے سول نافرمانی کا کیا طریقہ

اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی نافرمانی اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ حکومت اس کا موقع دے ہیں سوچتا تھا کہ اگر ایسا موقع نہ ملے تو ہمارے لئے دوسرے قوانین کی سول نافرمانی کرنا جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ یہ مسئلہ اور اسی قسم کے اور مسائل ہمارے موضوع بحث رہا کرتے تھے۔

آنگر جی نے لیڈروں کی ایک چھوٹی سی کانفرنس اس معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے منعقد کی منجملہ اور لوگوں کے وجیا راگھو چاری جی نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے مجھے یہ رائے دی کہ ستیا گرہ کے فن کا ایک مفصل دستور العمل مرتب کرو جو تمام جزئیات پر حاوی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ خبر آئی کہ رولٹ بل قانون کی حیثیت سے شائع کر دیا گیا۔ اس رات کو میں اس مسئلے پر غور کرتے کرتے سو گیا۔ پچھلے پہر میری آنکھ معمولی وقت سے ذرا پہلے کھل گئی۔ ابھی میں خواب و بیداری کی سرحد پر تھا کہ یکایک اس مسئلے کا حل میری سمجھ میں آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے خواب دیکھا ہو۔ میں نے یہ سارا قصہ راجا گوپال چاری سے بیان کیا:-

"رات مجھے خواب میں یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں عام ہڑتال کرانا چاہیئے۔ ستیا گرہ تزکیہ نفس کا نام ہے۔ ہماری لڑائی مقدس لڑائی ہے اس لئے میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ ہم اس کا آغاز تزکیہ نفس کے عمل سے کریں۔ اس لئے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی اُپاس کریں، اپنا کاروبار موقوف رکھیں اور اپنا وقت عبادت میں بسر کریں۔ مسلمانوں کے یہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ ناجائز ہے اس لئے اُپاس چوبیس گھنٹے کا رکھا جائے۔ اس کا اندازہ مشکل ہے کہ سب صوبے ہماری اس التجا کو قبول کریں گے یا نہیں مگر بمبئی، مدراس، بہار اور سندھ کی طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ میرے خیال میں اگر انہیں چار صوبوں میں اچھی

طرح ہڑتال ہو جائے تو کافی ہے۔"

یہ تجویز راجا گوپال چاری کے دل میں کھب گئی۔ اور دوستوں سے ذکر آیا تو انھوں نے بھی اسے بہت پسند کیا۔ میں نے ایک مختصر سے اپیل کا مسودہ بنایا۔ ہڑتال کے لئے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء رکھی گئی مگر آگے چل کر یہ تاریخ بدل دی گئی اور ۶ اپریل مقرر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تیاری کی مہلت بہت کم ملی لیکن ہمیں اس کام میں عجلت مدنظر تھی اسلئے اس سے زیادہ دور کی تاریخ رکھنا مناسب نہ تھا۔

انسان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اتنی جلدی سب انتظام کیونکر ہو گیا۔ اس دن سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر میں، ایک ایک گاؤں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ کتنا شاندار تھا وہ منظر!

اکتیسواں باب

وہ یادگار ہفتہ! (۱)

جنوبی ہند میں ایک مختصر سا دورہ کرنے کے بعد میں ۴ر اپریل کو بمبئی پہنچ گیا شنکر لال بنیکر نے مجھے تار دے دیا تھا کہ ۶ر اپریل کے معرکے میں آپ کو بمبئی میں موجود رہنا چاہیے۔

دہلی میں ۳۰ر مارچ کو ہڑتال ہو چکی تھی۔ وہاں سوامی شردھانندجی اور حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا طوطی بولتا تھا۔ انھیں ہڑتال کی التوا کا تار دیر میں پہنچا اس لئے اس کی تعمیل نہ کر سکے۔ دہلی میں جیسی ہڑتال اُس دن ہوئی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک دل ہو گئے۔ سوامی شردھانندجی سے جامع مسجد میں تقریر کرائی گئی۔ بھلا حکام ان باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور ان پر گولی چلائی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بہت سے مارے گئے۔ دہلی میں جبر و تشدد کا دور دورہ ہو گیا۔ شردھانندجی نے مجھے تار دیا کہ فوراً دہلی پہنچو۔ میں نے تار پر جواب دیا کہ بمبئی میں ۶ر اپریل منا کر میں سیدھا دہلی آؤں گا۔

جو واقعہ دہلی میں پیش آیا تھا قریب قریب وہی لاہور اور امرت سر میں گذرا۔ امرت سر سے میرے پاس ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی تاکیدی دعوت آئی۔ میں اس وقت تک دونوں صاحبوں سے بالکل واقف نہیں تھا مگر میں نے ان سے وعدہ کیا کہ دہلی سے امرت سر آؤں گا۔

۶ر اپریل کی صبح کو بمبئی والے ہزاروں کی تعداد میں چوپاٹی پر جمع ہوئے اور انھوں نے سمندر میں اشنان کیا۔ اس کے بعد ان کا جلوس ٹھاکر دوار کی طرف روانہ ہوا۔ اس جلوس میں

کچھ عورتیں اور بچے بھی نظر آتے تھے اور مسلمان بہت بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ٹھاکردوار سے مسلمان بھائی ہم میں سے کچھ لوگوں کو قریب کی ایک مسجد میں لے گئے اور وہاں انھوں نے مجھ سے اور مسز نائڈو سے تقریریں کرائیں۔ سیٹھ وٹھل داس جی جیراجنی نے یہ تجویز پیش کی کہ اسی جگہ لوگوں سے ہندو مسلم اتحاد اور سودیشی کا عہد لیا جائے لیکن میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ عہد کرنے یا عہد لینے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کیا کم ہے۔ عہد کرنے کے بعد اس سے پھرنے کا موقع نہیں رہتا اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے لوگ سودیشی کے عہد کے معنی اچھی طرح سمجھ لیں اور ہندو مسلم اتحاد کی پوری ذمہ داری محسوس کرلیں۔ میری رائے میں جو لوگ عہد کرنا چاہتے ہیں وہ کل صبح پھر کسی جگہ جمع ہوں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بمبئی میں ہڑتال پوری طرح کامیاب ہوئی۔ سول نافرمانی کی تیاریاں بھی مکمل ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں دو تین تجویزوں پر غور کرنے کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ صرف وہی قوانین سول نافرمانی کے موضوع بنائے جائیں جن کی خلاف ورزی عام طور پر ممکن ہو۔ لوگ ان دنوں نمک کے محصول کے بہت مخالف تھے اور عرصے سے اسے منسوخ کرانے کی کوشش ہو رہی تھی اس لیے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ لوگ سمندر کے پانی سے اپنے گھروں میں نمک بنائیں اور اس طرح قانون نمک کی خلاف ورزی کریں۔ میری دوسری تجویز ممنوعہ کتابوں کی فروخت سے متعلق تھی۔ میری دو کتابیں ہند سوراج اور سروودیا[۵] جو ممنوع قرار دی جا چکی تھیں، اس مقصد کے لیے بہت موزوں تھیں۔ سول نافرمانی کا سب سے سہل طریقہ یہی نظر آیا کہ یہ دونوں کتابیں چھاپ کر کھلم کھلا بیچی جائیں۔ اس لیے یہ کتابیں مناسب تعداد میں چھپوائی گئیں اور یہ طے ہوا کہ شام کو فاقہ شکنی کے بعد جو عظیم الشان جلسہ ہونے والا ہے اُس کے ختم ہونے پر ان کے نسخے فروخت کیے جائیں۔

---

[۵] رسکن کی مشہور کتاب *Unto this last* کا آزاد ترجمہ گجراتی زبان میں۔

اس لیے ۶؍اپریل کی شام کو والنٹیروں کی فوج کی فوج ممنوع کتابوں کو لیکر بیچنے کے لئے نکلی۔ میں اور مسز نائڈو موٹر میں بیٹھ کر چلے۔ تھوڑی دیر میں سب نسخے بک گئے۔ ان کتابوں کی آمدنی سول نافرمانی کے معرکے کے لیے مخصوص کردی گئی تھی۔ ان کی قیمت چار چار آنے تھی مگر شاید ہی کسی نے مقررہ قیمت دینے پر اکتفا کی ہو۔ بہت سے لوگوں نے تو اپنی جیبیں جھاڑ کر جو کچھ تھا ایک نسخے کی قیمت میں دیدیا۔ پانچ پانچ اور دس دس روپے کے نوٹ ہر طرف سے برس رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے ایک نسخہ پچاس روپے میں خریدا! یہ بات اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کردی گئی تھی کہ ممنوع کتابوں کے خریدنے سے وہ گرفتاری اور قید کے مستوجب ہوں گے۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے لوگوں نے جیل کا خوف دل سے نکال دیا تھا۔

آگے چل کر معلوم ہوا کہ حکومت نے آسانی کے لحاظ سے یہ قانونی نکتہ نکالا ہے کہ ان کتابوں کا بیچنا ممنوعہ کتابوں کی فروخت کی حد میں نہیں آسکتا۔ ممانعت پہلے ایڈیشن کے بیچنے کی تھی اور یہ نسخے جو بیچے گئے ہیں حکومت کے خیال میں نئے ایڈیشن کے تھے۔ اس خبر سے سب کو بڑی مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو ایک اور جلسہ سودیشی اور ہندو مسلم اتحاد کا عہد لینے کے لئے کیا گیا۔ وٹھل داس جی جیراجنی کو پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ جلسے میں بہت کم لوگ آئے۔ ان میں سے دو چار خواتین کے نام مجھے ابتک یاد ہیں۔ مرد بھی معدودے چند تھے۔ میں حلف نامے کا مسودہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پر دستخط لینے سے پہلے میں نے اس کا مطلب سب لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ حاضرین کی کمی پر مجھے نہ افسوس ہوا اور نہ تعجب۔ میں جانتا ہوں کہ عوام شورش اور ہنگامے کو پسند کرتے ہیں اور خاموش تعمیری کاموں سے گھبراتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے آجتک ہو رہا ہے۔

غرض ۷؍اپریل کی شام کو میں دہلی اور امرتسر کے قصد سے روانہ ہو گیا۔ ۸ کو متھرا پہنچ کر

میں نے یہ خبر جا سنا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے والی ہے ۔ متھرا کے بعد جس اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی وہاں اچاریا گڈوانی مجھ سے ملنے آئے ۔ انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی اور کہا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں ۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں آپ کو ضرور تکلیف دوں گا ۔

پلول کا اسٹیشن آنے سے پہلے مجھے ایک حکمنامہ دکھایا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کو پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے کی ممانعت کی جاتی ہے کیونکہ آپ کی موجودگی سے نقص امن کا اندیشہ ہے ۔ پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اگلے اسٹیشن پر اُتر جائیے ۔ میں نے اُترنے سے انکار کیا اور کہا " مجھے پنجاب والوں نے بہت اصرار سے بلایا ہے ۔ میں وہاں شورش بھڑکانے نہیں بلکہ فرو کرنے جا رہا ہوں ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں سرکاری حکم کی تعمیل سے معذور ہوں ۔"

اتنے میں گاڑی پلول پہنچی ۔ مہادیو دیسائی میرے ساتھ تھے ۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ دہلی جا کر شردھانند جی کو اس واقعے کی اطلاع دیجئے ، اور وہاں کے لوگوں سے کہیئے کہ سکون سے کام لیں ۔ انھیں میری عدول حکمی کی وجوہ سمجھا دیجئے ، اور اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیجئے کہ ہماری فتح اسی میں ہے کہ اگر مجھے سزا بھی ہو جائے تو وہ پوری طرح امن قائم رکھیں ۔

پلول کے اسٹیشن پر میں گاڑی سے اُتار کر پولیس کی حراست میں دیدیا گیا ۔ تھوڑی دیر میں دہلی سے ایک گاڑی آئی ۔ میں اُس میں ایک تیسرے درجے میں بٹھایا گیا اور پولیس والے میرے ساتھ بیٹھے ۔ متھرا میں یہ لوگ مجھے پولیس لین لے گئے مگر وہاں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میرے متعلق کیا صورت اختیار کی جائیگی اور میں کہاں بھیجا جاؤں گا ۔ دوسرے دن صبح چار بجے میں سوتے سے اُٹھا کر ایک بمبئی جانے والی مال گاڑی میں سوار کر دیا گیا ۔ دوپہر کو سوائی مادھوپور میں پھر اُترنا پڑا ۔ ڈاک گاڑی سے مسٹر براؤن انسپکٹر پولیس لاہور سے آئے اور انہوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا ۔ اب میں اُن کے ساتھ فرسٹ کلاس میں بٹھایا گیا ۔ پہلے معمولی قیدی تھا اب " جنٹلمین " قیدی بن گیا ۔ انسپکٹر صاحب نے سر مائکل اوڈائر کی قصیدہ خوانی شروع

کی۔ انہوں نے کہا لاٹ صاحب کا خیال خود آپ کے متعلق خراب نہیں مگر انہیں اندیشہ تھا کہ آپ کے پنجاب آنے سے نقص امن ہوگا۔ اسی قسم کی اور باتیں کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ خود ہی بمبئی واپس چلے جائیے اور یہ وعدہ کر لیجئے کہ پنجاب کی سرحد میں قدم نہ رکھئے گا۔ میں نے کہا کہ میں حکومت پنجاب کے اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں اور اپنی خوشی سے ہرگز واپس نہیں جاؤنگا۔ انسپکٹر نے جب اور کوئی چارہ نہ دیکھا تو کہا کہ اب مجھے مجبوراً قانونی کارروائی کرنا پڑے گی۔ میں نے پوچھا "مگر یہ تو بتائیے کہ آخر میرے متعلق آپ کی تجویز کیا ہے؟" انہوں نے کہا "یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ میں مزید احکام کا انتظار کر رہا ہوں۔ فی الحال تو میں آپ کو بمبئی لئے چلتا ہوں۔"

سورت پہنچ کر میں ایک دوسرے پولیس افسر کے سپرد کر دیا گیا۔ بمبئی پہنچ کر اُس نے مجھ سے کہا "اب آپ آزاد ہیں۔ مگر مناسب یہ ہے کہ آپ میرین لائن کے قریب اُتر جائیں میں وہاں گاڑی کھڑی کرا لوں گا۔ قلابہ اسٹیشن پر تو غالباً بڑی بھیڑ ہوگی۔ میں نے کہا کہ میں خوشی سے آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ اس پر وہ خوش ہوگیا اور اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

غرض میں میرین لائن پر اُترا۔ اتفاق سے ایک دوست کی گاڑی اُدھر سے گذری۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر جوہری کے گھر پہونچا دیا۔ راہ میں ان سے معلوم ہوا کہ میری گرفتاری کی خبر سُن کر لوگ بہت برہم ہیں اور ان کا جوش جنوں کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ پائدھونی کے قریب فساد کا اندیشہ ہے اور مجسٹریٹ اور پولیس وہاں پہنچ گئی ہے۔

میں نے ڈاکٹر جوہری کے یہاں قدم رکھا ہی تھا کہ انسویا بین اور عمر سوبانی آپہنچے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ فوراً ہمارے ساتھ موٹر میں پائدھونی چلئے۔ لوگوں میں بیحد بے چینی پھیل گئی ہے ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ بغیر آپ کے کام نہیں چلے گا۔ میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ پائدھونی کے قریب پہنچ کر آدمیوں کا جنگل نظر

آیا۔ لوگ مجھے دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ فوراً ایک جلوس مرتب ہو گیا اور "بندے ماترم" اور "اللہ اکبر" کی صدائیں آسمان کی خبر لانے لگیں۔ پائدھونی پر سوار پولیس کا ایک دستہ نظر آیا۔ بالاخانوں سے اینٹیں برس رہی تھیں۔ میں نے لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سکون سے کام لیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اینٹوں کی بوچھار سے بچ کر نہیں نکل سکیں گے۔

یہ جلوس عبدالرحمٰن اسٹریٹ سے مڑ کر کرافرڈ مارکٹ جا رہا تھا کہ چوراہے پر سوار پولیس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ جو اس لئے آئی تھی کہ ہمیں فورٹ کی طرف نہ جانے دے۔ مجمع بہت گھنا تھا۔ لوگ پولیس کی صف کو توڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ اس ہنگامے میں میری آواز کام نہیں دے سکتی تھی۔ یکایک سواروں کے افسر نے مجمعے کو منتشر کرنے کا حکم دیا اور سواروں نے نیزے تان کر لوگوں پر حملہ کر دیا پہلے میں یہ سمجھا کہ میں بھی زخمی ہو جاؤں گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ نیزے موٹر کو چھوتے ہوئے نکل گئے اور نیزہ بردار تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ مجمع درہم برہم ہو گیا اور بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ روندے گئے کچھ زخمی ہوئے۔ اس آدمیوں کے جنگل میں نہ تو گھوڑوں کے گذرنے کی جگہ تھی نہ لوگوں کو بھاگنے کی راہ ملتی تھی۔ نیزہ بردار اندھا دھند کچلتے روندتے آگے بڑھے چلے جاتے تھے۔ انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ عجیب ہولناک منظر تھا۔

مجمع منتشر کر دیا گیا۔ ہمارے موٹر کو آگے بڑھنے کی اجازت ملی۔ میں کمشنر کے دفتر کے سامنے اُتر پڑا کہ ان سے پولیس کے ظلم کی شکایت کروں۔

بتیسواں باب

وہ یادگار ہفتہ! (۲)

میں مسٹر گریفیتھ کے دفتر میں داخل ہوا۔ زینے کے دونوں جانب فوجی سپاہی سر سے پیر تک مسلح کھڑے تھے گویا لام پر جانے کے لئے تیار ہیں۔ برآمدے میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اندر پہنچ کر دیکھا کہ مسٹر گریفیتھ کے پاس مسٹر براؤننگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے جو منظر دیکھے تھے ان کی روداد کمشنر سے بیان کی۔ انہوں نے یہ مختصر جواب دیا "میں جلوس کو فورٹ نہیں جانے دینا چاہتا تھا کیونکہ وہاں ضرور فساد ہوتا جب سمجھانے سے نہیں مانے تو میں نے مجبوراً پولیس کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔"

میں نے کہا "مگر آپ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لوگوں کا گھوڑوں سے روندا جانا لازمی تھا۔ آخر سواروں کا دستہ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مسٹر گریفیتھ بولے "ان باتوں کو آپ نہیں جانتے۔ ہم پولیس والے آپ سے بہتر سمجھتے ہیں کہ آپ کی تعلیم کا لوگوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر ہم سختی سے کام نہ لیں تو معاملہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائے۔ آپ میری بات یاد رکھئے کہ لوگ آپ کے سنبھالے نہیں سنبھل سکتے۔ وہ قانون توڑنے پر تو فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں مگر امن کی تعلیم ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ مانا کہ آپ کے اصول اچھے ہیں مگر عوام تو انھیں نہیں سمجھتے۔ وہ تو اپنی فطرت کے مطابق عمل کریں گے۔"

میں نے جواب دیا "اسی میں تو مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ لوگ فطرتاً تشدد پسند نہیں بلکہ امن پسند ہیں۔" دیر تک یہی بحث ہوتی رہی۔ آخر میں مسٹر گریفیتھ نے کہا "فرض

کیجئے آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ لوگ آپ کی تعلیم کو مطلق نہیں سمجھے ہیں تو پھر آپ کیا کیجئے گا؟"
میں نے کہا "اگر مجھے یہ یقین ہو جائے تو میں سول نافرمانی فوراً روک دونگا۔"
"ہیں! آپ نے تو مسٹر براؤننگ سے کہا تھا کہ میں رہا ہوتے ہی سیدھا پنجاب جاؤں گا۔"

"ہاں میں سب سے پہلی ٹرین سے جانا چاہتا تھا۔ مگر آج تو یہ ناممکن ہے۔"
"اگر آپ ذرا سا غور کریں تو آپ کو یقین ہو جائے کہ لوگ آپ کے اصول کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امرتسر میں کیا ہوا اور احمد آباد میں کیا ہو رہا ہے؟ جہاں دیکھئے لوگ آپے سے باہر ہیں۔ مجھے ابتک پوری خبریں معلوم نہیں۔ بعض جگہ تار کاٹ دیئے گئے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان بلوؤں کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے یا کسی اور پر؟"
"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی میں سارا الزام اپنے سر لونگا۔ اگر احمد آباد کے بلوے کی خبر صحیح نکلی تو مجھے بے حد تعجب اور صدمہ ہو گا۔ اب رہا امرتسر تو وہاں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔ نہ میں کبھی پنجاب گیا اور نہ مجھے وہاں کوئی جانتا ہے۔ مگر یہ مجھے یقین ہے کہ اگر حکومت نے مجھے پنجاب جانے سے نہ روکا ہوتا تو میرے سبب سے وہاں امن قائم رکھنے میں بہت آسانی ہوتی۔ میرا داخلہ بند کرکے حکومت نے لوگوں کو خواہ مخواہ اشتعال دلایا۔"

غرض اس بحث کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ آخر میں کمشنر سے یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ میں چوپاٹی پر ایک جلسہ کرکے لوگوں کو امن قائم کرنے کی ہدایت کروں گا۔
چوپاٹی کے جلسے میں میں نے بہت دیر تک تقریر کی جس میں لوگوں کو عدم تشدد کے فرض کا احساس دلایا اور ستیاگرہ کی پابندیاں سمجھائیں۔ آخر میں میں نے کہا "ستیاگرہ حق پرستوں کا حربہ ہے۔ ستیاگرہی عدم تشدد کا پابند ہوتا ہے۔ جب تک آپ خیال، قول اور فعل سب میں عدم تشدد نہ برتیں گے میں عام ستیاگرہ کو نہیں چلا سکتا۔"

انسویا بین نے بھی احمد آباد کے بلوے کی خبر سنی تھی۔ وہاں کسی نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ انسویا بین گرفتار ہو گئی ہیں۔ کارخانوں کے مزدور یہ افواہ سُن کر غصے سے مجنون ہو گئے۔ انھوں نے کام بند کر دیا اور مار دھاڑ شروع کر دی۔ اس ہنگامے میں ایک پولیس کا سرجنٹ جان سے مارا گیا۔

میں احمد آباد پہنچا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ لوگوں نے ندیاد کے اسٹیشن کے قریب ریل کی پٹری اُکھاڑ ڈالنے کی کوشش کی، ویرام گام میں ایک سرکاری افسر قتل کر دیا گیا، اور احمد آباد میں مارشل لا جاری ہے۔ لوگ خوف سے نیم جاں تھے۔ انھوں نے مجنونانہ جوش میں تشدد کیا اور اب وہ اس کی دُگنی چوگنی سزا بھگت رہے تھے۔

اسٹیشن پر ایک پولیس کا افسر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ مجھے مسٹر پریٹ کمشنر کے پاس لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے بہت نرمی سے کہا کہ مجھے اس بلوے کا بے حد افسوس ہے، مگر میرے خیال میں مارشل لا کی ضرورت نہیں میں امن قائم کرنے میں ہر قسم کی مدد دینے کو تیار ہوں۔ میں نے اُن سے سابرمتی آشرم میں عام جلسہ کرنے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۳ اپریل کو اتوار کے دن جلسہ ہوا۔ اُسی روز یا اُس کے دوسرے دن مارشل لا اُٹھا لیا گیا۔ میں نے جلسے میں لوگوں کو اُن کے جرم کا احساس دلایا اور کہا کہ میں اس جرم کے کفارے میں تین دن اُپاس کروں گا۔ آپ لوگ بھی اُپاس کریں اور آپ میں سے جن لوگوں نے تشدد کی حرکتیں کی ہیں وہ اپنے جرم کا اقرار کر لیں۔

مجھے اپنے فرض کا پورا احساس تھا۔ یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ اُنھیں مزدوروں نے جن کے ساتھ میں بہت دن رہا تھا، اور جن سے مجھے بہت اُمیدیں تھیں اس بلوے میں حصہ لیا۔ میں بھی اپنے آپ کو ان کا شریکِ جرم سمجھتا تھا۔

جس طرح میں نے لوگوں کو نصیحت کی تھی کہ اپنے جرم کا اقرار لیں اسی طرح حکومت کو

مشورہ دیا کہ ان کے جرم سے درگذر کرے۔ مگر فریقین میں سے کسی نے میری صلاح نہ مانی۔

سر رامنی بھائی آنجہانی اور احمد آباد کے دوسرے معززین نے آکر مجھ سے کہا کہ ستیاگرہ کو ملتوی کر دو۔ ان کے کہنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں خود ہی ارادہ کر چکا تھا کہ اس وقت تک ستیاگرہ موقوف رکھوں گا جب تک لوگ امن کا سبق نہ سیکھ لیں۔ یہ سب دوست خوش خوش واپس گئے۔

مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں میرے اس فیصلے سے تکلیف ہوئی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر میں ہر جگہ امن کی توقع رکھوں اور ستیاگرہ کو اس پر مشروط کر دوں تو پھر عام ستیاگرہ کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ ان کی رائے کی مخالفت کرنا پڑی۔ میں نے کہا اگر وہ لوگ جن کے ساتھ میں کام کرتا ہوں اور جن سے میں عدم تشدد اور بلاکشی کی توقع رکھتا ہوں تشدد سے باز نہ رہ سکیں تو واقعی ستیاگرہ کا چلانا ناممکن ہے۔ میرا محکم عقیدہ تھا کہ جو لوگ عوام سے ستیاگرہ کرانا چاہتے ہیں انھیں ان پر اتنا قابو ہونا چاہئے کہ انھیں مقررہ حد تک عدم تشدد کا پابند رکھ سکیں۔ اسی عقیدے پر میں آج بھی قائم ہوں۔

تینتیسواں باب

میری ہمالیہ برابر غلطی

احمد آباد کے جلسے کے بعد میں سیدھا ندیاد گیا۔ وہیں میں نے اپنی تقریر میں "ہمالیہ برابر غلطی" کا فقرہ استعمال کیا جو آگے چل کر اس قدر مشہور ہوا۔ مجھے احمد آباد ہی میں اپنی غلطی کا کچھ دھندلا سا احساس ہونے لگا تھا مگر جب ندیاد پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی اور کھیدا ضلعے کے ہزاروں آدمیوں کی گرفتاری کی خبر سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے کھیدا اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو قبل از وقت ستیا گرہ کی دعوت دینے میں بڑی سخت غلطی کی۔ میں نے عام جلسے میں اس کا اعتراف کیا۔ اس پر میرا خوب مضحکہ اڑایا گیا۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ جب تک انسان اپنی غلطیوں کو بڑھا کر اور دوسروں کی غلطیوں کو گھٹا کر نہ دیکھے اُسے دونوں میں صحیح تناسب کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور میرے نزدیک ہر ستیا گرہی کو اس اصول پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔

آیئے اب ذرا یہ دیکھیں کہ اس ہمالیہ برابر غلطی کی حقیقت کیا ہے۔ انسان سول نافرمانی کے قابل تبھی ہوتا ہے جب وہ ادب اور خلوص سے سلطنت کے قوانین کی اطاعت کر چکا ہو۔ ہم زیادہ تر قانون کی پابندی سزا کے خوف سے کرتے ہیں خصوصاً ان ضابطوں کی جن کی بنا کسی اخلاقی اصول پر نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک ایماندار اور شریف آدمی کبھی چوری کا مرتکب نہیں ہوتا خواہ سزا کا خوف ہو یا نہ ہو۔ مگر یہی شخص بے تکلف اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کی رُو سے اندھیرا ہو جانے کے بعد بائسکل بغیر لیمپ کے نہیں چلانا چاہیئے، اور اُسے ذرا بھی ندامت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی سمجھائے کہ اس معاملے میں احتیاط

کیا کرو، تو برا مانتا ہے۔ ہاں اگر یہ خوف ہو کہ میں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جاؤں گا تو وہ چار و ناچار ایسے ضابطوں کی پابندی کرتا ہے۔ اس قسم کی پابندی اُس کامل اطاعت کے حکم میں نہیں آتی جو ستیا گرہی سے مطلوب ہے۔ ستیا گرہی اجتماعی قوانین کی پابندی سمجھ بوجھ کر اور دل سے کرتا ہے کیونکہ وہ لسے اپنا پاک فرض سمجھتا ہے۔ جو شخص اس قدر سختی سے اجتماعی قوانین کی پابندی کر چکا ہو وہی یہ فیصلہ کرنے کا اہل ہے کہ کون قاعدے اچھے اور منصفانہ ہیں اور کون بُرے اور غیر منصفانہ۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ معینہ صورتوں میں بعض مخصوص قوانین کی نافرمانی کرے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اس ضروری شرط کا خیال نہیں رکھا۔ میں نے لوگوں کو سول نافرمانی کی دعوت دیدی حالانکہ وہ ابھی تک اس کے اہل نہ تھے۔ یہی خطا مجھے ہمالیہ کے برابر معلوم ہوئی۔ جیسے ہی میں کھیدا ضلعے میں داخل ہوا ہوں وہاں کی پُرانی ستیا گرہ کے واقعات میری نظروں میں پھر گئے اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوا کہ ایسی کھلی ہوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہرحال اب مجھے یہ اچھی طرح محسوس ہوا کہ جب تک لوگ سول نافرمانی کی باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوں وہ اسے برتنے کے قابل نہیں ہوتے۔

یہاں اس اعتراض کی گنجائش ہے کہ جب ہماری قوم اور بہت سی قوموں کی طرح قانون کا حکم ٹالنے کی عادی ہے اس سے یہ توقع کیوں کر ہو سکتی ہے کہ دفعۃً سول نافرمانی کے اصلی اصول کو سمجھ جائیگی اور اس کے حدود سے باہر قدم نہ رکھے گی؟

اس میں شک نہیں کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے گروہ کے لئے ان شرائط کی پوری پوری پابندی ناممکن ہے۔ اسی لئے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عام سول نافرمانی شروع کرنے سے پہلے آزمائے ہوئے پاک نفس رضا کاروں کی ایک جماعت تیار کیجائے جو ستیا گرہ کے اصولوں کو کماحقہٗ سمجھتی ہو۔ یہ رضا کار عوام کو ان اصولوں کی تعلیم دیں اور ہر وقت چوکس رہیں کہ لوگ راہ راست سے ہٹنے نہ پائیں۔

انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا میں بمبئی پہنچا۔ یہاں میں نے ستیا گرہ سبھا کے ذریعے

سے رضاکار بھرتی کئے اور ان کی مدد سے لوگوں کو ستیاگرہ کے اصول سمجھانا شروع کیا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اس مضمون پر چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر لوگوں کو تقسیم کئے جاتے تھے۔

اس کام کے دوران میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ لوگوں کو باامن ستیاگرہ کا شوق دلانا بہت مشکل ہے۔ رضاکار بہت کم ملے۔ جو ملے بھی ان میں اکثر ایسے تھے جو باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کی زحمت نہیں اُٹھاتے تھے۔ نئے رنگروٹوں کی تعداد روز بروز کم ہونے لگی۔ مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ سول نافرمانی کی تربیت کے کامیاب ہونے میں میری توقع سے کہیں زیادہ دیر لگے گی۔

چونتیسواں باب

"نوجیون" اور "ینگ انڈیا"

ادھر عدم تشدد کی تحریک آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی اور اُدھر حکومت کے جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ خصوصاً پنجاب میں تو اس نے ظاہرداری کا پردہ بھی اُٹھا دیا تھا۔ لیڈر قید میں تھے، فوجی قانون (مارشل لا)، جو محض نام کو قانون ہے، جاری تھا، غیر معمولی عدالتیں قائم تھیں۔ ان عدالتوں کو عدل و انصاف سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ وہ ایک مطلق العنان حاکم کے استبداد کا آلۂ کار تھیں۔ بغیر کافی شہادت کے سزائیں دی جا رہی تھیں اور انصاف کا خون ہو رہا تھا۔ امرتسر میں بےگناہ مرد اور عورتیں کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کی جا رہی تھیں۔ اس ذلت کے آگے میری نظروں میں، جلیانوالہ باغ کا قتل عام جس نے سارے ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو پنجاب کی طرف متوجہ کر دیا، کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

ایسی صورت میں میرا پنجاب جانا بہت ضروری تھا۔ میں نے وائسرائے سے خط لکھکر اجازت مانگی، تار بھی دیا، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں بغیر اجازت کے جاؤں گا تو حکومت مجھے پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے سے روک دے گی اور مجھے مجبوراً سول نافرمانی کرنا پڑے گی۔ اس وقت میں عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔ سول نافرمانی کے لئے امن و امان کی فضا ضروری ہے مگر یہاں یہ صورت تھی کہ حکومت کے مظالم پنجاب نے لوگوں کے دل میں غصے کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ ایسی حالت میں میرے نزدیک داخلۂ پنجاب کے حکم کی خلاف ورزی کرنا سول نافرمانی کے اصول کے خلاف تھا۔ اگر مجھے سول نافرمانی کا موقع بھی ملتا تو یہ خوف تھا کہ لوگوں کا اشتعال اور بڑھ جائے گا۔ اس لئے باوجود اسکے

کہ میرے دوست مجھے پنجاب جانے کی رائے دے رہے تھے میں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔
یہ میرے لئے زہر کا گھونٹ تھا مگر مجبوراً پینا پڑا۔ پنجاب سے روز نئے ظلم و جور کی خبریں
آتی تھیں اور میں بے بسی میں تلملا کر رہ جاتا تھا۔

اسی زمانے میں حکومت نے دفعتہً مسٹر ہارنیمن کو، جن کی ادارت میں "بمبئی کرانیکل"
نے بڑا زبردست اثر پیدا کر لیا تھا، ملک بدر کر دیا۔ حکومت کا یہ فعل میرے نزدیک اس قدر
مکروہ تھا کہ مجھے آج تک اس کے خیال سے گھن آتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مسٹر ہارنیمن
شورش اور فساد کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ پر اعتراض کیا تھا کہ آپ کو ستیاگرہ کمیٹی
کی اجازت کے بغیر حکومت پنجاب کے امتناعی حکم کی خلاف ورزی کا کیا حق تھا اور جب میں
نے سول نافرمانی کو روکا تو انہوں نے میری تائید کی تھی۔ بلکہ میرے اس فیصلے سے پہلے
انہوں نے مجھے خط لکھا تھا جس میں التوا کا مشورہ دیا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان کا خط
میرے فیصلے کے بعد پہنچا۔ غرض ان کے یکایک ملک بدر کر دئے جانے سے مجھے بے حد
تعجب اور صدمہ ہوا۔

جب بمبئی کرانیکل مسٹر ہارنیمن کی خدمات سے محروم ہو گیا تو اُس کے ڈائرکٹروں نے
مجھ سے کہا کہ آپ اس کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیجئے۔ بریلوی صاحب موجود ہی تھے
اس لئے میرا کام محض برائے نام تھا۔ پھر بھی میری طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اُس
ذمہ داری کے قبول کر لینے سے میری مصروفیت بہت بڑھ جاتی۔

مگر حکومت نے کرانیکل کو بند کرا کے مجھے اس مشکل سے بچا لیا۔

ان دنوں کرانیکل کا انتظام سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے ہاتھ میں تھا اور
"ینگ انڈیا" کو بھی وہی چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کرانیکل تو بند ہو گیا اب آپ
ینگ انڈیا کی ادارت قبول کر لیجئے اور کرانیکل کی کمی پوری کرنے کے لئے اسے ہفتہ وار
کی جگہ سہ روزہ کر دیجئے۔

میں خود ہی چاہتا تھا۔ مجھے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو ستیاگرہ کے حقیقی اصول سمجھاؤں اور مجھے اُمید تھی کہ اس اخبار کے ذریعے سے میں حکومت کو پنجاب کی داد رسی پر مجبور کر دوں گا۔ کیونکہ اسے خوب معلوم تھا کہ میری ہر تحریر ستیاگرہ کا پیش خیمہ ہوتی ہے چنانچہ میں نے ان دوستوں کی تجویز کو خوشی سے قبول کر لیا۔

مگر یہ بڑی مشکل تھی کہ انگریزی اخبار عام لوگوں کو ستیاگرہ کی تعلیم دینے کے لئے بیکار تھا۔ میرے کام کا خاص میدان گجرات تھا اس لئے مجھے ایک گجراتی اخبار کی ضرورت تھی۔ اُن دنوں اندولال جی یاجنک، سیٹھ عمر سوبانی اور شنکرلال بنکر کے حلقے میں شامل تھے۔ وہ اپنے دوستوں کی مالی امداد سے گجراتی میں ایک ماہوار رسالہ نوجیون نکال رہے تھے۔ ان دوستوں نے نوجیون میرے حوالے کر دیا اور اندولال جی میرے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس رسالے کو ہم نے ہفتہ وار اخبار کر دیا۔

اس عرصے میں کرانیکل پھر جاری ہو گیا۔ اس لئے ینگ انڈیا بدستور ہفتہ وار کر دیا گیا۔ دو ہفتہ وار اخبار دو مختلف مقامات سے نکالنے میں مجھے بڑی دقت تھی اور مصارف بھی زیادہ تھے۔ نوجیون احمد آباد سے نکلتا تھا میری درخواست پر ینگ انڈیا بھی احمد آباد منتقل کر دیا گیا۔

اس تبدیل مقام کی اور وجوہ بھی تھیں۔ مجھے انڈین اوپنین سے یہ تجربہ ہوا تھا کہ اس قسم کے اخباروں کے لئے اپنے مطبع کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اُس زمانے میں مطبع کا قانون اس قدر سخت تھا کہ اگر میں اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرنا چاہتا تو موجودہ مطبعے جو کاروباری اصول پر قائم کئے گئے تھے، ان کو شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ اس لئے اپنا مطبع قائم کرنا اور بھی ضروری تھا۔ ایسا مطبع قائم کرنے کے لئے احمد آباد ہی میں آسانی تھی۔ اس لئے ینگ انڈیا یہیں لانا پڑا۔

ان اخباروں کے ذریعے سے میں نے پڑھے لکھے لوگوں کو ستیاگرہ کی تعلیم دینے کی پوری کوشش شروع کر دی۔ ان دونوں اخباروں کے خریدار بہت بڑھ گئے اور

ایک زمانے میں ہر ایک کی اشاعت کم و بیش چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ مگر نوجیون کی اشاعت ایک دم سے بڑھی اور ینگ انڈیا کی آہستہ آہستہ۔ میرے قید ہونے کے بعد ان کے خریدار بہت کم ہو گئے اور اب آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں۔

میں نے شروع ہی سے یہ طے کر لیا کہ ان اخباروں میں اشتہار نہیں چھاپوں گا میرے خیال میں اس سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انھیں اپنی آزادیٔ رائے قائم رکھنے میں بہت مدد ملی۔

ان اخباروں سے مجھے بھی یہ ضمنی فائدہ ہوا کہ یہ ایک حد تک میرا سکون قلب قائم رکھنے کا باعث ہوئے۔ جب تک ستیاگرہ کا وقت نہیں آیا میں ان کے ذریعے سے اپنے خیالات آزادی سے ظاہر کرتا رہا اور لوگوں کو ہمت دلاتا رہا۔ اس طرح میرے خیال میں یہ دونوں اخبار آڑے وقت قوم کے کام آئے اور انھوں نے اپنی بساط بھر مارشل لا کے مظالم کو روکا۔

پینتیسواں باب

پنجاب میں

سر مائکل اوڈوائر نے مجھے پنجاب کے بلووں کا ذمہ دار ٹھہرایا اور چند غصہ ور نوجوان پنجابیوں نے مارشل لا کا الزام میرے سر رکھا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ اگر میں سول نافرمانی کو نہ روکتا تو جلیانوالہ کا قتل عام نہ ہوتا۔ بعض تو اتنے خفا تھے کہ انہوں نے مجھے دھمکایا کہ اگر تم نے پنجاب میں قدم رکھا تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔

مگر میرا یہ خیال تھا کہ میرا طرز عمل بالکل درست اور ناقابل اعتراض ہے اور کسی سمجھ دار آدمی کو اس کے متعلق غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

میں پنجاب جانے کے لئے بے چین تھا۔ مجھے اس سے پہلے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لئے میرا اور بھی جی چاہتا تھا کہ وہاں جا کر اپنی آنکھ سے سب حالات دیکھوں۔ ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر کچلو اور پنڈت رام بھج دت چودھری، جنہوں نے مجھے پنجاب بلایا تھا، قید ہو چکے تھے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ حکومت ان لوگوں کو اور ان کے ساتھیوں کو زیادہ دن تک قید نہیں رکھ سکتی۔ جب کبھی میں بمبئی جاتا تھا بہت سے پنجابی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ میں ایسے موقعوں پر ایک آدھ ہمت افزائی کا کلمہ کہہ دیتا تھا جس سے انہیں تقویت ہو جاتی تھی۔ ان دنوں مجھے اپنے اوپر اس قدر بھروسا تھا کہ جس سے ملتا تھا اسے گرما دیتا تھا۔

لیکن مجھے پنجاب جانے کا ارادہ بار بار ملتوی کرنا پڑا۔ جب کبھی میں نے وائسرائے سے اجازت مانگی انہوں نے یہی جواب دیا "ابھی نہیں"۔ اسی طرح بات ٹلتی رہی۔

اسی زمانے میں اعلان ہوا کہ ہنٹر کمیٹی اس کی تحقیقات کرے گی کہ مارشل لا کے زمانے

ہیں حکومت پنجاب کا طرز عمل کہاں تک جائز تھا۔ مسٹر سی۔ الف۔ اینڈ ریوز پنجاب پہنچ گئے تھے۔ ان کے خطوں میں جو جانگداز حالات لکھے تھے انھیں پڑھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مارشل لا کے مظالم کی اصلیت اُن خبروں سے کہیں زیادہ ہے جو اخباروں میں آئی تھیں۔ میں نے پھر وائسرائے کو تار دے کر پنجاب جانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ فلاں تاریخ کے بعد جا سکتے ہیں۔ مجھے وہ تاریخ ٹھیک یاد نہیں شائد ۱۷، اکتوبر تھی۔

لاہور پہنچ کر میں نے جو منظر دیکھا وہ ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گا۔ اسٹیشن پر آدمیوں کا سمندر اُمڈ آیا تھا۔ شہر کے سارے باشندے اس اشتیاق اور بے تابی سے گھروں سے نکل پڑے تھے جیسے کسی مدتوں کے بچھڑے عزیز سے ملنے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھئے خوشی سے دیوانہ تھا۔ میں پنڈت رام بھج دت کے بنگلے میں ٹھہرایا گیا اور میری مہانداری کی زحمت سارلا دیوی چودھرانی کے حصے میں آئی۔ یہ زحمت کوئی معمولی زحمت نہ تھی کیونکہ پہلے بھی یہی صورت تھی جواب ہے کہ جس گھر میں میں ٹھہرتا ہوں وہ کارروان سرائے بن جاتا ہے۔

پنجاب کے بڑے لیڈر سب جیل میں تھے اس لئے اُن کی جگہ مالوی جی، موتی لال جی اور شردھانند جی کام کر رہے تھے اور یہی مناسب بھی تھا۔ مالوی جی اور شردھانند جی کو تو میں پہلے سے اچھی طرح جانتا تھا مگر موتی لال جی سے میرا یہ پہلا سابقہ تھا۔ یہ سب حضرات اور وہ مقامی لیڈر جو جیل جانے سے محروم رہ گئے تھے، مجھ سے اس طرح گھل مل گئے کہ مجھے اس صحبت میں مطلق اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

ہمارا یہ متفقہ فیصلہ کہ ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت نہ دی جائے قومی تاریخ کا جزو بن گیا ہے۔ جن وجوہ کی بنا پر ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا وہ اُسی زمانے میں شائع کر دی گئی تھیں یہاں اُنھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اتنے دن کے بعد غور کرنے پر بھی مجھے کمیٹی کے مقاطعے کا فیصلہ بالکل صحیح اور مناسب نظر آتا ہے۔

ہنٹر کمیٹی کے مقاطعے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کانگرس کی طرف سے ایک غیر سرکاری تحقیقاتی

کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور مالوی جی نے پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو سی۔آر داس آنجہانی، اسٹرایم۔آر۔جیکار، عباس طیب جی صاحب کو اور مجھے اس کمیٹی میں نامزد کیا۔ ہم لوگوں نے مختلف مقامات پر الگ الگ تحقیقات کی۔ کمیٹی کے سامنے جو شہادتیں پیش ہوئیں انھیں ترتیب دینا میرے ذمے رکھا گیا اور سب سے زیادہ مقامات پر تحقیقات کرنے کا شرف بھی مجھی کو حاصل ہوا اس لئے مجھے پنجاب کے لوگوں اور وہاں کے دیہات کی حالت کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

اپنی تحقیقات کے دوران میں مجھے پنجاب کی عورتوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئیں جیسے میرا ان کا برسوں ساتھ رہا ہو۔ میں جہاں کہیں جاتا تھا یہ دیویاں جوق جوق آتی تھیں اور میرے سامنے اپنے کاتے ہوئے سوت کا ڈھیر لگا دیتی تھیں۔ اس طرح مجھے اس تحقیقات کے دوران میں یہ بات معلوم ہوئی کہ پنجاب کھدر کے کام کا بہت بڑا مرکز بن سکتا ہے۔

لوگوں پر جو مظالم ہوئے تھے ان کی تحقیقات کے دوران میں حکومت کے جور و ظلم اور استبداد کے وہ قصے سننے میں آئے جن کا گمان بھی نہ تھا۔ انھیں سن کر مجھے جو اذیت ہوئی اسے میرا ہی دل جانتا ہے۔ مجھے یہ تعجب تھا، اور آج تک ہے، کہ جس صوبے نے جنگ کے زمانے میں حکومت برطانیہ کو سب سے زیادہ سپاہی دئے تھے اس نے ان وحشیانہ مظالم کو چپ چاپ کیونکر سہہ لیا۔

کمیٹی کی رپورٹ لکھنے کا کام بھی میرے ہی ذمے تھا۔ جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگوں پر کیا کیا ستم توڑے گئے وہ اس رپورٹ کا مطالعہ کریں۔ میں یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں اول سے آخر تک کہیں جان بوجھ کر مبالغہ نہیں کیا گیا اور جو کچھ لکھا گیا کافی شہادت کی بنا پر لکھا گیا۔ جتنی شہادتیں شائع کی گئیں وہ ان کا عشر عشیر بھی نہیں جو کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی تھیں۔ جس بیان کے متعلق ذرا سا بھی شبہ تھا وہ رپورٹ میں نہیں

آنے دیا گیا۔ اس رپورٹ سے جو محض احقاق حق کے لئے لکھی گئی ہے پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت اپنی قوت قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کر گزرتی ہے اور کیسی کیسی انسانیت سوز اور وحشیانہ حرکتوں کی مرتکب ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس رپورٹ کا ایک فقرہ بھی غلط ثابت نہیں کیا جا سکا۔

چھتیسواں باب

خلافت کے بدلے گئو رکھشا؟

پنجاب کی دردانگیز داستان کو میں یہیں چھوڑتا ہوں۔

کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائرشاہی کی تحقیقات ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی جو مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لئے دہلی میں ہو رہی تھی۔ اس دعوت نامے پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں سوامی شردھانند جی بھی شریک ہوں گے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے اور اس کا اجلاس نومبر میں قرار پایا تھا۔ اس کانفرنس کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا جو خلافت کے معاملے میں حکومت کی بدعہدی سے پیدا ہو گئی تھی اور یہ طے کرنا تھا کہ ہندو مسلمان جشن صلح میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ دعوت نامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئو رکھشا کے مسئلے پر بھی بحث ہوگی اور یہ اس کے طے کرنے کا بہترین موقع ہے۔ مجھے گئو رکھشا کا ذکر اس سلسلے میں پسند نہیں آیا۔ میں نے اس دعوت نامے کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ان دونوں کے متعلق بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجیے جیسے سودا چکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حسن و قبح پر الگ الگ غور کیجیے۔

یہ خیالات دل میں لئے ہوئے میں کانفرنس میں گیا۔ اس میں مجمع بہت کافی تھا مگر اتنا نہیں جتنا اس کے بعد کے جلسوں میں ہوا۔ میں نے اس مسئلے پر جس کا ذکر آ چکا ہے،

سوامی شردھانند جی آنجہانی سے گفتگو کی۔ انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجئے۔ میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کرلیا۔ کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے، اور اگر حکومت نے اس معاملے میں صریحی بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ انکے لئے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقعے پر گئو رکھشا کا مسئلہ بیچ میں لے آئیں اور صورت حال سے فائدہ اُٹھاکر مسلمانوں سے سودا چکائیں اور مسلمانوں کے لئے بھی اس شرط پر گاؤکشی بند کرنا نامناسب ہے کہ ہندو خلافت کے معاملے میں ان کا ساتھ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤکشی ترک کردیں۔ اُن کا یہ سلوک بہت خوشنما اور قابلِ تعریف ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر مسلمان گاؤکشی بند کرنا فرض ہمسائگی سمجھتے ہیں تو انھیں ہر حال میں بند کردینا چاہیے۔ چاہے ہندو خلافت کے مسئلے میں ان کا ساتھ دیں چاہے نہ دیں۔ ایسی صورت میں مناسب ہے کہ ان دونوں مسئلوں پر الگ الگ بحث کی جائے، اور یہ کانفرنس صرف خلافت کے مسئلے پر غور کرے۔ میرا یہ استدلال حاضرین کو پسند آیا اور گئو رکھشا کے سوال پر کانفرنس میں بحث نہیں ہوئی۔

لیکن اس کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا: "خواہ ہندو ہماری مدد کریں خواہ نہ کریں مسلمانوں کو اپنے برادرانِ وطن کے جذبات کا لحاظ کرکے گاؤکشی ترک کردینا چاہیے۔" اور ایک زمانے میں واقعی یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان گاؤکشی بالکل موقوف کردیں گے۔

بعض لوگوں کی تجویز تھی کہ پنجاب کا مسئلہ بھی خلافت کے ساتھ منسلک کردیا جائے۔ مگر میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے کہا پنجاب کا معاملہ مقامی ہے اس لئے اس کا فیصلہ کرنے میں کہ جشنِ صلح میں شرکت کی جائے یا نہ کی جائے، اس کو مدنظر رکھنا مناسب نہیں۔ یہ خلاف

مصلحت ہے کہ مقامی معاملات کو مسئلہ خلافت کے ساتھ، جو براہِ راست شرائطِ صلح سے تعلق رکھتا ہے، مخلوط کر دیں۔ اسے بھی لوگوں نے مان لیا۔

مولانا حسرت موہانی اس جلسے میں موجود تھے۔ میں انھیں پہلے سے جانتا تھا مگر یہ اس کانفرنس میں معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لڑنے والے ہیں۔ مجھ میں اور ان میں ابتدا سے اختلافِ رائے تھا اور بعض مسئلوں میں اب تک ہے۔

منجملہ اور بہت سے رزولیوشنوں کے جو کانفرنس میں پاس ہوئے ایک یہ بھی تھا کہ ہندو اور مسلمان سودیشی چیزوں کے استعمال کا عہد کریں اور اس بنا پر بدیشی چیزوں کا مقاطعہ کریں۔ کھدر کی ابھی تک اتنی قدر نہ تھی جتنا ہونا چاہئے تھی۔ یہ رزولیوشن حسرت صاحب کے مذاق کا نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر خلافت کے معاملے میں سلطنتِ برطانیہ انصاف نہ کرے تو اُس سے اس کا بدلہ لیا جائے۔ اس لئے انھوں نے اس کے مقابلے میں یہ تجویز پیش کی کہ جہاں تک ممکن ہو صرف برطانوی چیزوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ میں نے اصولی اور عملی نقطہ نظر سے اس تجویز کی مخالفت کی اور انھیں دلیلوں سے کام لیا جن سے اب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔

میں نے کانفرنس کے سامنے اپنا عدم تشدد کا اصول بھی پیش کیا۔ میں نے دیکھا کہ حاضرین پر میری دلیلوں کا بہت اثر ہوا۔ مجھ سے پہلے حسرت صاحب کی تقریر پر اس قدر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے تھے کہ مجھے خوف تھا کہ میری بات کوئی نہیں سنے گا۔ میں نے محض اس خیال سے زبان کھولنے کی جرأت کی کہ اگر میں اپنے خیالات کانفرنس کے سامنے پیش نہ کروں تو یہ ادائے فرض میں کوتاہی ہوگی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور خوشی ہوئی کہ حاضرین نے میری تقریر بہت توجہ سے سنی اور جو لوگ پلیٹ فارم پر تھے انھوں نے یکے بعد دیگرے میری تائید میں تقریریں کیں۔ لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ برطانوی چیزوں کا مقاطعہ چلنے والا نہیں۔ اس کی کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ مفت میں جگ ہنسائی ہوگی۔ اُس مجمع میں شاید ہی کوئی شخص ہو جس کے جسم پر برطانوی ساخت کی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اس لئے اکثر

حاضرین کو یہ محسوس ہوا کہ ایسا رزولیوشن پاس کرنے سے، جس کی تعمیل خود ووٹ دینے والوں کے لیے ناممکن تھی، سراسر نقصان ہوگا۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں کہا "محض بدیشی کپڑے کا مقاطعہ ہمارے لئے کافی نہیں۔ خدا جانے کب وہ دن آئے کہ سودیشی کپڑا کافی مقدار میں تیار ہو سکے اور بدیشی کپڑے کا مقاطعہ پوری طرح کامیاب ہو۔ ہمیں تو کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کا برطانیہ والوں پر فوراً اثر پڑے۔ آپ شوق سے بدیشی کپڑے کا مقاطعہ کیجئے۔ ہمیں اس پر کوئی عذر نہیں۔ مگر اسکے علاوہ کوئی ایسی تجویز بھی ہونا چاہیے جس پر فوراً عمل ہو سکے۔"

جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعی ہمیں بدیشی کپڑے کے مقاطعے کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ بدیشی کپڑے کا فوری مقاطعہ ناممکن ہے۔ اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر ہم چاہیں تو اپنی ضروریات کے لئے کافی کھدر تیار کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت مجھ پر آگے چل کر کھلی۔ مگر اتنا میں جانتا تھا کہ اگر ہم بدیشی کپڑے کے مقاطعے میں محض ملوں کے پابند رہیں تو دھوکا کھائیں گے۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ مولانا کی تقریر ختم ہوگئی۔

میرے لئے یہ بڑی مشکل تھی کہ میں اپنا مطلب ہندی یا اُردو کے مناسب الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسے مجمعے میں، جو زیادہ تر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھا، مدلل تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں نے کلکتے کی مسلم لیگ میں اردو میں تقریر کی تھی۔ مگر وہاں تو صرف چند الفاظ میں اپنے محبت اور خلوص کا اظہار کر دیا تھا۔ یہاں صورت دوسری تھی۔ یہاں مجھے ایسے مجمع کو اپنا زاویہ نظر سمجھانا اور اپنا ہم خیال بنانا تھا جس سے مخالفت نہیں تو تنقید کا اندیشہ ضرور تھا مگر میں نے دل میں سوچا کہ جھینپنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں یہاں اسلئے نہیں آیا ہوں کہ دلی کے مسلمانوں کی فصیح اور شستہ اردو میں تقریر کردوں بلکہ اس لئے کہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اپنے خیالات ظاہر کر دوں۔ چنانچہ میں نے یہی کوشش کی اور اس میں مجھے

کامیابی ہوئی۔ مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ ہندی آردو ہندوستان کی عام زبان بن سکتی ہے۔ اگر میں انگریزی میں تقریر کرتا تو حاضرین پر اتنا اثر کبھی نہ ہوتا اور مولانا کو چیلنج دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ یا وہ چیلنج دیتے تو میں اس کا موثر جواب نہ دے سکتا۔

میرے ذہن میں جو نیا خیال تھا اُسے ظاہر کرنے کے لئے مجھے کوئی مناسب ہندی یا اردو لفظ نہیں ملتا تھا۔ اس سے میں ذرا گھبرایا۔ مگر آخر میں نے اسے انگریزی لفظ "نان کو آپریشن"[۱] کے ذریعے سے ادا کر دیا۔ یہ لفظ میں نے پہلی بار اس جلسے میں استعمال کیا۔ مولانا کی تقریر کے دوران میں مجھے یہ خیال آیا کہ جس حکومت کے ساتھ یہ بہت سی باتوں میں اتحادِ عمل کر رہے ہیں اس کا مقابلہ کرنے کی ان کے لئے ایک ہی صورت ہے یعنی ہتھیاروں سے کام لینا اور وہ نامناسب یا ناقابلِ عمل ہے۔ پھر مقابلے کا خیال ہی فضول ہے۔ مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح کہ حکومت سے اتحادِ عمل ترک کر دیا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے "نان کو آپریشن" کا لفظ سوجھا۔ اس وقت اس تجویز کے کل پہلو میرے پیشِ نظر نہ تھے اس لئے میں نے اس کے بیان کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا۔ میں نے اس کے متعلق صرف یہ الفاظ کہے:

"آپ حضرات نے ایک نہایت اہم رزولیوشن پاس کیا ہے کہ اگر خدانخواستہ صلح کے شرائط آپ کے خلاف ہوئے تو آپ حکومت سے اتحادِ عمل ترک کر دیں گے۔ میرے نزدیک یہ ہر قوم کا خداداد حق ہے کہ وہ ایسی صورت میں حکومت کے ساتھ اتحادِ عمل کرنے سے انکار کر دے، اگر حکومت ہمارے ساتھ خلافت کے مہتم بالشان مسئلے میں عہد شکنی کرے تو ہمارے لئے بجز "نان کو آپریشن" کے کوئی چارہ نہیں۔ اور ہمارا یہ "نان کو آپریشن" بالکل جائز ہو گا۔"

لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ "نان کو آپریشن" کا لفظ سارے ملک میں رائج

---

[۱] ترکِ موالات

ہو جائے۔ اس میں کئی مہینے کی دیر تھی۔ اس وقت تو یہ کانفرنس رزولیوشنوں کے انبار میں دب کر رہ گیا۔ بلکہ ایک مہینے کے بعد خود میں نے امرتسر کانگریس میں "کوآپریشن" کے رزولیوشن کی تائید کی۔ میں سمجھتا تھا کہ حکومت ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔

سینتیسواں باب

امرتسر کانگریس

حکومت پنجاب اُن سیکڑوں پنجابیوں کو جنھیں مارشل لا کے زمانے میں برائے نام عدالتوں نے بے بنیاد شہادتوں پر جیل میں بھر دیا تھا کب تک اس قید فرنگ میں رکھ سکتی تھی۔ اُس کے اس صریح ظلم پر وہ شور احتجاج بلند ہوا کہ اسے مجبور ہو کر ان لوگوں کو رہا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ کانگریس کے اجلاس سے پہلے اور لالہ ہرکشن لال اور دوسرے لیڈر دوران اجلاس میں رہا کر دئے گئے۔ علی برادران جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے یہیں آئے۔ لوگ تھے کہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو جنہوں نے اپنی اعلیٰ درجے کی وکالت قربان کر کے پنجاب میں ڈیرہ ڈالا تھا کانگریس کے صدر تھے اور سوامی شردھانند جی آنجہانی مجلس استقبالیہ کے صدر۔

میں نے ابتک کانگریس میں صرف اتنا حصہ لیا تھا کہ سمندر پار کے ہندوستانیوں کے مطالبات پر ہندی میں ایک تقریر کر کے ہندی کی عملی حمایت کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد میں سمجھتا تھا کہ اس سال مجھ سے کوئی اور کام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ پہلے اکثر ہو چکا تھا دفعتہً مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا۔

اسی وقت شاہی اعلان نئی اصلاحات کے متعلق شائع ہوا تھا۔ ان اصلاحات سے میں خود پوری طرح مطمئن نہ تھا اور دوسرے تو انھیں بالکل قابل قبول نہیں سمجھتے تھے۔ مگر ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ گو یہ اصلاحات ناقص ہیں پھر بھی ہمیں منظور کر لینا چاہئے۔ مجھے شاہی اعلان کی زبان میں لارڈ سنہا کا قلم کارفرما نظر آتا تھا جس نے مایوسی کی تاریکی میں ایک اُمید

کا پر تو پیدا کر دیا تھا۔ مگر لوکمانیہ اور دیشبندھو چترنجن داس جیسے پختہ کار اسے فریب نظر سمجھتے تھے۔ مالوی جی غیر جانبدار تھے۔

پنڈت مالوی جی نے مجھے اپنے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ مجھے ہندو یونیورسٹی کے تاسیس[1] کے جلسے میں ان کے طرز زندگی کی سادگی کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوا تھا لیکن اس بار ان کے ساتھ رہ کر ان کے روزمرہ مشاغل کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا جس سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ان کے کمرے پر غریبوں کی سرائے کا دھوکا ہوتا تھا۔ لوگوں کے ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گذرنا دشوار تھا۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ وقت ناوقت جب چاہے پہنچ جائے اور جب تک چاہے ان سے باتیں کرے۔ اس جھونپڑے کے ایک کونے میں میری چارپائی اس منظر کی شان کو دوبالا کر رہی تھی۔

غرض مالوی جی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے ان سے روزمرہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور وہ برادرانہ شفقت سے مجھے مختلف پارٹیوں کا زاویۂ نظر سمجھایا کرتے تھے۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ریفارمس (اصلاحات) کے رزولیوشن کی بحث میں میرا شریک ہونا لازمی ہے۔ کانگریس کی طرف سے پنجاب کے مظالم کے متعلق جو رپورٹ لکھی گئی تھی اس کی ذمہ داری ایک حد تک مجھ پر بھی تھی۔ اس لئے مجھے یہ فکر تھی کہ اس معاملے کو انجام تک پہونچاؤں۔ پھر خلافت کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مسٹر مانٹیگو ہندوستان سے بے وفائی نہیں کریں گے اور اس کے حقوق کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ علی برادران اور دوسرے لیڈروں کی رہائی میرے نزدیک بہت اچھی علامت تھی۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر میری یہ رائے تھی کہ کانگریس کے لئے اصلاحات کا رد کرنا مناسب نہیں بلکہ اسے ان کی منظوری کا رزولیوشن پاس کرنا چاہئے۔ مگر دیشبندھو چترنجن داس اس پر اڑے ہوئے تھے کہ اصلاحات کو بالکل ناکافی

---

[1] foundation

اور ناقص قرار دے کر رد کر دینا چاہیے۔ لوکمانیہ تلک آنجہانی نے اس معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی تھی مگر یہ کہہ دیا تھا کہ جب رزولیوشن کو دیشبندھو پسند کریں گے اس کی میں تائید کروں گا۔

میرے لئے ان آزمودہ، سرد و گرم چشیدہ، محترم لیڈروں سے اختلاف رائے کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن میرا ضمیر مجھے اس پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ کانگریس سے بھاگ جاؤں۔ میں نے پنڈت مالوی جی اور موتی لال جی سے کہا کہ قومی مفاد کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں کانگریس کے بقیہ اجلاسوں سے غیر حاضر رہوں تاکہ مجھے ایسے محترم لیڈروں سے اختلاف کا اظہار نہ کرنا پڑے۔

مگر ان دونوں بزرگوں نے میری تجویز کو پسند نہیں کیا۔ کہیں لالہ ہرکشن لال کو میرے اس ارادے کی خبر ہو گئی۔ انھوں نے کہا "کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ اس سے پنجابیوں کے جذبات کو بہت سخت صدمہ پہنچے گا۔" میں نے لوکمانیہ، دیشبندھو اور مسٹر جناح سے گفتگو کی مگر اس مشکل کے حل کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ آخر میں نے مالوی جی سے اپنی پریشانی بیان کی۔ میں نے اُن سے کہا "مصالحت کا کوئی موقع نظر نہیں آتا۔ اگر میں نے رزولیوشن پیش کیا تو ووٹ لینا پڑیں گے اور اس کا یہاں کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ کانگریس کے عام جلسے میں اب تک یہ دستور رہا ہے کہ رائے لینے کے لئے ہاتھ اُٹھوائے جاتے ہیں اور اس میں نمائندوں اور تماشائیوں کی کوئی تفریق نہیں رہتی۔ اب رہا تحریری ووٹ لینا، اس کی اتنے بڑے مجمعے میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مگر لالہ ہرکشن لال نے اس مشکل میں میری دستگیری کی۔ انہوں نے کہا "جس دن اس رزولیوشن پر رائے لی جائے گی ہم تماشائیوں کو کانگریس کے پنڈال میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہا ووٹ جمع کرنا اسے میں دیکھ لوں گا۔ مگر آپ کو کانگریس سے غیر حاضر ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب میں رزولیوشن کا مسودہ تیار کر کے پیش کرنے کے لئے چلا تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مالوی جی اور مسٹر جناح میرے مؤید تھے۔ میں نے یہ دیکھا

کہ ہرچند ہمارے باہمی اختلافات میں کسی قسم کی تلخی نہیں تھی اور ہماری تقریریں محض نفسِ امر سے متعلق تھیں مگر لوگوں کو ہمارا یہ اختلاف ہی ناگوار تھا۔ ان کے چہروں سے دلی صدمے کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اتفاق رائے کے آرزومند تھے۔

ادھر تقریریں ہو رہی تھیں اور اُدھر اس اختلاف کو دور کرنے کی کوشش جاری تھی۔ لیڈر ایک دوسرے کو رقعے بھیج رہے تھے۔ مالوی جی انتہائی سرگرمی سے مصالحت کی سعی میں مصروف تھے۔ اتنے میں جیرام داس نے مجھے اپنی ترمیم دکھائی اور اپنے مخصوص دلکش انداز میں کہا کہ نمائندے عجب کشمکش میں پڑ گئے ہیں جیسے بنے انھیں اس مشکل سے بچائیے اور رائے شماری کی نوبت نہ آنے دیجئے۔ میں نے انکی ترمیم پڑھی اور وہ مجھے پسند آئی مالوی جی پہلے ہی چاروں طرف نظر دوڑا رہے تھے کہ شاید کہیں اُمید کی جھلک دکھائی دے۔ میں نے ان سے کہا کہ جیرام داس کی ترمیم دونوں پارٹیوں کے لیے قابل قبول ہے۔ اس کے بعد یہ ترمیم لوکمانیہ کو دکھائی گئی تو انھوں نے کہا "اگر داس منظور کرلیں تو مجھے کوئی عذر نہیں"۔ بڑی قیل وقال کے بعد دیشبندھو کچھ نرم پڑے اور انھوں نے بپن چندر پال جی کی طرف دیکھا۔

مالوی جی کا دل اُمید سے معمور ہوگیا۔ ابھی دیشبندھو نے پوری طرح رضامندی بھی ظاہر نہیں کی تھی کہ انھوں نے ترمیم کا مسودہ چھین لیا اور چلا اُٹھے "بھائیو، آپ یہ سن کر خوش ہونگے مصالحت ہوگئی"۔ اس کے بعد جو منظر دیکھنے میں آیا وہ بیان نہیں ہوسکتا۔ سارا پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا اور افسردہ چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔

یہاں ترمیم کا مضمون بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف یہ دکھانا تھا کہ میں نے ان تجربوں کے سلسلے میں جن کا اس کتاب میں ذکر ہے، یہ رزولیوشن کس طرح پیش کیا۔

اس مصالحت سے میری ذمہ داری اور بڑھ گئی۔

اڑتیسواں باب

کانگریس کے اندرونی حلقے میں

امرتسر کی کانگریس میں میں نے جو حصہ لیا اُسے میں اپنا باقاعدہ داخلہ کانگریس کی سیاست میں نہیں سمجھتا۔ اس سے پہلے کی کانگریسوں میں تو میں محض عہد وفاداری کی تجدید کی لئے شریک ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک معمولی سپاہی سمجھتا تھا اور اسی پر قانع تھا۔

امرتسر کے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بعض ایسے کاموں سے مناسبت ہے جو کانگریس کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوکمانیہ، دیشبندھو، پنڈت موتی لال جی اور دوسرے لیڈروں کو میری وہ خدمات جو میں نے مظالم پنجاب کی تحقیقات کے سلسلے میں انجام دی تھیں پسند آئیں۔ وہ مجھے اپنی خاص صحبتوں میں بلانے لگے جہاں سبجکٹ کمیٹی کے پیچیدہ مسئلے حل ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں صرف وہی لوگ بلائے جاتے تھے جن پر لیڈروں کو خاص طور سے اعتماد ہو اور جن سے انھیں کام لینا ہو۔ مگر کبھی کبھی ناخواندہ مہمان بھی آپہنچتے تھے۔

آیندہ سال کانگریس کے پیش نظر دو چیزیں ایسی تھیں جن سے مجھے مناسبت اور دلچسپی تھی۔ ان میں سے ایک جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی یادگار تھی۔ کانگریس نے بڑے جوش وخروش سے یہ رزولیوشن پاس کیا تھا کہ شہیدوں کی یادگار قائم کی جائے۔ اس کے لئے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرنا تھا۔ ٹرسٹیوں کی کمیٹی میں میرا نام بھی تھا۔ مالوی جی ان دنوں قومی فقیروں کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ میں بھی بھیک مانگنے میں اُن سے کم نہیں۔ جنوبی افریقہ میں مجھے اپنے اس کمال کا اندازہ ہو چکا تھا۔ مالوی جی کا جادو رئیسوں پر خوب چلتا تھا۔ والیان ملک سے شاہانہ عطیے وصول کرنے میں میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جلیانوالہ باغ کی

یادگار کے لئے رئیسوں سے چندہ مانگنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے، جیسا کہ میں سمجھتا تھا، اس چندے کی ذمہ داری زیادہ تر مجھ پر عائد کی گئی۔ بمبئی کے فیاض باشندوں نے میری جھولی بھری اور یادگار کے لئے معقول سرمایہ اکٹھا ہو گیا جو اب تک بنک میں جمع ہے۔ مگر آج ملک کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ جس زمین پر ہندو، مسلمان اور سکھ شہیدوں کے پاک خون کی آمیزش ہوئی تھی وہاں کس شکل میں یادگار تعمیر کی جائے۔ ان تینوں مذہبوں کے پیرو محبت اور اخلاص کے رشتوں کو توڑ کر باہمی جنگ میں مصروف ہیں اور قوم حیران ہے کہ یادگار کے سرمایہ کو کس کام میں صرف کرے۔

چندہ جمع کرنے کے علاوہ مجھ میں مسودے تیار کرنے کی صلاحیت تھی اور یہ بھی کانگریس کے کام آسکتی تھی۔ کانگریس کے لیڈروں نے دیکھا کہ مجھے مختصر اور جامع عبارت لکھنے کا ملکہ ہے۔ یہ بات میں نے مدت کی مشق میں حاصل کی تھی۔ کانگریس کا موجودہ دستور اساسی گوکھلے کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے چند قواعد قلمبند کر دئے گئے تھے جن کے مطابق کانگریس چل رہی تھی۔ ان قواعد کے مرتب کئے جانے کی دلچسپ داستان میں نے خود گوکھلے کی زبانی سنی تھی۔ مگر کانگریس کا کام روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ موجودہ قواعد اس کی رہنمائی کے لئے ناکافی ہیں۔ یہ مسئلہ کئی سال سے کانگریس میں پیش ہو رہا تھا۔ ان دنوں کانگریس کے پاس کوئی مستقل عملہ نہیں تھا جو سالانہ اجلاس کے بعد بھی کام کرتا رہے اور نئے سال کے دوران میں جو اتفاقی معاملے پیش آجائیں ان سے عہدہ برآ ہو سکے۔ موجودہ قواعد کی رو سے تین سکرٹیری منتخب ہوتے تھے مگر اصل میں صرف ایک شخص کام کرتا تھا اور وہ بھی اپنا پورا وقت نہیں دیتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اتنا کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں کہ کانگریس کے دفتر کو چلائے، اگلے اجلاس کی فکر کرے اور پچھلے اجلاس کے رزولیوشنوں کی تعمیل کرے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس سال یہ مسئلہ اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ کانگریس کے عام اجلاس میں وہ چپقلش ہوتی تھی کہ قومی معاملات پر بحث کرنا ناممکن تھا۔ نمائندوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ ہر صوبہ جتنے نمائندے چاہتا

بھیج دیتا۔ اس بے ترتیبی کو رفع کرنے کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جارہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ملک میں سب سے زیادہ اثر لوکمانیہ اور دیشبندھو کا ہے اس لئے میں نے یہ درخواست کی کہ یہ حضرات رائے عامہ کے نمائندوں کی حیثیت سے میرے ساتھ اُس کمیٹی میں کام کریں جو دستور اساسی کو ترتیب دینے کے لئے مقرر کی جارہی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ ان حضرات کو خود اس کام میں شریک ہونے کی فرصت نہیں اس لئے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ کمیٹی تین ممبروں پر مشتمل ہو جن میں سے دو ان دونوں صاحبوں کے معتمد ہوں اور ایک میں خود۔ اس تجویز کو لوکمانیہ اور دیشبندھو نے پسند کیا اور ان کی رائے سے کیلکر جی اور آئی۔ بی۔ سین بابو ان کے نمائندے مقرر کردیے گئے۔

اس کمیٹی کا جلسہ ایک بھی نہ ہو سکا۔ مگر ہم تینوں میں خط و کتابت کے ذریعے سے مشورہ ہوتا رہا اور آخر میں ہم نے متفقہ رپورٹ پیش کردی۔ مجھے ایک حد تک اس دستور اساسی کے بنانے پر ناز ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اس پر پوری طرح عمل ہو تو یہی ہمیں سوراج دلانے کے لئے کافی ہے جب سے میں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی اُس وقت سے میں واقعی کانگریس کی سیاست میں شریک ہوگیا۔

انتالیسواں باب

کھدر کی تحریک کا جنم

۱۹۰۸ء میں جب میں نے "ہند سوراج" میں کھدر کو ہندوستان کے روزافزوں افلاس کا علاج قرار دیا' اُس وقت تک مجھے کبھی چرخہ یا کرگھا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں میں نے یہ بات ایک بدیہی اصول کے طور پر پیش کی کہ جو چیز ہندوستانیوں کو افلاس کی چکی میں پسنے سے بچائے اُس نے گویا سوراج قائم کر دیا۔ ہندوستان کا افلاس دور ہوتے ہی سوراج خود بخود مل جائے گا۔ ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے واپسی تک مجھے چرخہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب سابرمتی میں ستیاگرہ آشرم قائم ہوا تو چند کرگھے بھی منگائے گئے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ہم سب وکیل مختار یا کاروباری لوگ تھے۔ ہم میں سے کوئی دستکار نہ تھا۔ ایک کاریگر کی ضرورت تھی جو ہمیں بننا سکھائے۔ اس کے بغیر کرگھے بیکار تھے۔ خدا خدا کر کے پالن پور سے ایک شخص لایا گیا۔ مگر اس نے بھی ہمیں اپنا ہنر پوری طرح نہیں بتایا۔ تاہم مگن لال گاندھی سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ انھیں دستکاری سے فطری مناسبت تھی اور انھوں نے تھوڑے ہی دن میں اس فن پر عبور حاصل کر لیا۔ آشرم میں یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں نے بنائی کا کام سیکھ لیا۔

ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم سب اپنے ہاتھوں سے تیار کئے ہوئے کپڑے پہنیں۔ اس لئے ہم نے مل کے بُنے ہوئے کپڑے پہننا چھوڑ دیا اور یہ عہد کر لیا کہ صرف ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑے پہنیں گے اور وہ بھی ہندوستان کے کتے ہوئے سوت کے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے ہمیں بہت سے نئے تجربے حاصل ہوئے۔ ہمیں جلاہوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور یہ معلوم

کرنے کا موقع ملا کہ ان کی زندگی کیونکر بسر ہوتی ہے، کارکردگی کتنی ہے، انھیں سوت ملنے میں کیا کیا دقتیں ہوتی ہیں، ان کے ساتھ کیسی کیسی دغا بازیاں کی جاتی ہیں، اور وہ کس طرح روز بروز قرض کے جال میں پھنستے جاتے ہیں۔ ہم فی الحال خود اتنا کپڑا نہیں بن سکتے تھے جتنا ہمیں درکار تھا۔ اس لئے سوائے اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ جُلاہوں سے کپڑا خریدیں۔ مگر ہندوستانی ملوں کے سوت سے تیار کیا ہوا کپڑا بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ یہ جلاہے جتنا باریک کپڑا بُنتے تھے سب باہر کے سوت سے کیونکہ ہندوستانی مل باریک سوت تیار نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی ہندوستان کے ملوں میں اوسط درجے کا باریک سوت بہت کم کاتا جاتا ہے اور زیادہ باریک سوت کاتنا تو ان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ بڑی مشکلوں سے چند جلاہے اس پر راضی ہوئے کہ ہمارے لئے سودیشی سوت کا کپڑا بُنیں اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ جتنا کپڑا تیار کریں آشرم سب خرید لے۔ غرض ہم لوگوں نے خود بھی مل کے سوت کا کپڑا پہننا شروع کیا اور اپنے دوستوں میں بھی اس کا پرچار کیا۔ اس طرح ہم کتائی کا کام کرنے والے ہندوستانی ملوں کے رضاکار ایجنٹ بن گئے۔ اس ذریعے سے ہمیں ملوں کے انتظامات اور ان کی دقتوں سے بھی واقفیت ہو گئی۔ ہم نے دیکھا کہ ان ملوں کا مقصد یہ ہے کہ جتنا سوت کاتیں اُسے خود ہی بُنا بھی کریں۔ وہ اپنی خوشی سے جلاہوں سے اتحادِ عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ مجبوری سے، اور یہ تعلق محض عارضی ہے۔ ہمیں یہ فکر پیدا ہوئی کہ ہم اپنے لئے خود سوت کاتا کریں کیونکہ بغیر اس کے ہم ملوں کے محتاج رہیں گے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہم ملوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔

اب ہمیں پہلے سے بھی زیادہ مشکلوں کا سامنا ہوا۔ نہ کہیں چرخہ دستیاب ہوتا تھا اور نہ کوئی کاتنے والا ملتا تھا جو ہمیں کاتنا سکھائے۔ آشرم میں چند چرخے تھے جن سے ہم گلڑیوں پہ سوت چڑھاتے تھے مگر ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ ان سے سوت بھی کاتا جا سکتا ہے۔ ایک بار کالیداس جوہری کو ایک عورت ملی جو بقول اُن کے کاتنا سکھانے کے لئے تیار تھی۔ آشرم کا ایک

طالب علم جسے نئی چیزیں سیکھنے سے خاص مناسبت تھی اس عورت کے پاس بھیجا گیا۔ مگر وہ بھی اس راز کو معلوم کئے بغیر لوٹ آیا۔

غرض اسی طرح وقت گذرتا رہا اور ہماری بے صبری بڑھتی گئی۔ آشرم کے آنے جانے والوں میں جس شخص کی نسبت یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ کتائی سے واقف ہو اُس سے میں اس فن کے متعلق سیکڑوں سوال کر ڈالتا تھا۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ یہ فن عورتوں تک محدود ہے اور ان میں بھی قریب قریب معدوم ہو چکا ہے۔ جو اکا دکا کاتنے والیاں رہ گئی ہیں ان کا پتہ کسی عورت ہی سے چلے گا۔

۱۹۱۷ء میں میرے گجراتی دوستوں نے مجھے بڑوچ کی تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لئے مدعو کیا۔ وہاں گنگابہن موزمدار سے ملاقات ہوئی۔ ان خاتون کی ذات عجیب و غریب صفات کا مجموعہ تھی۔ یہ ایک بیوہ عورت تھیں مگر ان کا حوصلہ دیکھ کر مردوں کو رشک آتا تھا۔ وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر ہمت و جرأت اور سمجھ بوجھ میں عام تعلیم یافتہ عورتیں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے چھوت چھات کا تعصب دل سے نکال دیا تھا اور بے تکلف اچھوتوں سے ملتی جلتی اور اُن کی خدمت کرتی تھیں۔ وہ اپنے گھر سے خوش تھیں مگر ان کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ان کا جسم خاصا مضبوط تھا اور جہاں چاہتی تھیں اکیلی چلی جاتی تھیں۔ انھیں گھوڑے کی سواری کی خاصی مشق تھی۔ مجھے اُن سے گودھرا کی کانفرنس میں زیادہ تفصیل سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ میں نے انھیں بھی اپنا چرخے کا دکھڑا کہہ سنایا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ چرخے کی تلاش میں دل و جان سے کوشش کروں گی۔ اس سے میرے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

چالیسواں باب

مل گیا!

گنگا بہن نے چرخے کی تلاش میں تمام گجرات چھان مارا اور آخر اُسے ویجاپور (ریاست بڑودہ) میں ڈھونڈھ نکالا۔ وہاں اکثر لوگوں کے گھروں میں چرخے تھے مگر مدت ہوئی انہوں نے بیکار سمجھ کر کباڑ کوٹھری میں ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے کہا اگر ہمیں پونیاں ملتی رہیں اور کوئی سوت خرید لیا کرے تو ہم پھر چرخا کاتنا شروع کر دیں۔ گنگا بہن نے یہ خوشخبری مجھے سنائی۔ پونیوں کا انتظام کرنا ہمارے لیئے دشوار تھا۔ عمر سوبانی مرحوم سے اس کا ذکر آیا تو انہوں نے فوراً وعدہ کر لیا کہ جتنی پونیوں کی ضرورت ہوگی اپنے مل سے بھیجدیا کریں گے۔ یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ عمر سوبانی کے یہاں سے جو پونیاں آتی تھیں وہ میں گنگا بہن کو بھیجدیا کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں اتنا سوت آنے لگا کہ ہمیں بننا مشکل ہوگیا۔

سیٹھ عمر سوبانی دریا دل آدمی تھے مگر آخر ہم کب تک اُن کی فیاضی سے فائدہ اُٹھاتے۔ مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہم اُن سے پونیاں لیتے چلے جائیں۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک مل کی پونیاں استعمال کرنا اصولاً ناجائز تھا۔ کیونکہ مل کی پونیوں سے کام لینا ایسا ہی تھا جیسا مل کا کتا ہوا سوت استعمال کرنا۔ میں نے سوچا کہ آخر پرانے زمانے میں لوگ چرخا کاتتے تھے تو پونیاں کہاں سے آتی تھیں؟ کیا وہ بھی ملوں سے لیا کرتے تھے؟

ان خیالات کی بنا پر میں نے گنگا بہن سے کہا کہ دھنیے تلاش کیجیے جو پونیاں بنا کر دیا کریں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا یہ کونسی بڑی بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دھنیا پینتیس روپیے مہینے پر رکھ لیا اور کئی لڑکوں کو پونیاں بنانا سکھا دیا۔ میں نے بمبئی میں

روئی کی بھیک مانگی۔ یشونت پرشاد دیسائی نے میری جھولی بھردی۔ گنگا بہن کا کام اُمید سے بڑھکر بر سبز ہوا۔ انہوں نے ویجاپور کے کتے ہوئے سوت کو بُننے کے لئے جُلاہے بھی ڈھونڈھ نکالے اور تھوڑے دن میں ویجاپور کا کھدر مشہور ہو گیا۔

اس عرصے میں آشرم میں بھی چرخا چلنے لگا۔ مگن لال گاندھی نے اپنی قوت اختراع سے کام لے کر چرخے میں بہت کچھ اصلاح کی اور چرخے اور ان کے کل لوازمات آشرم میں تیار ہونے لگے۔ کھدر کا پہلا تھان جو آشرم میں تیار ہوا اُس پر سترہ آنے فی گز لاگت آئی۔ میں نے بلا تامل اپنے دوستوں سے اصرار کیا کہ یہ موٹا بھدا کپڑا ان داموں خریدیں۔ انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔

میں بمبئی میں بستر علالت پر پڑا ہوا تھا مگر اتنی طاقت تھی کہ چرخے کی تلاش جاری رکھوں۔ آخر مجھے دو کاتنے والیاں مل گئیں۔ وہ مجھ سے اٹھائیس تولے سوت کا ایک روپیہ لیتی تھیں۔ میں ان دنوں کھدر کے کاروباری پہلو سے ناواقف تھا۔ ہاتھ کا کتا سوت میرے نزدیک کسی طرح مول مہنگا نہ تھا۔ اُن کی شرح کا مقابلہ ویجاپور کی شرح سے کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھے ٹھگ رہی ہیں۔ میں نے اُنھیں بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح کمی پر راضی نہ ہوئیں۔ اس لئے مجبوراً انہیں رخصت کرنا پڑا۔ مگر اُن سے جو کام لینا تھا وہ لیا جا چکا تھا۔ اونتکا بائی، رامی بائی کامدار، شنکر لال بینکر کی والدہ اور واسومتی بہن نے اُن سے چرخا کاتنا سیکھ لیا تھا۔ میرے کمرے میں چرخا چلنے لگا اور میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اُس کے جانفزا نغمے نے میری شفایابی میں بہت مدد دی۔ میں مانتا ہوں کہ اس کا اثر جسمانی نہیں بلکہ نفسیاتی تھا۔ مگر اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی جسمانی حالت بڑی حد تک اس کی نفسی کیفیت کے تابع ہے۔ میں نے بھی چرخا کاتنا چاہا مگر اُس وقت کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

بمبئی میں بھر وہی پونیوں کی دقت پیش آئی۔ ریوا شنکر جی کے مکان کے قریب سے ایک دھنیا روز اپنی دُھنکی بجاتا گذرا کرتا تھا۔ میں نے اُسے بلوایا تو معلوم ہوا کہ تو شکوں

میں بھرنے کے لیئے روئی دھنکتا ہے۔ وہ پونیوں کے لئے روئی دھنکنے پر راضی ہوگیا مگر اُس نے دام بہت مانگے اور مجھے دینا پڑے ۔ میں یہ کتا ہوا سوت بعض ویشنو دوستوں کو دیدیا کرتا تھا کہ وہ پوترا اکادشی کے تہوار کے لیئے اس کے ہار بنوالیں ۔شیو جی نے بمبئی میں کتائی کا ایک کلاس بھی کھول دیا ۔ ان سب تجربوں میں خرچ بہت ہو جاتا تھا مگر وطن پرست احباب جو کھدر پر عقیدہ رکھتے تھے خوشی سے یہ تمام مصارف برداشت کرتے تھے ۔میری ناقص رائے میں یہ روپیہ برباد نہیں ہوا۔ اس سے ہمیں بڑے قیمتی تجربے حاصل ہوئے اور یہ معلوم ہوا کہ چرخے کی کامیابی کے لیئے کتنا وسیع میدان ہے۔

اب مجھے یہ جوش اُٹھا کہ خالص کھدر کا لباس اختیار کروں ۔ ابھی تک میں مل کے سوت کی بنی ہوئی دھوتی باندھتا تھا۔ موٹا کھدر کا کپڑا جو آشرم میں یا دیجاپور میں بُنا جاتا تھا اُس کا عرض صرف ۳۰ انچ تھا۔ میں نے گنگا بہن سے کہہ دیا کہ اگر آپ نے مجھے ایک مہینے کے اندر پینتالیس انچ کے عرض کی دھوتی تیار کرا کر نہ دی تو میں اسی چھوٹے عرض کے کھدر کی دھوتی باندھنا شروع کردوں گا۔ وہ اس الٹیمیٹم سے بہت گھبرائیں مگر انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو میں چاہتا تھا ۔ ایک مہینے سے پہلے ہی انہوں نے ۴۵ انچ عرض کے کھدر کا دھوتیوں کا جوڑا بھیج دیا ۔

اُسی زمانے میں لکشمی داس جی، رام جی کولی اور ان کی بیوی گنگا بہن کو لاٹھی گاؤں سے آشرم میں لائے ۔ اب آشرم میں بھی دھوتی بُنی جانے لگی ۔ ان میاں بیوی کی بدولت کھدر کی ترقی میں بہت مدد ملی ۔ انہوں نے گجرات میں اور دوسرے مقامات پر بہت سے لوگوں کو ہاتھ کے کتے سوت کا کپڑا بُننا سکھادیا ۔ گنگا بہن کو کرگھے پر کام کرتے دیکھ کر دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ جب وہ بُننا شروع کرتی ہیں تو اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے انھیں خبر نہیں ہوتی اور ان کی نظر اپنے پیارے کرگھے سے نہیں ہٹتی ۔

اکتالیسواں باب

ایک سبق آموز مکالمہ

ملوں کے مالک پہلے ہی دن سے کھدر کی تحریک سے جو اُس زمانے میں سودیشی کی تحریک کہلاتی تھی، اختلاف رکھتے تھے۔ عمر سوبانی مرحوم جو خود اپنے مل بڑی قابلیت سے چلاتے تھے مجھے اپنی معلومات اور تجربے سے مدد دیا کرتے تھے اور دوسرے مل والوں کے خیالات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے استدلال کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے ملنے پر اصرار کیا۔ میں راضی ہو گیا۔ عمر سوبانی صاحب نے ہم دونوں کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ سیٹھ صاحب نے گفتگو ان الفاظ سے شروع کی "آپ کو معلوم ہے کہ پہلے بھی سودیشی کی جد و جہد ہو چکی ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں معلوم ہے۔"

"آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تقسیم بنگال کے زمانے میں ہم مل والوں نے سودیشی کی تحریک سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو خوب لوٹا جب یہ تحریک شباب پر پہنچی تو ہم نے کپڑے کی قیمت بڑھا دی اور اس سے بھی زیادہ شرمناک حرکتیں کیں۔"

"ہاں یہ میں سن چکا ہوں اور اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا۔"

"بیشک آپ کو رنج ہوا ہو گا لیکن میرے نزدیک اس میں رنج کی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنا کاروبار کچھ خلق خدا کی خدمت کے لئے تو نہیں چلاتے۔ ہمیں نفع کمانا ہے اور اپنے حصہ داروں کو خوش کرنا ہے۔ چیزوں کی قیمت اُن کی مانگ پر موقوف ہے۔ طلب اور رسد[1]

---

[1] Demand and supply

کے قانون کا عملدرآمد کون روک سکتا ہے؟ بنگالیوں کو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ ان کے ایجیٹیشن سے سودیشی کی مانگ بڑھے گی اور قیمتیں خود بخود چڑھ جائیں گی۔"

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا "بنگالی بھی میری طرح سادہ دل تھے۔ وہ اپنی خوش عقیدگی میں یہ سمجھتے تھے کہ ملوں کے مالک اتنے خود غرض اور بے حمیت بھی کیا ہوں گے کہ اپنے ملک کو وقت پر دھوکا دیں اور بے ایمانی سے بدیشی کپڑے کو سودیشی کہہ کر بیچیں۔"

انہوں نے جواب دیا "میں آپ کی سادہ دلی سے واقف ہوں۔ اسی لئے میں نے آپکو یہاں آنے کی زحمت دی۔ میں آپ کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ کہیں وہی غلطی نہ کیجیئے گا جو اُن بھولے بھالے بنگالیوں نے کی تھی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے منشی کو اشارہ کیا اور اُس نے اُن کے مِل کا بُنا ہوا کپڑا لا کر مجھے دکھایا۔ سیٹھ صاحب نے کہا "دیکھیئے یہ نیا مال ہمارے یہاں تیار ہوا ہے۔ اس کی ہر طرف سے مانگ آ رہی ہے۔ یہ ہم ادنیٰ درجے کی روئی سے بناتے ہیں اس لئے بہت سستا پڑتا ہے ہم اسے شمال میں ہمالیہ کی وادیوں تک بھیجتے ہیں۔ ہماری ایجنسیاں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہمارے گماشتے ایسے ایسے مقامات پر موجود ہیں جہاں نہ آپ کی آواز پہنچ سکتی ہے اور نہ آپ کے کارکن۔ ہمیں اور ایجنٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہونگے کہ ہندوستان میں جتنے کپڑے کی کھپت ہے اُس سے بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے سودیشی کے مسئلے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ کپڑے کی پیدائش[۱] بڑھائی جائے۔ جب ہم کافی مقدار میں اچھا کپڑا بنانے لگیں گے تو باہر کا کپڑا آنا خود بخود بند ہو جائے گا۔ اس لئے میں آپ کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جو جدوجہد اب کر رہے ہیں اُسے چھوڑ دیجیئے اور نئے مِل کھلوانے کی کوشش کیجیئے۔ ملک کو اس کی ضرورت نہیں کہ جو مال موجود ہے اُس کی مانگ بڑھے

---

[۱] Production

بلکہ اور مال کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو آپ کو میری کوششوں کی قدر کرنی چاہئے۔ میں وہی کر رہا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔" انہوں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا "یہ کیسے؟ کیا آپ نئے مِل کھلوانے کی فکر کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے، تو یقیناً آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

میں نے جواب دیا "یہ تو نہیں مگر میں چرخے کو دوبارہ رواج دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اب وہ اور بھی چکرائے اور کہنے لگے "یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے چرخے کی داستان انھیں سنائی اور کہا "میں آپ کی رائے سے بالکل متفق ہوں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ میں ملوں کا رضا کار ایجنٹ بن جاؤں۔ بلکہ اس میں ملک کا نقصان ہے۔ ہمارے ملوں کے لئے عرصے تک گاہکوں کی کمی نہیں ہوگی میرا کام یہ ہونا چاہئے اور ہے کہ ہاتھ کا کتا ہاتھ کا بنا کپڑا تیار کراؤں اور اس کی فروخت کا انتظام کروں۔ اس لئے میں اپنی پوری توجہ کھدر کی پیدائش پر صرف کر رہا ہوں۔ میں سودیشی کی اس شکل پر اس لئے جان دیتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان کی عورتوں کا بھلا ہو جنہیں کافی کام نہیں ملتا اور پیٹ بھر روٹی میسر نہیں آتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ عورتیں سوت کاتیں اور اس سے جو کھدر بنا جائے اُسے ہندوستان کے لوگ پہنیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہوگی۔ ابھی تو یہ محض ابتدائی حالت میں ہے۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ یہ ایک دن ضرور پھلے پھولے گی۔ بہر صورت اس میں کسی نقصان کا اندیشہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے ملک کی کپڑے کی پیدائش میں خفیف سا اضافہ بھی ہو جائے تو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ اب تو غالباً آپ یہ تسلیم کریں گے کہ اس تحریک میں وہ کمزوریاں نہیں ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔"

انہوں نے جواب دیا "اگر اس تحریک کے چلانے سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ کپڑے کی پیدائش بڑھے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ رہا یہ کہ مشینوں کے زمانے

میں چر خا چل سکتا ہے یا نہیں یہ دوسرا سوال ہے ۔ بہرحال میری یہی تمنا ہے کہ آپ کی تحریک کامیاب ہو ۔"

بیالیسواں باب

چڑھتا دریا

میں یہاں کھدر کی مزید نشوونما کا ذکر نہیں کرسکتا۔ اس کتاب میں مختلف تحریکوں کی پوری تاریخ کی گنجائش نہیں۔ خصوصاً کھدر کی داستان بیان کرنے کے لئے تو ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مجھے ان اوراق میں صرف یہ دکھانا ہے کہ تلاش حق کے سلسلے میں کس طرح بعض نکتے مجھے خود بخود سوجھ گئے۔

اسلئے میں اس ذکر کو چھوڑ کر ترک موالات کی کہانی پوری کرتا ہوں۔ علی برادران کی شروع کی ہوئی تحریک خلافت شباب پر تھی۔ مجھ سے مولانا عبدالباری مرحوم اور دوسرے علماء سے اس کے متعلق طول طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ خصوصاً یہ مسئلہ در پیش رہتا تھا کہ ایک مسلمان کس حد تک عدم تشدد کا پابند رہ سکتا ہے۔ آخر سب علماء اس بات پر متفق ہوگئے کہ اسلام میں عدم تشدد پالیسی کے طور پر اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ جتنے عرصے کیلئے مسلمان اس پالیسی کو برتنے کا عہد کرلیں اُتنے دنوں اس کی پابندی اُن پر فرض ہے۔ خدا خدا کرکے وہ دن آیا کہ ترک موالات کا رزولیوشن خلافت کانفرنس میں پیش ہوا اور بہت غور و تامل کے بعد پاس ہوگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار الہ آباد میں ایک کمیٹی رات بھر اس مسئلے پر غور کرتی رہی۔ ابتداء میں حکیم صاحب مرحوم کو عدم تشدد پر مبنی ترک موالات کے قابل عمل ہونے میں شبہ تھا لیکن جب ان کا یہ شبہ رفع ہوگیا تو وہ دل و جان سے اس تحریک میں شریک ہوگئے اور ان کی شرکت سے اسے بے حد تقویت پہنچی۔

اس کے کچھ دن بعد میں نے ترکِ موالات کا رزولیوشن گجرات کی پولیٹیکل کانفرنس

میں پیش کیا۔ مخالف پارٹی نے پہلا اعتراض یہ کیا کہ ایک صوبے کی کانفرنس اس کی مجاز نہیں کہ کانگریس پر سبقت کر کے کوئی رزولیوشن پاس کرے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ قید صرف پیچھے ہٹنے کے معاملے میں ہے۔ آگے قدم بڑھانے کا ماتحت انجمنوں کو ہر وقت اختیار ہے بلکہ اگر ان میں ہمت اور حوصلہ ہو تو یہ ان کا فرض ہے۔ اگر کوئی ماتحت انجمن کانگریس کا اقتدار بڑھانے کے لئے کوئی تدبیر عمل میں لانا چاہے تو اجازت کی ضرورت نہیں بہ شرطیکہ وہ جو کچھ کرے اپنی ذمہ داری پر کرے۔ اس کے بعد نفس تجویز پر غور کیا جانے لگا۔ دونوں طرف سے بحث میں بڑی گرما گرمی رہی مگر تحمل اور معقولیت کے ساتھ۔ ووٹ لئے گئے تو موافقین کی تعداد بہت زیادہ نکلی اور رزولیوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔ یہ کامیابی زیادہ تر ولبھ بھائی اور عباس طیب جی کی ذات سے ہوئی۔ طیب جی صدر تھے اور ان کا رجحان ترکِ موالات کے رزولیوشن کی طرف تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے یہ طے کیا کہ ستمبر ۱۹۲۰ء میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے جلسۂ خاص منعقد کیا جائے۔ لالہ لاجپت رائے صدر منتخب ہوئے۔ کانگریس کی تیاریاں بہت بڑے پیمانے پر ہوئیں۔ بمبئی سے کانگریس اور خلافت کی اسپیشلیں چھوٹیں۔ غرض کلکتے میں نمائندوں اور تماشائیوں کا جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔

مولانا شوکت علی کی فرمائش سے میں نے ریل میں ترکِ موالات کے رزولیوشن کا مسودہ مرتب کیا۔ اب تک میں نے اپنے مسودوں میں "Non - violent" کا لفظ لانے سے پرہیز کیا تھا مگر اپنی تقریروں میں بے تکلف یہ لفظ استعمال کرتا تھا۔ اس موضوع کے متعلق ابھی میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کے مجمعے میں "Non - violent" کا مترادف سنسکرت لفظ استعمال کرتا ہوں تو لوگ میرا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اس لئے میں نے مولانا ابوالکلام سے کہا کہ اس کے لئے کوئی اردو کا لفظ بتائیے۔ انھوں نے اس کا ترجمہ "باامان" اور نان کوآپریشن کا

"ترکِ موالات" تجویز کیا۔

غرض میں نے ”نان کوآپریشن“ کے لئے ہندی، گجراتی اور اردو کی مناسب اصطلاحیں ڈھونڈھنے میں مصروف تھا کہ مجھے اس معرکے کی کانگریس میں ترک موالات کا رزولیوشن پیش کرنا پڑا۔ اصل مسودے میں Non - violent کا لفظ رہ گیا تھا۔ رات کو مجھے اس غلطی کا خیال آیا۔ صبح اُٹھتے ہی میں نے مہادیو کے ہاتھ یہ پیام بھیجا کہ مسودے کو اخباروں میں بھیجنے سے پہلے یہ غلطی درست کر دی جائے۔ مگر مجھے خیال پڑتا ہے کہ مسودہ پہلے ہی چھپ چکا تھا۔ اسی دن شام کو سبجکٹس کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا۔ مجھے چھپی ہوئی کاپیوں میں اپنے قلم سے یہ ترمیم کرنا پڑی۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ اگر میرا مسودہ تیار نہ ہوتا تو بڑی مشکل پڑ جاتی۔

اب بھی میری حالت قابلِ رحم تھی۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ کون رزولیوشن کی تائید کرے گا کون مخالفت کرے گا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ لالہ جی کا رویہ کیا ہوگا۔ البتہ یہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس معرکے کے لئے بڑے بڑے تجربہ کار نبرد آزما کلکتے میں صف آرا ہیں جیسے ڈاکٹر بیسنٹ، پنڈت مالوی جی، وجیا راگھوچاری جی، پنڈت موتی لال، دیشبندھو داس۔

میں نے اپنے ریزولیوشن میں ترک موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ بات وجیا راگھوچاری جی کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا ”اگر ترک موالات کرنا ہی ہے تو کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرانے کے لئے کیوں کیا جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ سواراج سے محروم ہے۔ اسی کی چارہ جوئی کے لئے ترک موالات کرنا چاہئے۔“ پنڈت موتی لال جی بھی یہی چاہتے تھے کہ رزولیوشن میں سواراج کے مطالبے کا اضافہ کر دیا جائے۔ میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کر لی اور اپنے رزولیوشن میں سواراج کا مطالبہ بھی شامل کر لیا۔ کانگریس میں اس کے ہر پہلو پر نہایت سرگرمی سے بحث ہوئی اور جس میں کبھی کبھی تندی اور تلخی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر رزولیوشن کثرت رائے سے پاس ہو گیا۔

سب سے پہلے پنڈت موتی لال جی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اس معاملے میں مجھ سے اُن سے جو دوستانہ بحث ہوئی تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ انہوں نے بعض اصطلاحوں میں ترمیمیں تجویز کیں جنھیں میں نے قبول کرلیا۔ انہوں نے یہ بیڑا اُٹھایا کہ میں دیشبندھو کو بھی اس تحریک میں کھینچ لاؤں گا۔ دیشبندھو کا دل خود اس طرف کھچتا تھا مگر انھیں یہ یقین نہ تھا کہ لوگ اس پروگرام پر عمل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اصل میں وہ اور لالہ جی ناگپور کی کانگریس میں اس تحریک میں دل سے شامل ہوئے۔

کانگریس کے اجلاس خاص میں میرا دل لوکمانیہ کی یاد میں تڑپتا تھا۔ مجھے آج تک یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس وقت مجھے آشیرباد دیتے۔ اور اگر وہ مخالفت بھی کرتے تو میں ان کی مخالفت کو اپنے لئے باعث عزت سمجھتا اور اُس سے سبق حاصل کرتا۔ ہم دونوں میں بعض باتوں میں اختلاف بھی تھا مگر اس کی وجہ سے کبھی ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی نہیں پیدا ہوئی۔ ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ دوستی اور محبت کا رہا۔ ان سطروں کو لکھتے وقت ان کی موت کے واقعات میری آنکھوں میں پھر رہے ہیں۔ آدھی رات کو پٹوردھن نے جو اُن دنوں میرے رفیق تھے ٹیلیفون سے اُن کے انتقال کی خبر سنائی۔ میں اسوقت اپنے ساتھیوں کے حلقے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری زبان پر خود بخود یہ الفاظ جاری ہوگئے "میرا پشت و پناہ دنیا سے اُٹھ گیا" ترک موالات کی تحریک پورے شباب پر تھی اور میں ان سے تقویت اور فیضان کا متوقع تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا ان کا رویہ ترک موالات کی آخری شکل کے متعلق کیا ہوتا۔ مگر یہ یقینی ہے کہ ان کے انتقال سے کلکتے میں عام اُداسی چھائی ہوئی تھی اور ہر شخص افسردہ نظر آتا تھا۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قومی تاریخ کے اس نازک موقعے پر ان کی ہدایت اور رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی۔

تینتالیسواں باب

ناگپور میں

کلکتے میں کانگرس کے جلسۂ خاص میں جو رزولیوشن پاس ہوئے تھے وہ ناگپور کی کانگرس میں منظوری کے لیے پیش ہوئے۔ یہاں بھی کلکتے کی طرح نمائندوں اور تماشائیوں کا بڑا ہجوم تھا۔ ابھی تک نمائندوں کی تعداد محدود نہیں ہوئی تھی چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے اس موقعے پر چودہ ہزار نمائندے موجود تھے۔ لالہ جی میرے رزولیوشن کے اُس حصّے میں جو اسکولوں کے مقاطعے کے متعلق تھا کچھ خفیف سی ترمیم چاہتے تھے جسے میں نے قبول کرلیا۔ اسی طرح دیشبندھو کی رائے سے کچھ ترمیمیں ہوئیں۔ اس کے بعد ترک موالات کا رزولیوشن اتفاق رائے سے پاس ہوگیا۔

اسی اجلاس میں کانگرس کے دستور اساسی کی ترمیم و تنسیخ کا رزولیوشن پیش ہونیوالا تھا۔ کلکتے کے جلسۂ خاص میں سب کمیٹی کے مرتب کیے ہوئے مسودے پر بحث ہو چکی تھی اور اس پر ہر پہلو سے غور کرلیا گیا تھا۔ ناگپور میں وجیا راگھو چاری جی کے زیر صدارت سبجکٹس کمیٹی نے ایک اہم تبدیلی کرنے کے بعد اسے پاس کردیا۔ وہ تبدیلی یہ تھی کہ میرے مسودے میں غالباً نمائندوں کی تعداد ۱۵۰۰ تھی اور اب ۶۰۰۰ کردی گئی۔ میری رائے میں یہ اضافہ ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا۔ اس کے بعد کے اجلاسوں میں جو تجربے ہوئے اُن سے میری رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ محض خیال ہی خیال ہے کہ نمائندوں کی تعداد زیادہ ہونے سے کام میں آسانی ہوتی ہے یا جمہوریت کے اصولوں پر عمل ہوتا ہے۔ پندرہ سو مخلص اور روشن خیال نمائندے جنھیں دل سے قوم کی بہبود کی فکر ہو اُن چھ ہزار غیر ذمہ دار

آدمیوں سے جو اٹکل پچو منتخب کر دئے جائیں کہیں زیادہ جمہوریت کے ضامن ہوں گے۔ جمہوریت کی اصلی ضمانت یہ ہے کہ لوگوں میں آزادی، خودداری اور قومی اتحاد کا گہرا احساس ہو اور وہ انہیں لوگوں کو اپنا نمائندہ بنائیں جو نیک اور سچے ہوں۔ لیکن سبجکٹس کمیٹی کے دماغ پر تعداد کی زیادتی کا خیال اس قدر مسلط تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ نمائندے رکھنا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے چھ ہزار پر سمجھوتا ہوا۔

کانگریس کے نصب العین کے سوال پر بڑی گرما گرمی سے بحث ہوئی۔ میں نے اپنے دستور اساسی میں کانگریس کا نصب العین یہ رکھا تھا "سواراج حاصل کرنا اگر ممکن ہو تو سلطنت برطانیہ کے اندر ورنہ اُس کے باہر"۔ کانگریس کی ایک پارٹی یہ چاہتی تھی اُس کا نصب العین سلطنت برطانیہ کے اندر سواراج حاصل کرنے تک محدود کر دیا جائے۔ اس پارٹی کے خیالات پنڈت مالویہ جی اور مسٹر جناح نے کانگریس کے سامنے پیش کئے۔ مگر انہیں زیادہ ووٹ نہ مل سکے۔ میرے مسودے میں یہ شرط بھی تھی کہ سواراج حاصل کرنے کے لئے باامن اور جائز ذریعے استعمال کئے جائیں۔ بعض لوگوں نے اس شرط کی مخالفت کی اور کہا کہ ذرائع کو محدود کر دینا مناسب نہیں لیکن کانگریس نے بہت کچھ بحث و مباحثے کے بعد اصل مسودے کو پاس کر دیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر لوگ اس دستور پر سمجھ بوجھ کر دیانتداری اور خلوص سے عمل کرتے تو عوام کی تعلیم اور تنظیم میں بڑی کامیابی ہوتی اور یہ بجائے خود ہمیں سواراج دلانے کے لئے کافی تھا۔

اسی کانگریس میں ہندو مسلم اتحاد، اور کھدر کی حمایت اور چھوت چھات کی اصلاح کے رزولیوشن بھی پاس ہوئے۔ اُس دن سے کانگریس کے ہندو ممبروں نے اپنے سر یہ ذمہ داری لے لی کہ ملک کو چھوت چھات کی لعنت سے پاک کر دیں گے۔ اور کانگریس نے کھدر کے ذریعے سے ہندوستان کے فاقہ کش غریبوں سے ہمدردی اور محبت کا مضبوط رشتہ قائم کر لیا۔ خلافت کی تائید میں ترک موالات کی تحریک شروع کر کے ناگپور کی

کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد کی عملی بنیاد بھی ڈال دی۔

خدا حافظ

اب میں اُس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں ان اوراق کو ختم کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد میری زندگی کے جتنے واقعات ہیں اُن سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ پھر ایک اور وجہ بھی ہے جو مجھے خاموشی پر مجبور کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے مجھ سے کانگریس کے لیڈروں سے اس قدر ربط ضبط رہا کہ اگر میں اس کے بعد کا کوئی واقعہ اپنی زندگی کا بیان کروں تو اپنے اور اُن کے تعلقات کا ذکر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ گو آج شردھانندجی، دیشبندھو، حکیم صاحب اور لالہ جی دنیا میں نہیں ہیں مگر ہماری خوش نصیبی سے اور بہت سے پختہ کار کانگریس لیڈر ابھی موجود ہیں۔ کانگریس کی تاریخ میں ان تبدیلیوں کے بعد سے جن کا میں نے ذکر کیا ایک اہم دَور آیا ہے جس کے اثرات ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے۔ پچھلے سات سال میں میں نے جتنے قابل ذکر تجربے کئے سب کانگریس کے ذریعے سے کئے۔ اس لیے اگر ان تجربوں کی داستان چھیڑوں تو اُن معاملات کا ذکر ناگزیر ہے جو میرے اور ان لیڈروں کے درمیان پیش آئے۔ اور یہ کم سے کم اس وقت کسی طرح مناسب نہیں۔ علاوہ اس کے جو تجربے میں نے حال میں کئے ہیں اُن سے ابھی کوئی قطعی نتیجے بھی نہیں نکالے جا سکتے۔ اسلئے میں اپنا صریحی فرض سمجھتا ہوں کہ اس داستان کو یہیں پر ختم کر دوں۔ سچ پوچھئے تو میرا قلم آگے بڑھتا ہی نہیں۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں سے رخصت ہونا مجھ پر بہت شاق ہے۔ میں اپنے ان تجربوں کو بہت قیمتی سمجھتا ہوں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان کے بیان کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہوں۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کی سچی تصویر پیش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میری اوّل سے آخر تک یہی کوشش رہی کہ حق کا جو جلوہ

مجھے نظر آیا اور جس طرح نظر آیا اُسے بے کم و کاست بیان کر دوں۔ اس مشق سے مجھے بڑا اطمینان قلب نصیب ہوا کیونکہ میرے دل میں ہمیشہ یہ اُمید رہی کہ شاید یہ کتاب سست اعتقادوں کے دل میں حق اور اہمسا کے عقیدے کو مستحکم کر دے۔ اگر اس کا ہر ورق پڑھنے والوں سے پکار پکار کر نہ کہے کہ حق کی معرفت کا بجز اہمسا کے کوئی وسیلہ نہیں تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری ساری محنت اکارت گئی۔ فرض کیجئے میری سعی تلاش حق میں ناکامیاب ثابت ہو تو اس میں مطلوب کا قصور نہیں طالب کی کوتاہی ہے۔ میری طلب کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو پھر بھی ناتمام اور ناکافی ہے۔ مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھی نظر آ گئے اُن سے اس نور محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرہ بے نور ہے۔ سچ پوچھیے تو میں نے جو کچھ دیکھا وہ فروغ تجلی کا ایک خفیف سا پرتو ہے۔ مگر اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اہمسا کی تکمیل کر چکا ہو۔

حق وہ روح کلی ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان اس کے جلوے کی تاب تبھی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔ جسے اس کا حوصلہ ہو وہ زندگی کے کسی شعبے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ حق کی جستجو مجھے سیاست کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ میری ناچیز رائے میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں وہ مذہب کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔

ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیہ نفس کے ناممکن ہے۔ جب تک نفس آلائشوں سے پاک نہ ہو جائے اہمسا کے قانون کی پابندی محض خیال خام ہے۔ جو شخص عفت سے محروم ہے اُسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تزکیہ نفس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عفت برتی جائے۔ پاک نفسی میں خدا نے بڑی تاثیر دی ہے اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مگر تزکیۂ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل عفت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے انسان خیال، قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہو جائے، محبت اور عداوت رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں مسلسل سعی کے باوجود عفت کی یہ تینوں شرطیں اب تک پوری نہیں کر سکا ہوں۔ اسی لئے دنیا کی تعریف میرے کانوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اکثر میرے دل پر تیر کی طرح لگتی ہے۔ میرے نزدیک روحانی قوت سے شب و روز جذبات کو مغلوب کرنا مشکل ہے اور جسمانی قوت سے دنیا کو فتح کرنا سہل ہے۔ جب سے میں ہندوستان واپس آیا ہوں میرے دل میں جذبات کی دبی ہوئی آگ سلگتی رہتی ہے۔ اس احساس سے مجھے ندامت ہوتی ہے مگر مایوسی نہیں ہوتی۔ میرے روحانی تجربے میرے لئے تقویت اور مسرت کا باعث ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی مجھے بڑی کٹھن منزلوں سے گذرنا ہے۔ جب تک میں خودی کو بالکل مٹا نہ دوں مجھے چین نہیں آئے گا۔ انسان کی نجات اسی پر موقوف ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر ذی حیات سے کمتر سمجھنے لگے۔ اہنسا عجز و انکسار کی آخری حد کا نام ہے۔

بالفعل میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور ان سے اس دعا میں شرکت کا طالب ہوں کہ حق تعالیٰ مجھے خیال، قول اور فعل میں اہنسا کی توفیق عطا کرے۔

کتبہ زریں رقم
(24. 8. '30)

جامعہ ملیہ اسلامیہ پریس دہلی